

روحِ کلامِ غالبؔ

المعروف بہ

تفسیرِ کلامِ غالبؔ

مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کے اردو دیوان کی تضمین



مصنف :

مرزا عزیز بیگ المتخلص بہ مرزا آسیہ ارن پوری

VERS



المعروف بہ

تفسیر کلام غالب

یعنی مرزا اسد اللہ خاں غالب کے اردو دیوان کی تفسیر
مصنفہ مرزا عزیز بیگ لکھنؤ مرزا سہارن پوری شاگرد حضرت زان بہار پوری اشد تلامذہ مرزا غالب

چن سی

مرزا ظفر بیگ صاحب بہار پوری

نظارۂ اجماعی ترقی پورہ طبع ہوا



(محمد احمید الدین پرنٹر)

۶۱۹ ۳۵

فی جلد دوم

ایک ہزار

URDU SECTION

CHECKED-2002



مقدمہ

۸۹۱۵۲۳۱
۱۶۶۲۷

GHALIB COLLECTION

ہزار مولوی نظام الدین حسین صاحب نظامی بدایونی پر۔

میرے دوست مرزا محمد ظفر بیگ صاحب جن کے حسن سہمی سے روح کلام غالب طبع ہو کر آج شائقین کے پیش نظر آؤ مجھ سے مصر ہوئے کہ میں اس کا مقدمہ لکھوں۔ غالباً ان کا یہ اصرار اس بنا پر تھا کہ مجھے کلام غالب سے دلی لگاؤ رہا اور اس کے فائدے کا فخر حاصل ہو۔ میری گونا گوں مصروفیتیں کچھ عرصہ تک مرزا صاحب کی تعمیل ارشاد میں مانع ہیں۔ جب تقاضا صاف سے بڑھا تو کچھ وقت اس کے لیے بھی نکالا۔ میں نے اس مقدمہ میں اختصار کو مد نظر رکھا ہے تاکہ ناظرین آسانی سے اس کے مطالعہ کے لیے وقت دے سکیں ورنہ کلام غالب کا موضوع اس قدر دلچسپ اور وسیع ہو کہ اس پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔

لے نواب مسعود جنگ سرد اس مسودہ صاحب بی۔ اسے آکسن کی تحریک سے سب سے پہلے شہید ہیں جس نے ۱۹۱۹ء دو دیوان غالب متوا وزارت اعلیٰ کے ساتھ نظامی پریس بدایوں سے شائع کیا۔ اس کے بعد شہید ۱۹۱۹ء میں مسعود آصفیہ کی پہلی کڑی کے طور پر شائع اپریشن شائع ہوا۔ میری پیشہ تعلیم یافتہ طبقہ میں اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کے پانچ ایڈیشن اس وقت تک نکل چکے ہیں۔ (نظامی)

CHECKED-2002

غالب غزل کا بادشاہ تھا اس نے اس صنف سخن کی ماہیت کو خوب سمجھا ہو۔ غزل کی تعریف مختصراً یہ ہو کہ اس میں جتنے مضامین ہوں وہ داخلی ہوں اور ان کا درجہ اس قدر بلند ہو کہ ان سے انسان کی فطرت اور اس کی عظمت ہویدا ہو سکے اور اس کی وسعت اور اک کا پتہ چل سکے۔ حقیقت ہو کہ جملہ اصناف سخن میں غزل گوئی جتنی آسان ہر اتنی ہی دشوار ہو اگر غزل غزل ہو تو اس کو بوتان نظم کا ایسا قلعہ کہنا چاہیے جس کی روشیں غیر مسلسل اور نامرہبوط ہونے کے باوجود بے حد دل کش اور روح افزا ہیں جس طرح آسمان پر چپکے ہوئے تاروں کی بے ترتیبی ان کی نور آفرینیوں کو جلا دے دیتی ہو اسی طرح ایک بہترین غزل کے منتشر اشعار اس کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں اور بالہنہ نامرہبوطی و بے نظمی کے جملہ نیک لفظی کلام صدق بن جاتے ہیں، ظاہر ہو کہ ہر شعر نئی تخیل کا حامل ہوتا ہو اور ہر تخیل میں نئی نئی نکتہ آفرینیاں ہوتی ہیں، کہیں فلسفہ اخلاق و تصوف کے گونا گوں رموز عالم حیرت و استعجاب طاری کر دیتے ہیں تو کہیں جذبات حسن و محبت کی بوقلمونی مسحور و بے خود بنا دیتی ہو غالب کے دیوان کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے ہکا ایک ایک شعر اس معیار پر پورا اترے گا۔ یہ ہی وجہ ہو کہ غالب کا کلام جب پڑھیے نیا لطف آتا ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب کے کلام میں اکثر اشعار شرح طلب ہیں اسی لئے اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں جن میں طرح طرح کی موثر گفیاں کی گئی ہیں۔ یہ بحث ہمارے موضوع سخن سے خارج ہو کہ یہ مثنوی و حواشی اپنے مقاصد میں کہاں تک کامیاب ثابت ہوئے

لیکن یہ امر مسلمہ ہو کہ غالب کے سوا زبان اُردو کے کسی اور شاعر کے کلام کو یہ شہرت اور اہمیت اب تک نصیب نہیں ہوئی۔ اور نہ صرف اس لحاظ سے بلکہ دیگر خصوصیات شعری کی بنا پر آج ہمیں یہ فخر حاصل ہو کہ ہم دنیا کی دیگر مشہور زبانوں کے نامور اور عالمگیر شہرت رکھنے والے شعرا کے مقابل غالب کو پیش کر سکتے ہیں چنانچہ گزشتہ بہت سالہ زمانہ میں اس کے کلام کی خوبیوں کو میں بلند آہنگی کے ساتھ سراہا گیا ہو اور اس کی مدحت طرازی کی گئی ہو اس کے ثبوت کے لیے ان ضخیم شرحوں کے علاوہ ملک کے نامور مصوّر چٹائی کا دیدہ زیب ”مرقح“ اور دیگر قسم قسم کے خوبصورت اور نظر فریب ایڈیشن موجود ہیں۔

کلام غالب کی قدرومنزلت کی یہ عالی شان عمارت جس کا سنگ بنیاد مولانا حالی مرحوم نے اُنیسویں صدی کے آخر میں ”یادگار غالب“ لکھ کر رکھا تھا آج ”روح کلام غالب“ کی اشاعت سے پایہ تکمیل کو پہنچ رہی ہو کسی شاعر کے بیٹے یہ بات کچھ کم قابل فخر نہیں کہ دیگر شعرا اس کی دو چار چیدہ غزلوں کے اشعار پر مصرعہ لگائیں اور ان کی تفسیر کر کے اپنے کلام میں شامل کر لیں لیکن اردو کیا فارسی میں بھی کوئی مشہور سامشہور شاعر غالباً ایسا نہیں ہوا جس کے پورے دیوان کی تفسیر کی گئی ہو۔ کلام غالب کی قدر افزائی میں یہ ہی ایک کمی تھی جس کو ”روح کلام غالب“ (جو غالب کی تمام غزلوں کی تفسیر ہو) بدرجہ اتم پورا کرے گی اور اس لحاظ سے غالب کے توصیفی لٹریچر میں اس کو ایک قابل قدر اور شاندار ادبی اضافہ شمار کرنا چاہیے۔

اُردو ادب میں تفسین کا رواج دراصل فارسی کا اتباع ہوا۔ دو میں فارسی غزلوں کی بھی تفسین کی جاتی ہے اکثر شعرا خود اپنی غزل کی بھی تفسین کرتے ہیں تفسین دو قسم کی ہوتی ہے مثلث اور مخمس مثلث میں اول مصرعہ تفسین کا ہوتا ہے اور دو مصرعہ اول غزل کے جس کی تفسین کی جائے۔ مخمس پانچ مصرعوں سے مراد ہے جس میں تین مصرعہ تفسین کے ہوتے ہیں اور دو اول غزل کے اب زیادہ تر مخمس کا رواج ہے۔ مرزا عزیز بیگ مرحوم مصنف (روح کلام غالب) نے بھی مخمس ہی کو پسند کیا ہے یعنی غالب کے قصائد وغیرہ چھوڑ کر ہر غزل کے اشعار پر تین مصرعہ اپنے چسپاں کیے ہیں۔

تفسین کی صرف یہ ہی خوبی نہیں کہ اس کے مصرعے اصل مصرعوں سے دست گریاں ہو جائیں بلکہ ان سے اصل شعر کے معانی اور مطالب کو خواہ وہ کتنے ہی دقیق اور لائیل ہوں اس لطافت کے ساتھ نمایاں کر دیا جائے کہ پوری تفسین ایک ہی دل دو ماغ کی شاعرانہ کاوشوں کا نتیجہ معلوم ہو۔ روح کلام غالب میں یہ تمام محاسن پوری طور پر نظر آتے ہیں لیکن چونکہ اول سے آخر تک ہر غزل کی تفسین کی گئی ہے اس لیے اگر کہیں کہیں یکساں دور قلم نسبتاً نہ پایا جائے تو انشاء کمال ہم کی بنا پر نظر انداز کرنے کے قابل ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ مصنف نے پورے دیوان کی تفسین کرنے میں اپنی پوری قوت شاعری صرف کر کے کلام غالب کی شراب کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ اس کی ادنیٰ خصوصیت یہ ہے کہ مشکل ترین اشعار کے معانی

اور مطالب اس درجہ واضح ہو جاتے ہیں کہ کسی شے کو دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اس لحاظ سے روح کلام غالب کو دیوان غالب کی تمام مشروں پر فوقیت حاصل ہو اور اس کا اندازہ صرف اتنی بات سے ہو سکتا ہو کہ غالب کے جن مشکل اشعار کی شرح میں دیگر شاعرین نے نثریں صفحے کے صفحے سیاہ کر دیئے ہیں ان کو مصنف روح کلام غالب نے نظم کے صرف تین مصرعوں میں اس فصاحت و بلاغت کے ساتھ لکھ دیا ہو کہ ہم اس کے شاعرانہ کمال کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور بے ساختہ زبان سے نکل جاتا ہو ع

آفتاب آمد دلیل آفتاب

غالب اس کی توجیہ یہ پہنچتی ہو کہ غالب اور مرزا موعوم دونوں فطری شاعر تھے۔ مرزا موعوم خود بھی ایک درد مند دل رکھتے تھے اور معلوم ہوتا ہو کہ انھوں نے غالب کی سیرت اور ماحول کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ مختصر یہ ہو کہ جو درد غالب کے کلام میں ہو اسی کی کسک مرزا کی طبیعت میں بھی موجود تھی۔ خواجہ حافظ نے خوب فرمایا ہو۔

بنال لبیل اگر با منت سیر یار است کہ ماد و عاشق زاریم و کار مار است

جب ڈر و در سیدہ چوٹ کھائے ہوئے دل ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو اپنی داستانِ غم سناتا ہو تو سُننے والوں پر ایک کیفیت کا عالم طاری ہوتا ہو یہی حالت اس تضمین کے مطالعہ سے ناظرین کے دلوں پر پیدا ہوتی ہو۔ فرماتے ہیں:-

ذرا اس بے زبانِ دل کی کھڑن کچھ اپنی قدروانی کا گلہ سُن
پیسل بے بہا کہتا ہو کیا سُن سُن او غارت گر جنسِ فاسن
شکستِ قیمتِ دل کی صد کیا

اس اپنی آرزو پر مر مٹا ہوں کہ نصبِ لعینِ چشمِ سرمہ سا ہوں
ہمہ تن شوقِ نظارہ ہوا ہوں نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تفاظِ ہائے تمکین آزا کیا

ترا خیال و تصورِ جوں کو ہو مجھو اسی سے نامِ نویسی کا شغلِ ہر مغرب
مجھے اُمیدِ کرم اور تجھ سے ہو کیا تو یہ جانتا ہوں کہ تو اور پانچ مکتوب
گمہ ستم زدہ ہوں فوقِ غمہ فرسا کا

کیا خوب شرح کی ہو

جنوں مانع ہو اُستاد کا احساں اُٹھانے سے فراغت پا چکا روزِ ازل پڑھنے پڑھانے سے
رہا انکارِ عقلِ کل کو غیر لا بتانے سے فنا تعلیمِ درسِ پنجویں ہوں اس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستان پر

ایک مقطع کی تفسیر ملاحظہ ہو جس میں غالب نے بوڑھاپے کا رونا رویا ہو
کہیئے مرزا کا حال کیا غالب بے طرح ضعف ہو گیا غالب

ہو یہ پیری بھی کیا بلا غالب مضمحل ہو گئے قومی غالب

وہ عناصر میں اعتدال کہاں

غالب کے ایک شعر کی جس میں توحید کا فلسفہ کوٹ کوٹ کر پھرا ہو تضمین کے تین مصرعوں میں یہی شرح کی گئی ہو جس سے شاعر کا مافی الضمیر صاف سمجھ میں آ جاتا ہو لکھتے ہیں

ہیں موجد، مخد، اشک ہو دل سے مفقود ہم معتبر ہیں نہ کہے کے نہ کہہ مجھ

رو بقبلہ ہیں تو صرف ایک جہت ہو مقصود ہو پے سرحد اور اک سے اپنا مسجود

قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

غالب نے ایک شعر میں معشوق کے وصال کا ذکر کر کے عاشق کی خوش نصیبی انوکھے طرز سے ثابت کی ہو جس میں زلفوں کی پریشانی کو شب وصال میں لطف کا سبب ظاہر کیا ہو۔ اور اسی طرح رات کی اور زلفوں کی سیاہی کی مناسبت مزہ دے گئی ہو تضمین بھکارنے میں چار چاند لگا دیئے ہیں کہتے ہیں۔

بزم میں جو ہمیش تیرا اوراتیں اس کی ہیں صبح نظارہ میں کرویتا ہو تیں اس کی مایں

اس سے بھی وہ خوش نصیب ہے ہو تیں اس کی ہیں نیند اس کی ہو داغ اس کا ہو راتیں اس کی ہیں

تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشان ہو گئیں

ایک شرح طالب شعر کی منظوم شرح ذیل کی تضمین میں ملاحظہ ہو۔

ہنسی یاروں نے کیا کی ایک نصیحت مجھ کو فرمائی
 نہ اب ہوش و حشر ہو نہ فطرت ناشکیبائی
 سکوں سا ہو گیا دل کو گیا سامان رسوائی
 نکو ہوش مانع بے رعبی شور جنوں آئی
 ہوا ہو خندہ اجاب بخیہ حبیب و دامن ہیں

جب غالب دہلی سے لکھنؤ کے سفر کے لیے اس امید پر نکلے کہ نواب اودھ کی بارگاہ سے
 کچھ امداد لیکر نجات اشرف اور حرم محترم کی زیارت سے بہرہ اندوز ہوں گے تو راستہ میں ایک
 غزل لکھ کر ان جذبات کا اظہار کیا اس غزل کے دو شعروں کی تفسیر قابل ملاحظہ ہو کس خوبی سے
 واقعات کی تصویر کھینچی ہو

عقل حیران ہو کس وجہ سے چھوڑی دہلی
 کچھ تو ہو جس لیے طوکی ہو مسافت اتنی
 یک بیک چھوڑ دی کیوں لغت راحت گھر کی
 لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلت یعنی

ہوں بیرون تاشا سوہ کم ہو ہم کو

جب چلے گھر سے تو تخیل میں ہاں دہلی
 بیٹھ رہنا ہیں اور ترک سفر ہو اک قہر
 قصہ ہو دور کا مانع جو نہ ہو گردش دہر
 قطع سلسلہ شوق نہیں ہو یہ شہر

عزم سیر نجات و طواف حرم ہو ہم کو

غالب نے اکثر موقعوں پر اپنے دقیق مطالب کی طرف اشارہ کر کے یہ ظاہر کیا ہو کہ وہ کچھ کہتے
 ہیں عوام اس کو نہیں سمجھتے اور یہ ان کی فہم کا قصور ہو۔ اس مطلب کے ایک شعر کی تفسیر ملاحظہ ہو

کیا خوب کہا ہو

میری بخموری پیمائش قیل و قال ہو مطلب کو میرے پائے کوئی کیا مجال ہو
کہتا ہوں سب کچھ اور زبان میری لال ہو گر خامشی سے فائق اخلا سے حال ہو
خوشن ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہو

غالب کے دیوان میں جہاں مشکل اشعار ہیں وہاں ایسے شعر بھی ہیں جو پہلے متعین کا حکم
رکھتے ہیں اسی غزل کے ایک شعر کی تفسیر منوہ کے طور پر بلا حلفہ ہو جس میں تفسیر کی
زبان بھی مرزا غالب کی زبان سے مل گئی ہو۔

نالہ و آہ میں دھرا کیا ہو حاصلِ مگر یہ و بٹھا کیا ہو
اس تڑپے سے مدھا کیا ہو دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہو

آخر اس درد کی واکیا ہو

سطور بالا میں تقریباً غالب کے ہر قسم کے اشعار کی تفسیر کے منوہ نے پیش کر دیئے ہیں تاکہ
ماظرین ’روح کلام غالب‘ کی خوبیوں کا صحیح طور پر اندازہ کر سکیں اور ان کو معلوم ہو سکے کہ
مرزا عزیز بیگ مرحوم نے غزل کے تنگ میدان کو مخمس بٹاکر وسعت و وسعیت میں کہاں تک
کا میابی حاصل کی ہو اور غالب کی اس آرزو کو کہ ان کے بیان کی وسعت کے لئے تنگنا سے
غزل سے زیادہ وسیع میدان درکار ہو کس حد تک پورا کیا ہو غالب کے اسی مضمون کے شعر

کی تضمین میں نہایت موزوں اسلوب اختیار کیا ہو۔ فرماتے ہیں :-

سخن میں چاہیے کوئی جدید طرزِ عمل کہ طبع تیز کا کچھ حوصلہ تو جائے نکل
نہ کیوں ہو خود تغزل میں کہے جی نکل بقدرِ شوق نہیں طرفِ تنگنائے غزل

کچھ اور چاہیے وسعت سے بیان کیلئے

مرزا مرحوم کی تضمین کے مطلق اس قدر لکھنے کے بعد ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ دوسرے شاعروں نے جو غالب کی بعض غزلوں کے خمسے کیے ہیں ان کے مقابلہ میں مرزا مرحوم کی تضمین کا کیا درجہ ہو۔ مثال کے طور پر میر ہمدی مجروح دہلوی کے خمسون کو جو غالب کے ارشادِ تلامذہ میں سے تھے مرزا مرحوم کے خمسون کے بالمقابل درج کرتے ہیں۔ مبصر اور ناقد ان کو پڑھ کر خود رائے قائم کریں۔

مرزا

یوں تو میرا علاج کیا نہ ہوا
کم مرض ہی مگر ذرا نہ ہوا

مجھ پر احساں طبیب کا نہ ہوا

دردِ منت کشش دوا نہ ہوا

میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

مجروح

کامِ نوبت سے کچھ دوا نہ ہوا

درِ حاجت کسی پہ دوا نہ ہوا

کیا حقیقت کہوں کہ کیا نہ ہوا

دردِ منت کشش دوا نہ ہوا

میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

مجرع

وے خدا رحم ان حبیبوں کو
 کہ جلائیں نہ بد نصیبوں کو
 رنج دیتے ہو ہم غریبوں کو
 جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
 اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا
 کیوں عبث جا کے اپنا سر نکالیں
 نافع احسان کیوں کسی کا اٹھائیں
 اُس سے جب آرزوئے دل ہی نہیں
 ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
 وہ ہی جب خیر آزمانہ ہوا
 رکھتا لذت جو ہر دہان حبیب
 شب مصری کو وہ کہاں ہر نصیب
 کیا کہوں بات ہو عجیب غریب
 کتنے شیریں ہیں تیرے لبے رقیب

مرزا

ہو گئے رسوا تمہیں کہا مانو
 بات بڑھ جائے گی بہت یوں تو
 چل کے سن لو الگ جو سُننے ہو
 جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
 اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا
 اور تجھ سا حسین کہاں سے لائیں
 حسرتِ دل کی داد کس سے پائیں
 کس کے ہاتھوں سے زخمِ دل پرکھائیں
 ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
 تو ہی جب خیر آزمانہ ہوا
 سخن تلخ کب ہر ان کے قریب
 ان سے باتیں سُننے کیس کے نصیب
 ہو حلاوت ہی کچھ سخن میں عجیب
 کتنے شیریں ہیں تیرے لبے قریب

مجرع

گالیاں کھا کے بے مزانہ ہوا
فکر کی قسمت آزمائے کی
یعنی نہیں شوخ کو بلائے کی

یہ سنو بات دل جلانے کی
ہر خیر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوزیا نہ ہوا

جب سے عقل و تہمت آئی تھی
تیرے ہی وہ پہچانی تھی

وہ دم عاجزی سنائی تھی
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی

بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

اُس کی بخشش نے کی ورنہ کمی
کچھ تلافی پہ ہم سے پہنچ سکی

کیا بڑی بات ہم نے کی اسی

مرزا

گالیاں کھا کے بے مزانہ ہوا
جب ہیں دُھن تھی اُن کے لانے کی
استطاعت تھی گھر سجانے کی

اب جو بدلی ہوا نہ مانے کی
ہر خیر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوزیا نہ ہوا

جان طاعت ہی میں کھپائی تھی
کچھ خودی تھی نہ خود نمائی تھی

سر تھا سجدہ تھا جہ سائی تھی
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی

بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

قابل فخر کیا ہر بات اپنی
عین احساں ہو اس کی خوشنویسی

ہم نے اس پر نثار کیا شو کی

مجرح

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی

حق تو یہ ہر کہ حق ادا نہ ہوا

اُن کے جب بحرِ کربتہ ہیں

ہم تو مجروحِ غرق رہتے ہیں

آپ کیوں طعنِ طنز سہتے ہیں

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں

آج غالبِ غزل سمرانہ ہوا

ایضاً

لا تقنطو نوید ہو ام الکتاب میں

زاہد گناہِ غلو ہیں ہاں کس حساب میں

ہر عرض یہ جنابِ تقدسِ آب میں

کل کے لیے کہ آج نہ خستِ شرب میں

یہ سو رن ہو ساقی کوثر کے باب میں

مرزا

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی

حق تو یہ ہر کہ حق ادا نہ ہوا

مثلِ مرزاِ مصرودہ رہتے ہیں

جی میں گھٹ گھٹ کے پھوٹا رہتے ہیں

سب غم انتظار سہتے ہیں

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں

آج غالبِ غزل سمرانہ ہوا

ایضاً

جامِ سب کو رکھ نہ بچا کر حساب میں

شال نہ کر صہو جی کو شب کے حساب میں

وہاں کچھ کمی نہیں کہ ہو تو منظر میں

کل کے لیے کہ آج نہ خستِ شرب میں

یہ سو رن ہو ساقی کوثر کے باب میں

مجرع

گو آرزو سے دید میں میں بے قرار ہوں
 ہرگز وہ یاں نہ آئیں گے میں کو طلب کے
 پر کچھ تو شغل چاہیے بیکار کیوں ہوں
 قاصد کے آئے تے خط اکا اور لکھ لکھوں
 میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
 شاوی و غم کو عشق میں اکا ربطات ہو
 اس میں کبھی حیات ہو گا ہے مات ہو
 ہو طرہ حال اور نئی واردات ہو
 میں اور خط وصل خدا ساز بات ہو
 جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
 حکم خدا میں گولب چون و چرا ہو بند
 مالک ہو وہ حقیر کرے خواہ سر بلند
 پرول تو اس خیال سے رہتا ہو ٹکڑے
 ہیں آج کیوں دلیل کہ کل تک نہ تھی پسند

مرزا

لکھ تو دیا انھیں کہ مرا حال ہی نہیں
 ہوں سے آرزو سے تسلی نہرا جنوں
 آگاہ اُن کی عادت خواہستے خوب ہیں
 قاصد کے آئے تے خط اکا اور لکھ رکھوں
 میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
 وہ سچ میرے گھر جو چلے آئے مست ہو
 شکر خدا کہ ہو گئے قصے تمام طو
 جاتے ہوئے وصال کا وعدہ بھی گئے
 میں اور خط وصل خدا ساز بات ہو
 جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
 یا تو ملائکہ سے بھی تھا مرتبہ بلند
 ہم سا نہیں ہو یا کوئی اخبار مستمند
 پہونچا رہا ہو ہر تنفس میں گزند
 ہیں آج کیوں دلیل کہ کل تک نہ تھی پسند

لے اتنا دلی ماحول سے بدل کر اس کو محلات و واردات اور بات کا ہم قافیہ کرنا ضروری معلمی ہو معلوم نہیں یہ غلطی کہاں سے شروع ہوئی؟

مجرع

گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں
 ہمدردِ واقف نے بتِ خانہ خراب کے
 اوسان کھو دیئے دل بے صبر و تاب کے
 اتنا رہم سمجھ گئے ان کے عتاب کے
 ہر نیورسی چڑھتی ہوئی اندر نقاب کے
 ہر اک شکن پڑی ہوئی طرف نقاب میں
 اہلِ نظر سمجھتے ہیں عالم کا کیا وجود
 ہر اُس کی ذات پاک سے ہر چیز کی بُد
 ہر ایک کو نہیں خبرِ نیستی و بود
 ہو غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہو
 ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں غیب میں
 میں لاکھ جاں سے اپنی فدا اُس پہ ہو گ
 میری اذیتوں سے خوشی ہو وہ فتنہ گر
 ہر یارِ میرا دشمنِ ارم کس قدر

مرزا

گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں
 بے پردہ کچھ اثر ہیں نمایاں عتاب کے
 لیکن ہیں چپ خیال سے شرمِ محاب کے
 اتنا ربات بات میں ہیں پیچ و تاب کے
 ہر تیورسی چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
 ہر اک شکن پڑی ہوئی طرف نقاب میں
 اشیا کی ہر تصورِ مشیائے سب نمود
 دکھا جو غور سے تو خیالی ہیں سب جود
 ہستی کے واہے کی بدولت ہر بہت بُد
 ہو غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہو
 ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں غیب میں
 کیا کہیے ہوتی تھی شبِ غم کس طرح بسر
 اخترِ شمار یوں ہی میں ہو جاتی تھی سحر
 تو استم یہ اور نیا چشمِ شوق پر

مخرج

"تا پھر نہ انتظار میں نیند اے عمر بھر
 آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں
 رکھتے ہیں گونہاں وہ جاں نثارہ سوز
 بھانڈاں زیب ہوتا فراہم گدہ روز
 نکل سکھ سے تا درست ہے روئے لفروز
 آرایشِ جال سے فایغ نہیں ہنوز
 پیش نظر ہی آئینہ داہم نقاب میں
 تاجونہ اس کو میرے اٹھانے میں تہم
 محفل میں اس کی ہم تنے رکھ کسی سے کام
 یاں تو صفتِ نعال میں کھاسد مقام
 مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا دو بھام
 ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
 کہ شوخیاں جتا کے ملا ناٹکا کا
 کہ شرمناک ہو کے پھر ناٹکا کا

مرزا

"تا پھر نہ انتظار میں نیند اے عمر بھر
 آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں
 گو خود نما نہیں ہو وہ پروکاشیں ہنوز
 نظارگی نہیں کوئی اس کا کہیں ہنوز
 جو محو ناز خود بھی وہ تار آفریں ہنوز
 آرایشِ جال سے فایغ نہیں ہنوز
 پیش نظر ہی آئینہ داہم نقاب میں
 رہتے تھے ہم ہمالہ جہاں ان سے خالص عام
 اٹھتا تھا ایسی بزم سے میں ورتشہ کام
 پیشے میں آج مجھ کو نہ ہو کس طرح کلام
 مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دو بھام
 ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
 آتا ہی یوں تو ان کو تراناٹکا کا
 نظریں بچا کے سب کی ملا ناٹکا کا

مجرع

انما زولہری سے جھکانا ننگا ہ کا
 لاکھوں لگاؤ ایک چرانا ننگا ہ کا
 لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
 جب تک کہ پھیر خاں مقدہ ہی کا نہ جائے
 بنتا نہیں ہو کام کوئی لاکھ گر بنائے
 اس بات کا یقین کنی کس طرح سے لائے
 وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
 جس سحر سے سفینہ رواں الہامی میں
 مقدور تک سہی ہر ناز دست پاہلائے
 پر کیا کریں وہی جب تک کی بڑ نہ آئے
 یہ حال ہو تو خاک محبت کا لطف آئے
 وہ نالہ دل میں خس کج بربک نہ پائے
 جس نالہ سے شکاف پڑے آفتاب میں
 ملک عدم کے دیکھیے عازم پہ کیا بنے

مرزا

آفت ہی آف مگر نہ اٹھانا ننگا ہ کا
 لاکھوں لگاؤ ایک چرانا ننگا ہ کا
 لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
 جادو وہ چیز ہو کہ جو اس کمال میں لائے
 مشکل مشکل امر کو آسان کر دکھائے
 لیکن مجھے ہی تو ہوسوس ہا مائے
 وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
 جس سحر سے سفینہ رواں الہامی میں
 وہ نالہ جو کہ عرش معسے کو بھی ملائے
 وہ نالہ جو زمین کو بھی لرزے میں لائے
 وہ نالہ اور کان ملک شوح کے بجائے
 وہ نالہ دل میں خس کج بربک نہ پائے
 جس نالہ سے شکاف پڑے آفتاب میں
 کہتے ہیں صاف صاف یہ انداز چال کے

مجرع

اس رویش بہشت میں شیب قمر از کے
 پر جس میں بس ہی اپنا نہ ہو میں کیا کے
 رو میں جو خوش عمر کہاں بچھے تھے
 فدا تھ باگ پر ہو نہ ہا ہے رکاب میں
 مجروح کو اس امر سے ہو غیب آگہی
 اب وہ نہیں ہر ماہ پرستی جو پہلے تھی
 بالکل ہی ترک ہو یوں نہیں بھی
 غالب ٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
 پیتا ہوں وزیر اور شب ماہتاب میں

مرزا

لینا نہیں عدم سے اذہم کہیں آتے
 بے اختیار ہوں کہیں مجھ کو گرا نہ دے
 رو میں ہو خوش عمر کہاں دیکھے تھے
 فدا تھ باگ پر ہو نہ پا ہو رکاب میں
 تھے یا رہم پیالہ ہمارے سبھی کبھی
 دیکھنا نہ ہم نے ہوش میں نہ اکبھی کبھی
 وہ دن کہاں کہ شغل سے فرصت تھی کبھی
 غالب ٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
 پیتا ہوں وزیر اور شب ماہتاب میں

نوٹ: جس مصنف کے کلام کا مطالعہ کیا جائے اس کے حالات زندگی کا جاننا بھی خالی از دہی نہیں
 نہیں ہوتا۔ مرزا محمد ظفر بیگ نے جو مصنف مرعوم کے علم زاد ہیں مرزا کے ذاتی اور خانہ دانی صبیح
 حالات اور ان کا فوٹو ہم پہنچایا ہے۔ فوٹو ناظرین نے مشروع میں ملاحظہ فرمایا ہو حالات بطور ضمیمہ
 آئندہ صفحات میں پڑھیں

خاکسرا نظامی بدایونی

۳۳ راج ۳۵

حالات مُصنّف

(از مرزا ظفر بیگ صاحب بہارن پوری)

خاندانی حالات آپ کے جد امجد مرزا بختیار مرحوم چغتائی مقام تیمور علاقہ رُوسِ ترکستان کے قدیم باشندے تھے چھٹی پشت میں آپ کا سلسلہ نسب مرزا فرید

چغتائی سے جو حضرت امیر تیمور صاحب قرآن گورگانی کے نامور جلیس تھے ملتا ہے مرزا بختیار مرحوم اٹھارہویں صدی کے آخر میں اپنے چند خاندانی جھگڑوں سے پریشان ہو کر دہلی تشریف لائے

اُس زمانہ میں دہلی میں شاہ عالم بادشاہ کی حکومت قائم تھی ملک میں ہر طرف قریب قریب مرہٹوں کا زور تھا اور حکومت بھی ہر طرح پران کے زیر اثر تھی مرزا بختیار مرحوم شاہ عالم

کے حضور میں پیش ہوئے شاہ عالم نے مرزا مرحوم کے خاندانی حالات کی بنا پر بہت قدر دانی فرمائی اور ان کو اپنی خدمت میں معتمد خاص کے عہدہ پر سرفراز فرمایا لیکن مرزا چونکہ فن سپاہ گری

میں کمال و سنگا ورکتے تھے اس وجہ سے کچھ دنوں کے بعد مرزا مرحوم کا فوجی محکمہ میں کسی معزز عہدہ پر تقرر کر دیا گیا مرزا مرحوم نے اپنی حسن لیاقت سے تھوڑے ہی عرصہ میں سیالاری

کا درجہ حاصل کر لیا۔ مرزا مرحوم کی اس ترقی کے باعث ایک مرتبہ فوجی افسر کو رشک پہنچا ہو گیا اور دونوں کے باہم جنگ ہو گئی۔

اتفاقاً ایک رزمرا مرحوم اور مرثیہ سردار میں کچھ لفظی تکرار ہو گئی جس کی وجہ سے مرزا مرحوم کو اس قدر طیش آیا کہ فوراً تلوار نکال کر مرثیہ سردار کا کام تمام کر دیا مرثیہ سردار کے قتل ہونے سے تمام مرثیہ فوج میں ہیچان پیدا ہو گیا اور وہ سب کے سب مرزا مرحوم کے قتل کے درپہ ہو گئے شدہ شدہ یہ معاملہ شاہ عالم بادشاہ کے روبرو پیش ہوا مرثیہ فوج کے سردار نے مرزا کی شکایت کے دفتر کھول دیئے شاہ عالم بادشاہ نے مرثیوں کے غصہ کو فرو گتے کی غرض سے دفع الوقتی کے لیے مرزا مرحوم کو نظر بند کرنے کا حکم دیا اور اصل معاملہ کا فیصلہ کسی دوسرے وقت پر ملتوی فرمایا خیال کیا جاتا ہو کہ بادشاہ سلامت کی نیت یہ تھی کہ مرزا مرحوم کو کسی حیلہ سے اُن کے وطن پہنچا دیا جائے مرزا مرحوم ایم نظر بندی میں تسبیح و تہلیل میں مشغول رہتے تھے اسی حالت میں تین ماہ کے بعد ایک روز علی الصبح نماز سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ دفعتاً کلیجہ میں درد پیدا ہوا اور دو تین گھنٹہ کے بعد مرزا مرحوم نے شاہی قیدی سے نہیں بلکہ قیدیات ہی نجات پائی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ مرزا مرحوم کی وفات پر ان کا تمام اثاث البیت ضبط کر لیا گیا مرزا مرحوم کی اہلیہ محترمہ اپنے دو صاحبزادے چوں کریم مرزا و جمیم مرزا کو لیکر سہارنپور تشریف لے آئیں چونکہ مرزا مرحوم کی اہلیہ نہایت تعلیم یافتہ خاتون تھیں اس لیے اہالیان سہارنپور نے اُن کی نہایت ست کی اور انھوں نے ایک زمانہ مدرسہ قائم کیا جس میں علاوہ قرآن پاک کی تعلیم کے دیگر اخلاقی

کتاب ہائے فارسی کی بھی عمدہ تعلیم دی جاتی تھی یہ مدرسہ بہت عرصہ تک سہارنپور میں جاری رہا کچھ عرصہ کے بعد کریم مرزا اور رحیم مرزا بھی اپنی ملکتی تعلیم سے فارغ ہو کر جوان ہوئے کریم مرزا محکمہ پولیس میں اور رحیم مرزا تحصیل سہارنپور میں نائب ناظر مقرر ہوئے۔ رحیم مرزا بیس سال کی عمر میں پانچ سال ملازمت کرنے کے بعد دفعتاً بعارضہ ہمدیہ ۱۸۳۵ء میں لاوہ فوت ہوئے کریم مرزا نے محکمہ پولیس میں خاطر خواہ ترقی کی اور بہت عرصہ تک ضلع سہارنپور فتحپور اور بلند شہر میں معزز عہدوں پر کام کیا ۱۸۵۷ء میں بلند شہر سے چھ ماہ کی رخصت لیکر تشریف لائے اور اسی زمانہ میں آپ کا انتقال سہارنپور میں ہو گیا آپ نے اپنی وفات کے بعد تین لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑی تھی سب سے بڑے صاحبزادے مرزا محمد شفیع بیگ تھے جو عرصہ دراز تک ضلع سہارن پور کے مختلف تھاغوں میں کووال رہے ایام ملازمت میں تین حج کیے اور ۱۲۷۷ھ میں تھاغہ داری کے عہدہ سے نشن پائی چھ سال تک نشن پاکر ۱۲۷۷ھ میں انتقال فرمایا مرزا حکیم بیگ صاحب منجھلے صاحبزادے تھے آپ نے ۱۲۷۷ھ میں امتحان مختار کا دیا آپ کیا آپ کا کام نہایت اعلیٰ پایہ پر رہا اور بہت بڑے کامیاب مختار کار ثابت ہوئے حکام ضلع آپ کی خاص طور پر عزت کرتے تھے آپ کا انتقال ۱۲۹۱ھ میں ہوا آپ نے اپنی وفات کے بعد کافی جائداد زرعی و سکنی چھوڑی جو اب تک آپ کے بیٹوں کے پاس موجود ہے۔ مرزا وزیر بیگ صاحب سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے آپ ۱۲۷۷ھ میں محکمہ پولیس میں

ملازم ہوئے اور بہت تھوڑے عرصہ میں ترقی پا کر تھانہ دارسی کے عہدہ پر پہنچے بہت عرصہ تک ضلع سہارنپور میں مختلف مقامات پر تھانہ دار رہے آپ نہایت قوی اور جہیم تھے اب تک ضلع سہارن پور میں آپ کی طاقت کے کرشمے بیان کیے جاتے ہیں آپ نے سلسلہ عزم میں انتقال فرمایا۔

مرزا عزیز بیگ صاحب مرحوم المتخلص بہ مرزا سہانپوری مرزا وزیر بیگ
کی تاریخ پیدائش صاحب مرحوم کے خلف الرشید تھے آپ ۱۲۶۵ھ میں بمقام سہارنپور پیدا ہوئے۔

تعلیم تلذذ قرآن پاک وغیرہ کی تعلیم ختم ہونے پر آپ نشی مولوی حبیب الدین صاحب مرحوم المتخلص بہ سوزاں کے زمرہ تلامذہ میں داخل ہوئے نشی صاحب فن شاعری میں حضرت مرزا غالب مرحوم و معذور کے خاص شاگرد تھے ایک مدت فراز تک غالب مرحوم کی خدمت میں دہلی رہے اور غالب مرحوم کے انتقال پر سہارنپور تشریف لائے جیسا کہ سوزاں صاحب مرحوم نے ایک غزل کے مقطع میں فرمایا ہے۔

غالب کا کام تھا سو وہ سوزاں گزر گئے دہلی میں اب بناب کا کیا کام رہ گیا

مرزا عزیز بیگ صاحب کو ادا ل عمری سے ہی شعر و سخن میں خاصی بچھی تھی اُس پر قابل استاد کی توجہ ذہن کی رسائی تھوڑے ہی عرصہ میں فارسی اور اردو کی غزلیں تصنیف فرمانے لگے

منشی صاحب مرحوم اپنے ہونہار شاگرد کی تیزی طبع دیکھ کر ان کی تعلیم میں سجدہ کو شش فرماتے تھے۔ چند ہی سال میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ آپ کو فارسی زبان میں کامل دستگاہی عربی میں بھی خاصی لیاقت پیدا کر لی تھی۔

شاعری | مرزا مرحوم ایک اعلیٰ ادیب اور شاعر تھے آپ ایک ایسے مخصوص رنگ کے مالک تھے جو اکثر ان کے ہمعصر شعرا کی ابتدائی روش سے قطعاً جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کی شاعری آپ کی استقامت حیثیت کی بین دلیل جو ضلع سہارنپور اور دیگر اضلاع میں آپ کے بہت شاگرد موجود ہیں آپ کا طریق اصلاح قابل تحسین تھا اپنے ہر شاگرد کے کلام میں ان کے مذاق اور علم کے موافق ایسی اصلاح فرماتے تھے کہ جس کا جواب شکل ہی سے اس میں چند اجاب کے اصرار سے حضرت مرزا غالب مرحوم و مغفور کے دیوان کی تفہیم لکھی۔ شروع کی ماہ اپریل ۱۹۱۱ء عیسوی میں اس اہم کام کو بحسن و بجاہ اتمام کو پہونچا تا اسی عرصہ میں آپ کو در وقت لیلج کا دورہ پڑنے لگا اور اسی مرض میں چھ ماہ بعد ماہ اکتوبر ۱۹۱۲ء کے اخیر مہینہ میں ۵۵ سال چھ ماہ کی عمر میں رحلت فرمائی تالیف وصال۔ روح مرزا بہت پہونچی انشاء و ناعلیہ راجون۔ آپ نے اپنی وفات پر دو لڑکیاں چھوڑیں۔

وزیریہ معاش و | آپ نے ۱۸۷۸ء میں امتحان مختار کا ری پاس کیا مگر شعرو سخن کا اس درجہ طرز معاشرت شوق تھا کہ کچھ ہی کے کاروبار کو محض ضرورتاً انجام دیا کرتے تھے اور ہفتہ میں

صرف ایک دو مرتبہ کچھ ہی تشریف لے جاتے اور جو کچھ وہاں سے یافت ہوتی اُس کو اپنے طرفیں لاتے۔ جب تک وہ روپیہ صرف نہ ہو جاتا اُس وقت تک کچھ ہی تشریف لے جاتے آپ کی قانونی قابلیت بھی قابل تعریف تھی اکثر طلباء آپ سے قانون بھی پڑھتے تھے۔

شادی مرزا کی شادی سنہ ۱۸۹۲ء میں آپ کے عم اکبر مرزا کا بیگ صاحب مرحوم کی دختر نیک اختر سے ہوئی آپ کی اہلیہ محترمہ بھی علاوہ قرآنی تعلیم کے اردو اور فارسی میں کافی سیاق رکھتی تھیں امور خانہ داری اور حسن انتظام میں لائق تعریف تھیں اس وجہ سے شہر کے معزز روئے و غیرہ کی لڑکیاں بغرض حصول علم اُن کے پاس آتیں آپ کا انتقال سنہ ۱۸۹۷ء میں ہوا مرزا مرحوم اس حادثہ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جلسہ شعر و سخن اور دیگر دینیوی مشاغل کو ترک کر دیا ہر چند اعزاء و اقربائے مرزا مرحوم کی توجہ عقد ثانی کی طرف دلائی مگر مرزا مرحوم نے ایک نہ سنی اور آخر دم تک اپنی اہلیہ مرحومہ کی یاد لیے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے اُس زمانہ میں ایک نہایت پُرورد و غزل لکھی تھی جس کے مطلع سے دلی حزن و ملال کا اندازہ ہو سکتا ہو شعر

یاد ہیں وہ دن کہ ہم تھے اور زمانے کے مزے یاد آتے ہیں قفس میں آشیانے کے مزے
مذہب | مرزا مرحوم بہ اعتبار مذہب نہایت وسیع الخیال تھے اعتقاداً مذہب حنفی کے

پیر و اور صوم و صلوة کے پابند تھے اگرچہ آپ کے پاس بسا اوقات مختلف مذاہب کے اشخاص کا مجمع رہتا تھا مگر آج تک کبھی ایسا دیکھنے میں نہیں آیا کہ کسی صاحب کے مذہبی معاملات پر بحث یا گفتگو مرزا مرحوم نے کی ہو یا دوسرے مذاہب پر کبھی نقیضانہ زبان طعن کھولی ہو ابتداً مرزا کو اپنے اور شوقین طبع دوستوں کے اصرار پر محض قص و سرود میں شریک ہونے سے احتراز نہ تھا مگر یہ سلسلہ سن ۱۲۹۷ء میں بالکل ترک کر دیا تھا اور سلسلہ نقشبندیہ میں حضرت مولانا الحاج مولوی جلیل احمد صاحب مہاجر کی مدرسہ اول مدرسہ مظاہر علوم مہارن پور سے بیعت کی چنانچہ اس واقعہ کو مرزا مرحوم نے اپنی ایک نعتیہ غزل کے مطلع میں اس طرح پر واضح کیا

شعر

بہت کچھ صحبتِ ندان میں کھپا وقتِ عمرِ مرزا
بس اب تو کچھ دلوں خدمت کرو اللہ والوں کی

اخلاق آپ کا اخلاق نہایت وسیع تھا ہر خاص و عام سے نہایت خندہ پیشانی اور تواضع سے پیش آتے تھے۔ آپ کی نشستگاہ میں احباب اور تلامذہ کا جلسہ رہتا تھا مگر ان کے جلسے میں کبھی کسی کی یہ مجال نہ ہوتی تھی کہ کسی کی غیبت یا بدگویی کرے۔ آپ نہایت کم سخن اور متین تھے بلا ضرورت کسی سے زیادہ گفتگو نہیں کرتے تھے۔



مرزا عزیز بیگ مرزا وفات سنه ۱۹۲۰ ع

فہرست غزلیات تضمین شدہ

ممبر صفحہ	نمبر غزل	تعداد اشعار	مصرع اولیٰ ہر غزل	کیفیت
۱	۱	۸	نقش فریادی ہو کس کی شوخی تحریر کا	الف (۲۹)
۲	۲	۵	دل مرا سوزِ تہاں سے بے جواب مل گیا	
۳	۳	۶	عشق ہر رنگ رقیب سرو سا ماں نکلا	
۴	۴	۷	دھکی میں مر گیا جو نہ بابا نہ دھکا	
۵	۵	۷	دہریں نقش وفا و جبر شلی نہ ہوا	
۶	۶	۱۲	ستائش گم ہو نہ اداں قدر جس باغِ رضواں کا	
۹	۷	۷	محرم نہیں ہو تو ہی نوا ہائے راز کا	
۱۱	۸	۹	برہم شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا	
۱۲	۹	۱۵	شب کہ برق سوز دل سے زہرہ ابراب تھا	
۱۵	۱۰	۹	بس کہ دُشوار ہو ہر کام کا آساں ہونا	
۱۷	۱۱	۷	دوست غمخواری میں میری سہی فرمائیں گے کیا	
۱۹	۱۲	۱۱	یہ نہ تھی ہمارے قسمت کہ وصال یار ہوتا	
۲۱	۱۳	۱۳	ہوس کو ہو نشا ط کا رکب کیا	
۲۳	۱۴	۹	درِ خورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا	
۲۶	۱۵	۸	پسے نذرِ کرم تحفہ ہو شرم نارسائی کا	

نمبر صفحہ	نمبر غزل	تلاوہ شمار	معنی اے ہر غزل	کیفیت
۲۸	۱۶	۹	گر نہ اندوہ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا	
۳۰	۱۷	۱۰	درد منت کش دوانہ ہوا	
۳۲	۱۸	۸	گلہ و شوق کو دل میں بھی تگی جاتا	
۳۳	۱۹	۳	جب بہ تقریب سفر پارنے محل باندھا	
۳۴	۲۰	۳	نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا	
۳۵	۲۱	۸	وہ مری چین چین سے غم نہاں سمجھا	
۳۶	۲۲	۱۱	پھر تجھے دین تریا د آیا	
۳۹	۲۳	۱۲	ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا	
۴۲	۲۴	۷	تو دوست کسی کا بھی ستم گر نہ ہوا تھا	
۴۳	۲۵	۸	عرضِ نیا ز عشق کے قابل نہیں رہا	
۴۵	۲۶	۸	فکر اس پر پوش کا اور پھر بیاں اپنا	
۴۶	۲۷	۷	جو رے باز آئے پر باز آئیں کیا	
۴۸	۲۸	۱۰	عشرتِ قطرہ ہو دریا میں فنا ہو جانا	
۵۰	۲۹	۹	کنج میں پھیلا رہوں یوں پر کھلا	
۵۲	۳۰	۱۲	پھر ہوا وقت کہ ہوا لکشا موجِ شراب	ب (۱)
۵۵	۳۱	۱۱	آبرِ خط سے ہوا سو سرد جو باز آرد دوست	ت (۱)
۵۷	۳۲	۹	حسنِ ثمرے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد	و (۱)
۵۹	۳۳	۱۰	بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر درو دیوار	ر (۶)

نمبر صفحہ	نمبر غزل	تعداد اشعار	مصرعہ اولیٰ ہر غزل	کیفیت
۶۱	۳۳	۹	گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر	
۶۳	۳۵	۱۲	کیوں جل گیا نہ تابِ رخ یار و بیکہ کر	
۶۶	۳۶	۸	لہر زتا ہو مراد دل ز رحمتِ مہر و رخشاں پر	
۶۷	۳۷	۱۱	ہو نہیں کہ ہر اک ان کے اشارے میں نشانِ ار	
۷۰	۳۸	۱۰	لازم تھا کہ دیکھو میرا رستہ کوئی دن اور	
۷۲	۳۹	۵	حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز	ز (۳)
۷۳	۴۰	۳	کیونکہ اس بت سے رکھوں جان عزیز	
۷۴	۴۱	۱۰	ننگِ نغمہ ہوں نہ پروہ ساز	
۷۶	۴۲	۸	زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک	ک (۲)
۷۷	۴۳	۷	آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک	
۷۹	۴۴	۹	ہو کس قدر ہلکا فریبِ وفا سے گل	ل (۱)
۸۱	۴۵	۸	وہ فراق اور وہ وصال کہاں	ن (۲۲)
۸۳	۴۶	۱۱	ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں	
۸۵	۴۷	۹	کی و فہم نے تو غیر اس کو جانتے ہیں	
۸۷	۴۸	۱۱	آبرو کیا خاک اُس گل کی گلشن میں نہیں	
۸۹	۴۹	۵	ہم سے کھل جاؤ بوقتِ میری ایک دن	
۹۰	۵۰	۱۳	ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں	
۹۳	۵۱	۷	ماخِ دشتِ نور دی کوئی تدبیر نہیں	

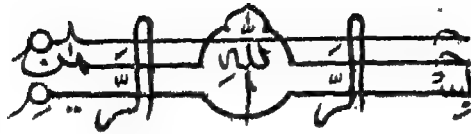
نمبر صفحہ	نمبر غزل	تعداد اشعار	مصرعہ اولے ہر غزل	کیفیت
۹۳	۵۲	۶	جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں	
۹۶	۵۳	۱۳	ملتی ہو غم سے یار سے نارالہباب میں	
۹۸	۵۴	۱۱	کل کے لیے کر آج نہ خست شراب میں	
۱۰۱	۵۵	۱۰	جیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیوں گہر کہیں	
۱۰۳	۵۶	۹	ذکر میرا یہ بدی بھی آسے غنچہ نہیں	
۱۰۵	۵۷	۹	نالہ جھوٹا طلب ای ستم ایجاد نہیں	
۱۰۶	۵۸	۷	نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتبار نہیں	
۱۰۸	۵۹	۸	تیرے توسن کو عبا باندھتے ہیں	
۱۱۰	۶۰	۸	داہم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں	
۱۱۱	۶۱	۱۳	سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں	
۱۱۳	۶۲	۱۰	دیوانگی سے دوشس پہ زنا رہی نہیں	
۱۱۶	۶۳	۹	نہیں جو نہ خم کوئی بجھنے کے در فور سے تن میں	
۱۱۸	۶۴	۷	مر سے جہان کے اپنی نظریں خاک نہیں	
۱۲۰	۶۵	۹	دل ہی تو ہو نہ سنگ و خشت آدے بھر نہ آئے کیوں	
۱۲۱	۶۶	۱۰	غنچہ نہ انگشت کو دور سے مت دکھا کہ یوں	
۱۲۳	۶۷	۹	وارتہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو	و
۱۲۶	۶۸	۱۲	نفس میں ہیں گہرا چھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو	(۷)
۱۲۸	۶۹	۸	دی سا دلی سے جان پڑوں کہ وہ کن کے پافو	

نمبر صفحہ	نمبر غزل	تعارف اشعار	مصحف اولے ہر غزل	کیفیت
۱۳۰	۷۰	۱۱	واں پہونچکر جو عشق آتا پیو ہم ہو ہم کو	ی (۶۳)
۱۳۲	۷۱	۷	تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو	
۱۳۳	۷۲	۹	کسی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو	
۱۳۵	۷۳	۱۳	کسی کو دے کے دل کوئی نواسخ فغاں کہیں ہو	
۱۳۸	۷۴	۱۱	مبصر کے زیر سایہ خرابات چاہیے	
۱۴۰	۷۵	۷	بساط عجز میں تھا ایک لاکھ قطرہ خوں وہ بھی	
۱۴۲	۷۶	۷	غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی	
۱۴۳	۷۷	۸	کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہو	
۱۴۵	۷۸	۱۲	درو سے گھڑ کو تو میرے بے قرار ی ہائے ہائے	
۱۴۷	۷۹	۶	گشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہو	
۱۴۹	۸۰	۷	گر خامشی سے فائدہ اخلاصے حال ہو	
۱۵۰	۸۱	۹	عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی	
۱۵۲	۸۲	۹	اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے	
۱۵۴	۸۳	۷	رفقا پر عمر قطع رہا اضطراب ہو	
۱۵۵	۸۴	۱۰	دیکھنا قیمت کہ آپ اپنے پر رشک جائے ہو	
۱۵۷	۸۵	۷	سادگی پر اس کی مرجانے کی حسرت دلی میں ہو	
۱۵۹	۸۶	۸	دل سے تری گناہ جسکے تاک ترگی	
۱۶۱	۸۷	۷	تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے	

نمبر صفحہ	نمبر غزل	تعداد اشعار	مصرع اوّلے ہر غزل	کیسیت
۱۶۲	۸۸	۶	کوئی دن گر زندگانی اور ہو	
۱۶۳	۸۹	۱۰	کوئی اُمید پر نہیں آتی	
۱۶۵	۹۰	۱۱	دلِ ناداں مجھے ہوا کیا ہو	
۱۶۸	۹۱	۹	کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ موت سے	
۱۶۰	۹۲	۱۴	پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہو	
۱۶۳	۹۳	۱۰	بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم بچے	
۱۶۵	۹۳	۱۳	ظلمت کن میں میرے شبِ غم کا بوش ہو	
۱۶۶	۹۵	۷	نہ ہونی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی	
۱۶۹	۹۶	۷	عجب نشاط سے جلا کے چلے ہیں ہم آگے	
۱۸۰	۹۷	۱۳	شکوہ کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہو	
۱۸۳	۹۸	۱۰	ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہو	
۱۸۵	۹۹	۷	اگر مری جان کو قرار نہیں ہو	
۱۸۷	۱۰۰	۳	ہجومِ غم سے یا ناک سرنگونی مجھ کو حاصل ہو	
۱۸۷	۱۰۱	۱۱	جس نغم سے تو ناز سے گفتار میں آوے	
۱۸۹	۱۰۲	۱۰	حسنِ مہِ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہو	
۱۹۲	۱۰۳	۸	غیر لیں محفل میں بوسے جام کے	
۱۹۳	۱۰۴	۷	پھر اس انداز سے بہا ر آتی	
۱۹۵	۱۰۵	۹	کب وہ سننا ہی کہانی میری	

نمبر صفحہ	نمبر غزل	تعداد اشعار	مصرع اولیٰ ہر غزل	کیفیت
۱۹۷	۱۰۶	۵	جس زخم کی ہوئی ہو تدبیر ر فو کی	
۱۹۸	۱۰۷	۹	چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے	
۲۰۰	۱۰۸	۱۰	ہر قدم دوری منزل ہی نمایاں مجھ سے	
۲۰۲	۱۰۹	۹	نکتہ چیں ہو غم دل اس کو سناے نہ بنے	
۲۰۳	۱۱۰	۵	وہ آکے خواب میں تسکین اضطراب تو دے	
۲۰۵	۱۱۱	۶	پیش سے میری وقت کش ہر تار بستر او	
۲۰۶	۱۱۲	۷	خطر او رشتہ الفت لگ کر دن نہ ہو جائے	
۲۰۷	۱۱۳	۷	فریاد کی کوئی ٹو نہیں ہو	
۲۰۸	۱۱۴	۳	ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے	
۲۰۹	۱۱۵	۹	دیا ہو دل اگر اس کو بشر او کیا کہیے	
۲۱۱	۱۱۶	۸	دیکھ کر در پر غم گرم دامن افشانی مجھے	
۲۱۲	۱۱۷	۵	یا دہو شادی میں بھی ہنگامہ برباد مجھے	
۲۱۳	۱۱۸	۱۰	جنور شاہ میں اہل سخن کی آزمائش ہو	
۲۱۵	۱۱۹	۸	کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گرا جائے ہو مجھ سے	
۲۱۷	۱۲۰	۱۳	باز بچہ اطفال ہو دنیا مرے آگے	
۲۲۰	۱۲۱	۱۱	کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے	
۲۲۲	۱۲۲	۷	روئے سے او عشق میں بیباک ہو گئے	
۲۲۳	۱۲۳	۱۰	ابن مریم ہوا کرے کوئی	

کیفیت	مضیع اولے ہر غزل	تعداد اشعار	نمبر غزل	نمبر صفحہ
	بہت سی غم گیتی شہر اب کمر کیا ہو	۷	۱۲۴	۲۲۶
	ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے	۹	۱۲۵	۲۲۷
	مستی بذوقِ عقلیت ساقی ہلاک ہو	۳	۱۲۶	۲۲۹
	جس چاشم شانہ کیش زلفیاں پار ہو	۱۰	۱۲۷	۲۳۰
	آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے	۷	۱۲۸	۲۳۲
	جب تک دہان زخم نہ پلید کرے کوئی	۱۲	۱۲۹	۲۳۳
	شبہم بہ گل لالہ نہ خالی زراوا ہو	۱۲	۱۳۰	۲۳۶
	منظور بھی یہ شکل تجلی کو نور کی	۹	۱۳۱	۲۳۸
	غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہو	۹	۱۳۲	۲۴۰
	مدت ہوئی ہو یار کو مہاں کیئے ہوئے	۱۷	۱۳۳	۲۴۲
	نوید امن ہی بیدار دوست جاں کے لیے	۱۴	۱۳۴	۲۴۵
	میں ہوں مشتاق چٹا چھ پر چٹا اور سی	۹	۱۳۵	۲۴۸
	آپ نے مستیِ مصر کہا ہو تو سی	۷	۱۳۶	۲۵۰



ردیف الف

کیا یہ منشا تھا ازل میں کاتبِ تقدیر کا ① ذرہ ذرہ ہو فنا اک روز اس تعمیر کا
 رنگ جھلکایا ہو کیوں ہر چیز میں تغیر کا نقش فریادی ہو کس کی شوخی تحریر کا
 کاغذی ہو سپر ہن ہر پیکر تصویر کا
 درد و غم کرتے ہیں جو کچھ روح فرسائی پہنچے حسرتیں کرتی ہیں جو ہنگامہ آرائی پہنچے
 توڑی ہو دل کو کیونکر ناشکیبائی پہنچے کاؤ کا سخت جانی ہائے تنہائی پہنچے
 صبح کرنا شام کا لانا ہو جو سے شیر کا
 آرزو سے قتل کو لب پر نہ لانا چاہیے ہاں مگر در پردہ تدبیر و تقاضا چاہیے
 کھنچے خود آئے اثر قاتل پر اتنا چاہیے جذبہ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے
 سینہ شمشیر سے باہر ہو دم شمشیر کا

کوئی کم بایہ اگر برسوں طبیعت کو لڑائے
غیر ممکن ہو کوئی نکتہ مرے نکتوں سے پائے
لاکھ سامع کان اپنے میری باتوں پر جائے
آگہی دامن شنیدن جس قدر چاہے بچھائے

مُدعا عفا، ہو اپنے عالمِ تعبیر کا

جوشِ وحشت جب تجھے تھمنے نہیں دیتا ذرا
پھر ہو مرزا سلسلہ بیکارِ قید و بند کا
ہیں مرے نزدیک یہ طوق و رسن تو چیز کیا
بسکہ ہوں غالبِ اسیری میں بھی آتشِ نیرِ پا

موسے آتش دیدہ ہو حلقہ مری زنجیر کا



⑤

کیا بتاؤں آتشِ اُلفت میں کیا کیا جل گیا
ساز و سامانِ اپنی ہستی کا سراپا جل گیا
جسم بالکل پھٹک گیا ہو اور کیلجا جل گیا
دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا

آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

مجھ کو دعویٰ ہو بلا دیتی ترا دل ہر صدا
لیکن اب یہ بے اثر ہو میں کجا اور تو کجا
نالہ ہو سکتا ہو اپنی حد امکان تک رسا
میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافلِ نالہ

میری آوازِ آتشیں سے بالِ عفا جل گیا

خیر سمجھو آتشِ غم دل میں جب تک ہو نہاں
ورنہ پھر چھوٹے گی کیا دنیا میں یہ برقی تپاں
ذکر سے اس کے زبانِ شمع ہوتی ہو زباں
عرض کیجے جو ہر اندیشہ کی گرمی کہاں

کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صراجل گیا

دیکھنے کو اب بھی ہر سرو چراغاں جسم زار دل کی ہستی پر ہر لیکن داغ کا دار و مدار
اب تو اک ظلمت کے سینہ پر گوہر داغدار دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار

اس چراغاں کا کروں کیا کار فرما جل گیا

ہر فراق ہنشیناں پر طبیعت مشتعل کر دیا سوز و گداز دل نے ہر تر مضمحل
کوئی دل بھی تو نظر آتا نہیں بے غش و غل میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کے دل
دیکھ کر طر نہ تپاک اہل دنیا جل گیا

(۳)

پنجہ دیو جنوں دشمن و اماں نکلا اس سے بچ کر نہ کوئی تار گریباں نکلا
تنگ بلوس تن عاشق حیراں نکلا عشق ہر رنگ رقیب سرو ساماں نکلا
قیس تصویر کے پرے میں بھی عیاں نکلا

دل میں ٹھہری نہ سناں کوئی گھڑی بھی یارب کس بلا کی اسے حال ہو روانی یارب
حسرت بوسہ سو فار نہ نکلی یارب زخم نے داد ندی تنگی دل کی یارب
تیر بھی سینہ سہل سے پرافتاں نکلا

کون ہو جس کو ہو جمیبتِ خاطر حاصل کوئی آشفہ کوئی منتشر وں میں داخل

گھر ہو یا ہو کوئی شوریں سروں کی منزل بوئے گل نالہ دل دو در چراغ محفل

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

خوب لوٹے ہیں مرے دل میں تھی نعمت و کس کی تقدیر کہ یوں ہاتھ لگے دولت درد

کیوں نہ ہوتی مجھے ہر دم طلب کثرت درد دل حسرت زدہ تھا ماندہ لذت درد

کام یاروں کا بقدر لب ونداں نکلا

مدتوں دل کو رہی لذت آزار پسند تھارگ جاں کو دم خجھر خوشوار پسند

اب بقا اپنی نہیں ہی ہیں زہار پسند ہو تو آموڑ فنا ہمت دُشوار پسند

سخت مشکل ہو کہ یہ کام بھی آساں نکلا

قطرہ اشک جو آنکھوں سے بہا یا غالب رشک دریا اُسے مرگاں نے بنا یا غالب

تار مرزائے پھرائیوں کا لگا یا غالب دل میں پھر گرہ بنے اک شور اٹھا یا غالب

آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

۴

کہتا ہو کون عشق میں فرما دے مرد تھا ہاں تھا جو کچھ تو قیس بیاباں نور و تھا

وہ کیا جو اک ضعیفہ کے حلقے میں مرد تھا دھکی میں مر گیا جو نہ باب برد تھا

عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا

کچھ وقفہ حیات جو مجھ کو عطا ہوا تھا اس میں بھی فنا کا تصور بن رہا ہوا
 گویا وطن میں تھا درِ غربت کھلا ہوا تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
 اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

تحصیلِ درس ہر وفا کر چکا تھا میں الفت کے امتحان سے فارغ ہوا تھا میں
 بے ہری زمانہ سے نا آشنا تھا میں تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
 مجموعہ خیال ابھی نہ رونہ دیتھا

سینہ کہ ایک نکتہ مشق جنوں ہو اب جو داغ ہو کہ زخم ہو وہ لالہ گوں ہو اب
 حالت ہر ایک عینو کی زار و زیوں ہو اب دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے نوحں ہو اب
 اس رہ گزریں جلو و گل آگے گرد دیتھا

یاروں نے دل لگانے کو سمجھا ہو دل لگی حالانکہ آفتیں ہیں ہمیشہ نئی نئی
 ممکن نہیں نجات ملے غم سے جیتے جی جانی ہو کوئی کشمکش اندر و عشق کی
 دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

حاصلِ غرض ہوئی نہ مرے قہر و ہند سے تھا نہ عاکہ گھر میں یہ وحشی پڑا رہے
 چھوڑی نہ اپنی خود دل آوارہ گرد نے احباب چارہ جوئی و حشمت نکر سکے
 زنداں میں بھی خیال بیا باں نور دیتھا

مرزا یہ ستم ظلم و ستم کیا یہاں کی ہے مٹی خراب بلبیل ہندوستان کی ہو
 شاکی جو اس زمانہ نادر و اداں کی ہے یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہو
 حق مغفرت کرے عجب آزاد مروت تھا



وعدہ پورا کبھی اُس شوخ کا کوئی نہ ہوا قصہ کوتاہ وفا عہد وفا بھی نہ ہوا
 فیض کچھ ہستی موہوم سے اس کی ہوا دہریں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا
 ہو یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا

سب غلط ہو کہ زبرد وہی ہوگا اعلیٰ جس کا نظارہ کرے مارِ سیہ کو اندھا
 کس طرح کہیے کہ پتھر میں اثر یہ ہوگا سبزہ خط سے ترا کا کل سرکش نہ دبا
 یہ زمرہ بھی حریف دم افی نہ ہوا

اس سے مایوس ہوا ہوں کہ جہاں چھوٹوں جیتے جی دامِ غم ہو شراب سے چھوٹوں
 غیر ممکن ہو کہ میں سنج و بلا سے چھوٹوں میں نے چاہا تھا کہ اندوہ و فاس سے چھوٹوں
 وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی رضی نہ ہوا

ہم جو اس بزم میں کتر ہیں تو کتر ہی ہیں کم ہیں زہاد سے رندوں کے برابر ہی ہیں
 آئینہ اپنا مکدر ہو مکدر ہی ہے دل گزر گاہ خیال می و ساغر ہی ہے

گر نفس جاوہر منزل تقویٰ نہ ہوا

ہو پست تھے ترے لانے میں جو مصروف بھی مجھ کو ممنون بنانے کو تھے احباب سبھی
کھل گئی ان کی غرض تو نے بھی ٹالا ہی تھی ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ بھی

گوشِ منت کش گلبانگِ قلیٰ نہ ہوا

کس سے دل کھول کے کچھ شکوہ کلفت کیجے کون ہو کس سے بیانِ غم و حسرت کیجے
کس دعا کے لیے اُمیدِ اجابت کیجے کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے

ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہ ہوا

ذکر کرتا تھا مسیحا کا جو سب سے غالب تنگ مرزا تھا غم و رنج و توبہ سے غالب
منتظرِ مرگ کا تھا دیکھیے کب سے غالب مر گیا صدمہ کینش لب سے غالب

نا توانی سے حریف و م عیسیٰ نہ ہوا



(۶)

نہ کچھ مرغوب آنکھوں کو نہ نظارہ گلستاں کا نہ سودا سہریں ہو حسن و جمالِ حور و غلمان کا

ہمارا دل ہو وارفتہ بہارِ بزمِ جاناں کا ستائش گہر ہو زہد اس قدر جس باغِ رضواں کا

وہ اک گلہ سہ ہو ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

لیا کرتا ہو کامِ ابرو سے ظالم تیغِ بڑاں کا شمار آساں نہیں جو روحِ جوائے چشمِ فتاں کا

مگر اس پر بھی دل تیسج خواں ہو نام جانان کا
بیاں کیا کیجیے بیدار کا و شہائے مرگاں کا

کہ ہر اک قطرہ خوں دانہ ہو تیسج مر جاں کا

بہت کچھ سعی و کوشش کی کہ وکوں دیکھ لیاں کوئی
لبوں تک بھی نہ آنے دوں کبھی سینے سے نالوں کو

مدد دی صورتِ فی خرس دندان نے نالوں کو
نہ آئی سلوت قابل بھی مانع میرے نالوں کو

لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

خدا نا خواستہ داغ جگر اپنا جو جل اُٹھے
زبان شمع پیدا ہوا بھی ہر اک بنِ موسے

ابھی دیکھے کہاں ہیں تم نے شعلے سوز باطن کے
دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت مانے نے

مرا ہر داغِ دل اک تخم ہو سر و چراغاں کا

نظر آنے لگے چاروں طرف لاکھوں حسین تجھے
درو دیوار تیرے عکس رخ سے جگمگا اُٹھے

ہوئے آثار ظاہر یک بیک حدت میں کثرت کے
کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے

کرے جو پر تو خورشید عالم شبنمستاں کا

بظاہر کتنی محکم خانہ تن کی بنا رکھی
مگر خود سعی صانع و جہ اسباب فنا رکھی

بنے گی صاعقہ اک دن یہی صانع کی دل گرمی
مری تعمیر میں مضمحل ہو اک صورتِ خرابی کی

ہیوئے برقِ خرمن کا ہو خونِ گرم دھماکاں کا

دم ہیجان و حسرت پاؤں میں ہوتا ہو اک چکر
مری آہوں سے بن بن کر گولے اُٹھتے ہیں دن بھر

یہ نوبتِ سخن کی پہنچی کہ چٹکاتِ ن ہو صحرا پر اگاہی گھر میں ہر سو بہرہ ویرانی تماشا کر

مدارِ اکٹھے دئے پر گھاس کے ہی میرے دریاں کا

مرے جل بجھنے کی دنیا کو ناعاقِ جستجو ہیں جگر کی آگ کا اظہار کم نظروں کی خوشی ہیں

نہ شکوے ہیں لبِ سوزِ دل کی گفتگو میں ہیں خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں

چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گو غریباں کا

تصویر میں جو وہ تصویرِ پُر انوار باقی ہو یہ اک شکلِ تسلی بخشِ جانِ زار باقی ہو

ہوئے ہم خاک اس کی گرمیِ بازار باقی ہو ہنوز اک پر تو نقشِ خیالِ بار باقی ہو

دلِ افسردہ گو یا حجرہ ہو یوسف کے کنڈاں کا

مری قسمت بُری ہو آپ ہوتے ہمتیں ورنہ یہ دوری دیدہ و دانستہ ہی رہتے قریب رہ

پسند ایذا کرتے کیوں مجھے اندوہ لگیں ورنہ بغل میں غیر کی آج آپ سوئے ہیں کہیں رہ

سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پہناں کا

سبب تیری خوشی کا میں نے مرجائے کو بچھا تھا ترا غم دیکھ کر جھکو قلق ہو اپنے مرنے کا

میرمیِ تعزیت اور سب سے مل کر تزار ونا نہیں معلوم کس کس کا ہو پانی ہوا ہوگا

قیامت ہو سرشکِ لودہ ہونا تیرے مرگیاں کا

کھلا ہو سامنے منظرِ عدم آباد کا غالب سمجھتا ہو اسے مرزا سفر کا منتہا غالب

اسی میں منتشر ہوتے ہیں اوراق بقا غالب نظر میں ہی ہماری جادو راہ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہی عالم کے اجزا پریشاں کا



کیوں ہو رہا ہو شیفتہ بربط نواز کا گر ویدہ کس لیے ہی عراق و حجاز کا
ہر زبان پہ راگ اُسی بے نیاز کا محرم نہیں ہی تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہی پردہ ہو ساز کا

خداں جو میرے حال پہ وہ ماہ پارہ ہی جاگے نصیب و جہ پر اپنا ستارہ ہی
پڑمردگی پہ میری خوشی کا اشارہ ہی رنگِ کستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہی
یہ وقت ہی شگفتنِ گلہائے ناز کا

مٹا بھی ہی جو مجھے تو آمادہ ستیز دشمن کے ساتھ رام ہی مجھ سے ہم و گریز
مجھے تنفر اور رقیبوں سے خیر دیز تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری شرہ ہائے دراز کا

بیاب ہو گا صورتِ برق و شر نہ میں آلے کہ و گنا در سے شام و سحر نہیں
خاموش ہوں جاؤں گا دردِ جگر نہ میں صرفہ ہی ضبطِ آہ میں میرا و گرنہ میں
طمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

سبکے ہیں اس کی نرم میں ارماں نکل ہے آبِ بقا کے چشمہ ہیں گویا اُبل رہے
 مستوں میں پڑی پڑی ہیں عجب زور چل رہے ہیں بسکے جوشِ بادہ سے شیشے اُچھل رہے
 ہر گوشہ بساطِ ہی سر شیشہ باز رکھا

اس کو ہی رات دن طلبِ تیر سینہ دوز مطلوب اس کو شام و سحر سوترِ سینہ سوز
 اس بواہوس کو چاہیئے اک زخمِ تازہ روز کاوش کا دل کرے ہی تقاضا کہ ہی ہنوز
 ناخن پہ قرض اس گر و نیمباز کا
 مرزا کے دل کی پوچھتے ہو بات کیا تہ صدقے میں عشق کے یہ بھرا گھر لٹا تہ
 برباد مفت گنجِ جوا ہر گیا اسد تاراج کاوشِ غم ہجران ہوا اسد
 سینہ کہ تھا دنیہ گہرائے راز کا



ہی نویدِ اہل سخن کو خیر کا منظر کھلا (۸) اب بزل وجود گویا نکتہ سنجوں پر کھلا
 اس بہانے سے مگر داد و دہش کا در کھلا بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
 رکھیو یا رب یہ درِ گنجینہ گوہر کھلا
 زینتِ بزمِ فلک کا حال جب مجھ پر کھلا تب مسرت سے ذرا اپنا دل مضطر کھلا
 شاہِ خاور چھپ گیا روئے مہرِ انور کھلا شبِ ہونی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا

اس تکلف سے کہ گویا بت کردہ کا دکھلا

چاہیے مدت اگر یاروں کے گنواؤں فریب اس کی ہر اک بات میں چاہوں تو دکھلاؤں فریب
اعتبار ان کا مجھے کیونکر ہو جب پاؤں فریب گرچہ ہوں پوانہ پر کیوں دوست کا کھلاؤں فریب
استیں میں دشمن نہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

بزمِ حرم میں اُس سے اس برتاؤ کی کب تھی مہد نشہ میں آئندہ ملنے کی بھی دیتا ہوں نوید
اس خوشی میں جردل وارفتہ سرگرم نشید گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید
پر یہ کیا کم ادا کہ مجھ سے وہ پری ہلکے کھلا

عمر بھر دل میں ہا شاہد پرستی کا خیال اب حقیقت کھل گئی اس کی کہ تھا اچھا خیال
اس بہشتی رو کا آخر آج کام آیا خیال ہو خیال حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال
خدا کا اک در ہو میری گور کے اند کھلا

واہ کیا ہر شو کا زینت وہ ہو حسن و نشیں حسن کے پر تو سے ہو جاتا ہو زیور بھی حسین
نور سے اس لئے تاباں کے ہو ہر شو خوشہ چین منہ نہ کھلنے پر ہو وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

گھر کی غلمت بیکھر بے فائدہ کیوں ہوں ملول جو بلا نازل ہو سر پر مجھ کو چوں سے قبول
کیوں شبِ تیر کا شکوہ بے تکلف نے ذوقِ فنول کیوں اندھیری ہو شبِ غم ہو بلاؤں نزول

آج ادھر ہی کو رہنے کا دیدہ اختر کھلا

جب کیا قصدِ سفر تو تھا طبیعت میں خیال
اپنے بچکانوں کی الفت دیجیے دل سے نکال
کر دیا ترکِ وطن ترکِ تعلق ہو محال
کیا رہوں غربت میں خوش جلتے آؤنگے چال

نامہ لاتا ہو وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

میں نے دل پر نقش کر لی حضرت مرزا کی پند
چاپوسی اہل دنیا کی نہیں مجھ کو پسند
آستانِ غیر پر کیوں جاؤں ہو کر مستمند
اس کی امت میں ہوں میں میرے پیچھے کیا رہند
واسطے جس شہ کے غالب گنبد بے در کھلا

(۹)

اس کی آمد کے تصور میں جو میں بیتاب تھا
میںد کا آنکھوں میں آنا اک خیالِ خواب تھا
اشکباری سے رواں اک سیلِ خونِ ناب تھا
شب کہ ہر دمِ سوزِ دل سے زہرہ ابراب تھا
شعلہ و جوالہ ہر اک حلقہ رگِ داب تھا

کنج تنہائی میں میں تھا اور وہاں دربارِ عام
وہ عرو کے ساتھ ہنستے تھے مجھے سونے سے کام
میں بہاتا تھا یہاں آنسو وہاں تھا دورِ جام
واں کرم کو عذرِ بارش تھا غماں گیرِ خرام
گریہ سے یاں پنہاں بالش کفِ سیلاب تھا

میں یہاں سنبل کی صورتِ غم سے تھا آشفۃِ حال
اور وہاں آراستہ ہوتے تھے زلفوں کے بال

تھی یہاں حیرت وہاں تھی آئینہ کی دیکھ بھال وہاں خود آرائی کو تھا موتی پر رونے کا خیال

یاں ہجوم اشک سے تارنگہ نایاب تھا

وہ وہاں کرتے تھے باتوں سے حنا کی شست و شو بہہ رہا تھا دل یہاں سینے میں ہو ہو کر لہو

چاندنا گلشن میں تھا طلعت یہاں تھی چارسو جلوہ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو

یاں رواں شرکانِ چشم تر سے خونِ ناب تھا

سو گئے وہ سُنے سُنے قصہ خواں کی گفت گو اور یہاں برساکینا تا صبح آنکھوں سے لہو

فرشِ راحت پر وہ نئے اور ہم پریشاں کو بکو یاں ہر شور بہہ بے خوابی سے تھا دیوار جو

واں وہ فرقِ نازِ محو بالِشِ سنجاب تھا

تھی یہاں اک بیکسیِ موس و واں محفلِ جمی تھا یہاں دل صرف غمِ عشرتِ ہاںِ مسابھی

وہ وہاں تھے شمعِ محفلِ تھی یہاں اک کو لگی یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بے خودی

جلوہ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

عیش میں وہ محو تھے میں درد و غم میں مبتلا وہ وہاں خداں و فرحاں میں یہاں گرم بکا

وہ وہاں سرشارِ بادہ میں یہاں لبِ نشہ تھا فرش سے تاعیش واں طوفاں تھا موجِ رنگ

یاں زمیں سے آساں تک سوغات کا باب تھا

شوقِ جہ سے زیادہ مجھ کو تڑپانے لگا سینہ سوزاں میں میرے آگ بھڑکانے لگا

چپکے چپکے میں کچھ اپنے جی کو سمجھانے لگا ناگہاں اس رنگ سے خونناہ پہچانے لگا

دل کہ ذوق کاوشِ ناعن سے لذت یاب تھا

شوق میں مضطرب مثالِ ماہی بے آب تھا مضطرب ایسا کہ گویا برق تھا سیما تھا

اس کی حالت سے پریشاں جلسہ احباب تھا نالہ دل میں شب اندازِ اثرِ نایاب تھا

تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیرِ گوشتِ یاب تھا

رات دن نالے ہو اس سے گوشہ زد تھے مثلِ ذی یاد ہی اس کے سوا گویا نہ تھی کچھ اور لی

جوشِ گریہ کے سوا بھائی نہیں ہو کوئی شو مقدم سیلابِ دل کیا نشاطِ آہنگ ہو

خانہ عاشقِ مگر از صدائے آب تھا

اُس کے در کی خاک کو اطس کہوں یا کہوں اس زمیں کے فرش کو یا فرشِ محل کا کہوں

ہو بجاقائم سے نرمی میں اگر اعلیٰ کہوں نازشِ ایامِ خاکِ ستر نشینی کیا کہوں

پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

تھا اُسی کے نور کا ہر چیز میں جلوہ عیاں ہو گیا کچھ بہودہ غفلت ہی حائلِ دریاں

جیت ہو یوں ہی گئی صحرا نوردی راہیگاں کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں

دُورہ دُورہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

یاد ہو صیاد اپنا وہ زمانہ بھی تجھے آبِ ودانہ کی ہمارے فکرِ بہتی تھی تجھے

بیکسوں کے حال سے غفلت نہ کھتی اتنی تھے آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تھے

کل تلک تیرا ہی دل مہرِ وفا کا باب تھا

آخرِ دِصیا دِکیا ضد ہوئے کچھ تو بہت دیکھ کر مجھ کو جو تو نے دام اکھٹا کر لیا

شوق سے یوں تیرے پھنڈے میں کی آیا بھی تھا یاد کرو وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا

انتظارِ صید میں اک دیدہ بھو اب تھا

ہونے والا تھا بپا طوفان اس کے اشک سے پچھتے کیا ہو کہ اک قطرہ سے دریا ہے

خیریت ہی ہو گئی حرّت کہ آنسو ختم گئے میں نے رو کا راتِ غالب کو ورنہ دیکھتے

اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

⑩

ہم جو چاہیں کسی ذرّے کا بیاباں ہونا ہی عیثِ چارہ و تدبیر میں حیراں ہونا

ممنوع کا کبھی ممکن نہیں امکان ہونا بس کہ دُشوار ہی ہر کام کا آساں ہونا

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ابرِ مرگاں نے جو ٹھہرائی ہی ہر سانے کی نوبت آئے نہ کسی دن مرے بہ جانے کی

شکل ہونے لگی ہر گوشے میں دیرانے کی گر یہ چاہے ہی خرابی مرے کا شانے کی

درودِ دیوار سے ٹپکے ہی بیاباں ہونا

بس جو دل پہ ہوا کچھ تو اسے رد کوں تو
میں اس آوارہ کا تا چہ نہ ہوں گا دلجو
اپنے انجام کو سوچوں یہ مجھے ہوش بھی ہو
دائے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو

آپ جانا اُدھر اور آپ ہی جہاں ہونا

بختِ آئینہ ترے حسن سے کیا چمکا ہو
سامنے آنکھوں کے بے پردہ رخِ زیبا ہو
خود نمائی کا جو شوق تو بیجا کیا ہو
جلوہ ازبس کہ تقاضا رنگہ کر تا ہو

جو ہر آئینہ بھی چاہے اور مرگاں ہونا

حاصل آنکھوں کو اور جو ذوق تجلے مت پوچھ
انسا طِ دل سرگرم تماشا مت پوچھ
حسرتیں آج نکلنے کو ہیں کیا کیا مت پوچھ
عشرتِ قتل گہ اہل تماشا مت پوچھ

عیدِ نظارہ ہو شمشیر کا عریاں ہونا

یوں تو ہر دل میں ہو کس دل میں نہیں عین نشاط
ہاں جگہ دل میں ہمارے ہی نہ کی دوائے نشاط
جیتے جی سر میں رہی جو شش ہو دوائے نشاط
لے گئے خاک میں ہم داغِ تنائے نشاط

تو ہوا اور آپ بصد رنگ گستاں ہونا

عشق نے ذوق ہر اک چیز کو بخشا ہو جدا
سینہ مشتاقِ سناں سر کو تبر کا سودا
جان بے تاب کہو شوقِ فدا ہونے کا
عشرتِ پارہٴ دل زخمِ تماشا کھانا

لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا

جیتے جی میرے نہ کی مکر و دغا سے تو بہ نہ ستم سے نہ کسی جرم و خطا سے تو بہ
 بھول کر بھی تو نہ کی خوفِ خدا سے تو بہ کی مرے قتل کے بعد اس نے جہا سے تو بہ
 ہائے اُس زود پشیمان کا پشیمان ہونا

ہوئی ہو حضرت مرزا کو جو وحشت غالب پھر تو آ جاتی ہو بلبوس کی شامت غالب
 جیب امن کی تو ہوئی ہو بری گت غالب حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
 جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گرہیاں ہونا

۱۱

مجھ سے غم آشام کا احباب غم کھائیں گے کیا خوگر کلفت کو وہ آرام پہنچائینگے کیا
 جو شش و عشرت کے ہوتے زخم سلوائیں گے کیا دوست غمخواری میں میری سخی فرمائینگے کیا
 زخم کے بھرنے تلک غن نہ بڑھ آئینگے کیا

اس طرح مالوگے قصہ سن سنا کر کب تلک یہ جہا کاری روا رکھو گے ہم پر کب تلک
 ہوگی آخر حاجت عرض مکر کب تلک بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
 ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرمائینگے کیا

دوست کیوں پند نصیحت پر تلے ہیں غمخواہ مجھ کو کچھ دیوانہ سمجھا ہو کسی نے داہ داہ
 ہوں تنہا میں کہ آخر کیا ہوا مجھ سے گناہ حضرت ناصح جو آئیں دیدہ و دل فرشتہ داہ

کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ بھائی گئے کیا

قتل گمہ سے روز گونا کامیاب تاہوں میں وقتِ عرضِ مدعا قاتل سے شرماتا ہوں میں
دیکھیے تو راہ پر کیونکر اٹھیں لاتا ہوں میں آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں اب لائینگے کیا

چارہ سازوں نے مجھ کو بنجیروں سے باندھا یوں سہی ہی یہی ہیجانِ وحشت کا مداویوں سہی
ہو نہیں سکتا جو کوئی اور چارہ یوں سہی گر کیا نامح نے مجھ کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنوںِ عشق کے انداز چھٹ جائینگے کیا

ہنگامی اور طوق گردن گیر سے بھائی گئے کیوں خوگر ایذا ہیں ہم تعزیر سے بھائی گئے کیوں
اس مناسب چارہ و تدبیر سے بھائی گئے کیوں خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھائی گئے کیوں
ہیں گرفتار و فاندان سے گھبراہٹیں گے کیا

یوں تو ہے یہ شہر اک منزلِ گوشتِ است ہر طرف ہی عیش کے ساماں کی کثرتِ است
پیش ہی با اینہم حرّرا کو یہ وقتِ است ہو اب اس مسمومہ میں قحطِ غمِ الفتِ است
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں ہے کھائی گئے کیا

ہیں اس کی بزم میں بھی اگر اذنِ بار ہوتا (۱۲) دل غمزہ نہ غم سے کبھی رستگار ہوتا

شبِ روزِ وقتِ حرامِ یہ آمید واپس ہوتا یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال پار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یوں ہی انتظار ہوتا

ہمیں پیشتر عیاں تھا تیرا وعدہ پر نہ آنا بس اب اور جھوٹ کہہ کر ہی عبتِ نقیب دلانا
نہ کر اب یہ عذر پہچانے تراش کچھ بہانا ترے وعدے پر جیسے ہم تو یہ جان بھوٹ جانا
کہ خوشی سے مرنے جاتے اگر اعتبار ہوتا

پشکستِ عہدِ الفت ہو مقامِ حیرت افزا کہ نہیں یہ کام ہرگز کسی تجھ سے ناز نہیں کا
مگر اس قدر تو کھولامے دل نے یہ معما تری ناز کی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

ترے ناوکِ ستم پر دل و جاں فدا ہیں اب تو کہ نکال دین اُنھوں نے مری حسرتیں تھیں جو جو
جو ملا ہی لطف کاوش وہ زباں سے کیا بیان کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نکیش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ فقط میرا ہی دل تھا یہ میرا ہی تھا کلیجا ہزار صبر و تمکین بھی آفتوں کو جھٹلا
کسی کوہ میں کہاں ہو مری سوزِ غم کا یارا رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

یہ عجیب بات کی ہو کہ بنے ہیں دوستِ ناصح یہ انوکھی دل لگی کہ بنے ہیں دوستِ ناصح

کوئی چال یہ نہی ہو کہ بنے ہیں دوستِ صاحب یہ کہاں کی دوستی ہو کہ بنے ہیں ستِ صاحب

کوئی چارہ ساز ہونا کوئی غم گسار ہونا

ہوا جھٹ چارہ گر کو کہ جو تم سے مشتعل ہو نہیں دل کا کوئی چارہ جو یہ غم سے مضحل ہو

نہیں سہل غم سے چھٹنا یہ شریکِ آبِ گل ہو غم اگر چہ جانگسل ہو پہ کہاں بچیں کہ دل ہو

غمِ عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

نہیں شب ہی مجھ کو بھاری کہ دن اسے بھی سہا ہو وہ بلائے جانگسل ہو تو یہ دیوِ جاں گزا ہو

کبھی جان لبوں پر آئی کبھی دم نکل گیا ہو کہوں کس سے میں کہ کیا ہو شبِ غم بُری باہو

مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہیں تھا جو شوقِ جلوہ تو قصورِ فہم کا تھا ہو مقامِ شکر لیکن کہ خدا نے پردہ رکھا

رہی شرمِ اپنی سو نہ کسے تھا نظر کا یارا اُسے کون دیکھ سکتا کہ بچا نہ ہو وہ بکتا

جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں نہ چارہ پتا

یہ کسی پر اپنا مرنا ہوا کھیلِ دوستوں کا کہ لگا دیا ہو سب نے سرِ قبر ایک میل

گئے اپنی جان سے ہم انھیں ہو گیا تماشا ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں غرقِ دریا

نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

ہوئی معرفت میں گویا جو تری زبان غالب تو سمجھ گیا ہو مرزا جو ہو تیری شان غالب

کوئی اب بھی تجھ سے کیونکر رہے بدگمان ہے
یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم دلی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

(۱۳)

بشر کرتا ہی بجا اوعا کیا یہ کہہ سکتا ہی ترک مدعا کیا
اسے تو دمن ہی ہو گا کیا ہو کیا ہوس کو ہی نشاطِ کار کیا کیا

نہ ہو مرنا تو بھینے کا مزا کیا

نہیں سمجھے ہو اب تک ماجرا کیا کہا کیا ہم نے اور تم نے سُنا کیا
مالِ آخر ہی استفہام کا کیا توافلِ پیشگی سے مدعا کیا
کہاں تک ہی سراپا نا ز کیا کیا

عدو پر لطف و دونا دیکھتا ہوں روابط بھی زیادہ دیکھتا ہوں
دارا میں اضافہ دیکھتا ہوں نواز شہا سے بجا دیکھتا ہوں
شکایت سے رنگیں کا گلہ کیا

بہنو رہیں فتنہ پر دانا انا البحر عیاں موجوں سے آواز انا البحر
جواب بحر کو نا ز انا البحر دل ہر قطرہ ہی ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

ذرا اس بے زبانِ دل کی صدفِ سُن کچھ اپنی قدر دانی کا گلہ سُن
یہ سِلِ بے بہا کہتا ہے کیا سُن سُن اے غارت گریزِ جنسِ وِفا سُن
شکستِ قیمتِ دل کی صدفِ کیا

ہوائے سنبُل و سوسن نہیں ہے طبیعتِ پُلِ گلشنِ نہیں ہے
بسائیں کیا یہاں دہن نہیں ہے دماغِ عطرِ پیرا ہن نہیں ہے
غمِ آوارگی ہائے صبا کیا

کیا ہے کیوں جفا کا رسی کا دعوئے جتا یا کیوں شنگارِ رسی کا دعوئے
تجھے کیوں ہے دل آزاری کا دعوئے کیا کس نے جگر داری کا دعوئے
شکستِ خاطرِ عاشق بھلا کیا

ابھی تک مگر کہاں ساقی نے دی ہے مگر حالتِ کمالِ نشہ کی ہے
کسی کی چشمِ میگوں دیکھ لی ہے نفسِ موجِ مجبُطِ بخود سی ہے
تو نفلِ ہائے ساقی کا گلہ کیا

عبثِ شمن کو جلوے کی ہوں ہے کہ اس کو اک نگاہِ گرم بس ہے
اسے کیا سوزِش پہناں سے ہے فروغِ شعلہِ خس یک نفس ہے
ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا

کبھی تو جو ہر تیغِ نظر دیکھ پھر اپنے جاں نثاروں کے جگر دیکھ
 نہیں الزام تجھ پر بے خطر دیکھ محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ
 شہیدانِ نگہ کا غول بہا کیا

اس اپنی آرزو پر مر مٹا ہوں کہ نصبِ لعینِ چشمِ سرمہ سا ہوں
 ہر تنِ شوقِ نظارہ ہوا ہوں نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
 تنافسِ ہائے تمکین آزا کیا

یہ ذکرِ جلوۂ فردا کیا کیوں ابھی سے کر دیا محشرِ بپا کیوں
 تنافلِ اس قدر رکھا روا کیوں یہ قاتلِ وعدہ صبر آزا کیوں
 یہ کافرِ قہرِ طاقتِ با کیا

کہے کیا کوئی اس کی باتِ پات کہ ہے افسوں و جادو سرِ بسات
 نہیں ہے کوئی ہر زبانیِ اثبات بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
 عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

کون کہتا ہے کوئی عاشقِ شیدا نہ ہوا (۱۴) ہاں یہ دعویٰ ہے کہ ہمسا کوئی ہو گا نہ ہوا
 اپنی یکتائی کا دعویٰ ہمیں بے جا نہ ہوا درخوہِ قہر و غضب جب کوئی ہمسا نہ ہوا

پھر غلط کیا ہے کہ ہمسائی کوئی پیدا نہ ہوا

ہم سے کہیں نہ یہ اُمید کبھی اہلِ کرم بند ہی در تو کریں طوفِ خدا دیں بہم
زخمِ دُخیز ہی ہاں فقر و غنا پر ہر دم بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود ہیں ہم

اُلٹے پھرائے درِ کعبہ اگر وہ نہ ہوا

حسن کا تیرے زمانے میں ہی سکے ایسا سامنے آہ میں کوئی گھڑی جم نہ سکا
شرم سے ہر جہان تاب بھی ہو رہا سب کو مقبول ہی دعویٰ تری یکتائی کا

رو برو کوئی بستِ آئینہ سیما نہ ہوا

کب تری آنکھ کے بیمار نے چاہا دریاں کب ہوا چارہ گروں سے یہ دوا کا خواہاں
چشمِ بد دور اُسے ہی یہ مرضِ راحتِ جاں کم نہیں نازش ہمنامی چشمِ خواہاں

تیرا بیمار بُرا کیا ہی گر اچھا نہ ہوا

کیا فغاں ہے وہ فغاں جس سے کوئی دل نہ ہلا کیا کہیں آہ پھر اُس آہ کو جو ہونہ رسا
ہے وہ فریادِ عبت جس سے کوئی گھر نہ جلا سینے کا داغ ہے وہ نالہ جو لب تک نہ گیا

خاک کا رزق ہے وہ قطرہ جو دریا نہ ہوا

جھیلتا ہوں جو شبِ روزِ غم و سنج و بلا یہی مقصود تھا شاید کہ مری خلقت کا
کوئی حرام نہ وہ کیا روزِ ازل اور نہ تھا نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ہوا

کام میں میرے ہی وہ منتہ کہ برپا ہوا
 سن کے ذکر تپش قلب ہے صبر کی تاب
 داستانِ شبِ غم اور نہ اٹے آنکھوں سے خواب
 سوزِ دل کا ہو بیاں اور جگر ہو نہ کباب
 ہر بنِ محسوس دم ذکر نہ ٹپکے خوں ناب
 حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا
 جرمِ محرم میں نہ ہو جلوہٴ مینا نہ و مل
 ذرہ ذرہ میں نہ ہو سیرِ بیا باں و سبل
 غنچہٴ گل میں نہ آجائے نظر گلشن و گل
 قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ ہے اور جزو میں گل
 کھیل لڑکوں کا ہوا دیدہٴ مینا نہ ہوا
 مدتوں خط و کتابت رہی مرزا اُس سے
 تب کہیں قتل کا اقرار کیا قاتل نے
 آج کچھ قتل کے سامان بھی مقتل میں ہو
 تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پُرزے
 دیکھتے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہو

❦
 (۱۵)

بجا ہی تم کرو جو کچھ گلہ اپنے فدائی کا
 ادا اس سے نہ کچھ بھی ہو سکا حقِ آشنائی کا
 نہ پہنچا بزم تک تو عذر ہی بیدست و پائی کا
 پے نذرِ کرم تحفہ ہی شرمِ نارِ سائی کا
 بخوں غلطیدہٴ صدرِ رنگِ عجبے پارِ سائی کا
 ابھی تک تو رہا پردہٴ تمھاری خوشِ ادائی کا
 نہ ہو جائے کہیں نیا میں شہرہٴ دلربائی کا

کسی دن رنگ لائے گا یہ لپکا خود نمائی کا نہ ہو حسن تماشا دوست رسوا بے وفائی کا

بمہر صد نظر ثابت ہے دعوئے پارسائی کا

ترے نور و ضیا سے فیض ہر و ماہ کو پہنچا مگر حسرت کشاکش میں ہی رہا تیرے جلی کا
ترے در پر جو سائل آگیا خالی نہیں جانا زکوٰۃ حسن دے دی جلوہ بینش کہ مہر آسا

چراغ خانہ درویش ہو کا سہ گدائی کا

اہیں تو یہ تمنا تھی کہ سر ہوا و تیرا خیر سرِ مقل کہا کس نے کہ اے قاتلِ عایت کر
یقیناً تجھ سے ہوگی باز پرس اس کی سرِ شتر نہ مارا جان کر بے جرم غافل تیری گردن پر

رہا مانند خونِ بے گنہ حق آشنائی کا

محمد اللہ جب سے شیوہ طلی لسانی ہو نہ قصہ درد کا لب پر نہ کچھ غم کی کہانی ہو
خوشی میں بسر ہوتی ہے اچھی زندگانی ہو تمناے زباں مجھ سپاس بے زبانی ہو

مٹا جس سے تقاضا شکوہ بے دست و پائی کا

مرے زخموں کی صورتِ جو مٹی صورتِ گل ہے اسی صورت کا صدقہ کہ تقدیرِ قیامتِ گل ہے
مرے ہی خوں شدہ دل کا تصدقِ حیرتِ گل ہے وہی اک بات ہے جو بیاں نفسِ ہاںِ بہتِ گل ہے

چمن کا جلوہ باعثِ ہر مری نگیں نوائی کا

دفا داروں سے بھی تو نے جویدِ عہدی کی ٹہنی شکایتِ بے دہن لوگوں کے لب تک بھی سی آئی

حسینوں سے زبانِ طعن آخر تو نے کھلوائی وہاں ہریت پناہ جو زنجیرِ سسوائی
 عدم تک بے وفا چرچا ہی تیری بیوفائی کا
 نہ ہو گا ختم نامہ یوں تو چاہے جس قدر لکھ دے
 پڑھے گا کون تو دفتر کے دفتر بھی اگر لکھ دے
 مناسب ہی کہ مرزا کی طرح مصرع ترکھ دے
 ندے نامے کو اتنا طول غالب مختصر لکھ دے
 کہ حسرتِ سنج ہوں عرضِ ستمائے جہانی کا

چپ ہے تو اس کو راحت کا گماں ہو جائے گا (۱۶) جو گلہ دل کو ہی دل ہی میں نہاں ہو جائے گا
 جو بیاں سے مدعا ہی رائیگاں ہو جائے گا گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا
 بے تکلف داغِ مہر دہاں ہو جائے گا
 ہیبتِ غم سے ہی بیڑِ صبل کو کربِ اضطراب ہی شبِ رمہ میں طبیعت کو بلا کا بیچ و تاب
 جزر و مدائیں کہیں پیدا نہ کرے ماہِ تاب زہرہ گرا ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہو آب
 پر تو مہتابِ سیلِ خانماں ہو جائے گا
 استراحت میں ہی کس انداز سے وہ سہمہ سورہا ہی مستِ صہبائے جوانی بے خبر
 میں عجیبِ بیم ورجا میں ہیں یہ حالت دیکھ کر لے تولوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
 ایسی باتوں سے وہ کا فر بدگماں ہو جائے گا

ہم کو دعویٰ ابتدا میں تھا بہت کچھ عشق کا
 آنکھ جب س سے لڑی سب حوصلہ جاتا رہا
 عمر بھر الفت بنا ہیٹھ یہ اپنا قصہ دیکھا
 دل کو ہم صرف وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا

یعنی یہ پہلے ہی نذر امتحان ہو جائے گا

تیری مرضی سے ہو وابستہ زمانے کی ضیا
 تو نے چاہا جس کو مقبول دو عالم کر دیا
 اُس سے دُنیا پھر گئی تو جس سے ناخوشی گیا
 سب کے دل میں ہی جگہ تیری جو تو راضی ہوا

مجھ پہ گویا اک زمانہ ہرماں ہو جائے گا

ہی جو مجھ کو فرط غم میں لیں ہی خوں رونے کا خط
 ایک دن ہو جائینگے دونوں کے دونوں موجود خط
 اور گھٹنے میں ہا یوں ہی جگر اور دل کو ربط
 گر نگاہ گرم فرماتی رہی تسلیم ضبط

شعلہ خس میں جیسے خوں گ میں نہاں ہو جائے گا

دیکھ کر نالاں مجھے مرغِ چمن میں نوہ گر
 ہونو جائیں چاک چاک اس غم سے چنچوں کے جگر
 میری حالت پر کٹ افسوس ہیں برگِ شجر
 بلغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر

ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں نشاں ہو جائے گا

منتظر میں بھی ہوں فردائے قیامت آئے تو
 اک بڑی امید پر جھیلایا تیرے ظلم کو
 اپنی اپنی داد اسی دن پائیں گے انصاف جو
 دائے گریہ اتر ا انصافِ محشر میں نہ ہو

اب تلک تو یہ توقع تھی کہ وہاں ہو جائے گا

یاد رکھ سننے کے قابل پسند مرزا ہی آسند ہوش میں آکھیا ہوا دل کس کو دیتا ہی آسند
 مسئلہ اک طفل پر ہونا کچھ اچھا ہی آسند فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہی آسند
 دوستی ناداں کی ہی جی کا زیاں ہو جائیگا

(۱۶)

یوں تو میرا علاج کیا نہ ہوا کم مرض ہی مگر ذرا نہ ہوا
 مجھ پر احساں طیب کا نہ ہوا درد منت کش دوا نہ ہوا
 میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

ہو گئے رُسوا تمھیں کہا مانو بات بڑھ جائے گی بہت پس تو
 چل کے سُن لو الگ جوسنتے ہو جمع کرتے ہو کیوں قیہوں کو
 اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

اور تجھ سہا سیں کہاں سے لائیں حسرتِ دل کی ذاکس سے پائیں
 کس کے ہاتھوں سے زخمِ دل پہ کھائیں ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
 تو ہی جب خنجر آزمانہ ہوا

سخن تلخ کب ہوا ان کے قریب ان سے باتیں سننے کیسے نصیب
 ہر حالات ہی کچھ سخن میں عجیب کتنے شیریں ہیں یہی لبِ قریب

گالیاں کھاکے بے مزا نہ ہوا
 جب سینہ من بھی اُن کے لانے کی استطاعت تھی گھر جانے کی
 اب جو بدلی ہو ازمانے کی ہو خبر گرم اُن کے آنے کی
 آج ہی گھر میں پوریا نہ ہوا
 جان طاعت ہی میں کھائی تھی کچھ خودی تھی نہ خود نمائی تھی
 سر تھا سجدہ تھا جبہ سائی تھی کیا وہ نمرود کی خدا فی تھی
 بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
 قابلِ فخر کیا ہو بات اپنی عین احساں ہو اس کی خوشنوی
 ہم نے اس پر نثار کیا شو کی جان دی دی ہوئی ہی کی تھی
 حق تو یہ ہو کہ حق ادا نہ ہوا
 غم سے خالی نہ کوئی دم گزرا کیا ٹھکانا ہو کم نصیبی کا
 کچھ نہ کچھ سلسلہ لگا ہی رہا زخم گردب گیا لہو نہ بھٹا
 کام گر رک گیا روا نہ ہوا
 دعویٰ دوستی زبانی ہو دل میں تو دشمنی کی ٹھانی ہو
 قہر ہو یا یہ مہربانی ہو رہنی ہو کہ دستانی ہو

یہ کے دل دلتاں وانہ ہوا

مثل حر زامصر وہ رہتے ہیں جی میں گھٹ گھٹ پھوٹ بہتے ہیں
سب غم انتہا رہتے ہیں کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں

اج غالب غزل سرانہ ہوا

(۱۸)

یہ ہمیشہ نشیمن رہا تمنا کا رہا ہی در داسی میں تمام دُنیا کا
مگر اب اسے درکار پہن صحرا کا گلہ ہی شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا

گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

ترا خیال و تصور جو دل کو ہی محبوب اسی سے نامہ نویسی کا شغل ہی مرغوب
مجھے امید کرم اور تجھ سے ہو کیا خوب یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخ مکتوب

مگر ستم زدہ ہوں ذوق خامہ فرسا کا

نہ ہو گئے گل بوش روزگار اگر ہی یہی پسے گا زیر قدم سبزہ زار اگر ہی یہی
لے گا دہر کا نقش دنگار اگر ہی یہی خانے پائے خزاں ہی بہار اگر ہی یہی

دوام کلفت خاطر ہی عیش دُنیا کا

ہنسی کا خاک سلیقہ نہیں کسی گل کو کہیں پیرو متا شانہ رنج افزا ہو

چمن کا قصد ہوا یار تو مجھ کو ساتھ نہ لو غمِ فراق میں تجلیفِ سیرِ باغِ ندو

مجھے دماغ نہیں خندہ لائے بیجا کا

مثال آنند میرت زدہ سراپا ہوں اُمید وار تجلی روح افزا ہوں

رہنِ شوق ہوں سرنا بپا تمنا ہوں ہنوز محرمی حسن کو ترستا ہوں

کرے ہی ہر بنِ موکا م چشمِ بینا کا

اب اور کیا ہو کہ انداز اُس سنگر کے دمِ فطارہ طلبگار جس کے ہیں ہم سے

اشارہ جان کا ہو گا تو یہ بھی دیدنی کے دل اس کو پہلے ہی ناز واداسے ہے بیچھے

ہیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

مرے سرشک کا انداز سخت مشکل ہے کہ قطرہ قطرہ میں پوشیدہ بحرِ کامل ہو

حساب کا کوئی دعوے کرے تو باطل ہے نہ کہہ کہ گریہ بہ اندازِ حسرتِ دل ہو

مری نگاہ میں ہو جمعِ خجی دریا کا

ستم جو اس کے اٹھاتا ہوں لہو شاد ہے نہیں کسی سے طلبگارِ عدل واداست

نہ مجھے اس کو نہ مرزا سے ہو عناد ہے فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں کس کو یاد ہے

جہاں میں اس کی ہو انداز کا فرما کا

(۱۹)

اس نے جب خت پئے قطع منازل باندھا چھڑے ناقہ مرے گھر کے مقابل باندھا
میں نے بھی عہدِ سفر دہر سے کامل باندھا جب بتقریب ہر سفر یا رہنے محل باندھا
پیش شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا
قتل کر دینے میں عشوہ تھا بڑا وستِ راز بانی قتل کر شمع تھا منگہ تھی غماز
دیکھ کر آئینہ جب ہو گئے قال انداز اہل بنیش نے ہجرت کدہ شوخی ناز
جو ہر آئینہ کو طوطی بسمل باندھا

منہ ہی جس کا نہ کبھی عرضِ تمنا میں کھلا اس کو حراماں کے سوا اور یہاں کیا ملتا
کام کچھ سہل نہیں تھا طلبِ مقصد کا یاس و اُمید نے اک عہدہ میاں مانگا
عجزِ ہمت نے طلسمِ دل سائل باندھا
اس بیاباں میں ہی حیرانِ دل محزونِ غالب حالِ حزنہ انجوس میں دگرگوں غالب
ہو گیا فکرِ مضا میں جگرِ خوںِ غالب نہ بندھے تشنگیِ ذوق کے مضمونِ غالب
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

(۲۰)

اگر میں صورتِ قہر نہ دریا سے جدا ہوتا تو کیوں پریش قصہ بحثِ ہمتِ نیست کا ہوتا

مگر ہاں نفی سے اثبات پیدا ہوتا نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ڈوبیا مجھ کو ہونے نے نہ ہونے میں تو کیا ہوتا

دل بیمار تو فکر وفا میں گھس گیا اپنا جگر باقی رہا تھا اس کو ورغش لے کھایا

جھکا بارالم سے فرق یوں پہرے نہیں اٹھتا ہوا جب غم سے یوں بچیں تو غم کیا بھر سکے کشتے کا

نہ ہوتا اگر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

اُسی کی یاد میں آٹھوں پہر دل تملتا ہے تصور اس کا مرزا لات دن دل کو دکھانا ہے

خیال اس کا بھلا کپڑا ٹمکیں سے جاتا ہے ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے

وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں آتا تو کیا ہوتا



کب کوئی باعثِ خونباری مرگاں سمجھا کب کوئی علتِ آہِ شمرِ افشاں سمجھا (۲۱)

کوئی غنچہ نہ حالِ دلِ نالاں سمجھا وہ مری چینِ جبین سے غم نہ پاں سمجھا

رازِ مکتوب بہ بے بڑی عنوان سمجھا

لوٹ دنیا سے مگر ہی مرا سینہ ہنوز دل میں باقی ہے ابھی کلفتِ بیرینہ ہنوز

خاک بھی شکلِ صفائی نظر آئی نہ ہنوز یکا لک پیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز

چاک کرتا ہوں میں جس دن سے گریباں سمجھا

حزن و اندوہ میں نا چاری خاطر مت پوچھ زیست باعث بیزاری خاطر مت پوچھ
 حال دشواری و بیماری خاطر مت پوچھ شجہ اسباب گرفتاری خاطر مت پوچھ
 اس قدر تنگ ہو ا دل کہ میں ندان سمجھا

کب مینطور ہی وہ جلوہ نما ہو سر بام کب گوارا ہو کہ وہ رخ ہو نظر گاہ عوام
 چاہتا ہوں ہے مستور وہ شوخ خود کام بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرم خدام
 رخ بہر قطرہ عرق دیدہ حیراں سمجھا

چھیڑ کر غیر نے اُس کو جو غضب ناک کیا آگ ہو کر صفتِ شعلہ آتش بھڑکا
 باعثِ طیش تو اغیار کا سفلہ پن تھا عجز سے میں نے یہ جانا کہ وہ بد خو ہوگا
 نبضِ حس سے تپشِ شعلہ سوزاں سمجھا

قطع منزل کے لیے میں نے کمر تو باندھی پر نفاہت نے اجارت پہے رفقاءِ ندی
 نوبت آئی نہ تھی دو ایک قدم چلنے کی سفرِ عشق میں کی ضعف نے رحلتِ طلبی
 ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستاں سمجھا

کوئی پہلو بھی تو نہ پہنے کا نہیں تھا دم مرگ نشترِ آخرِ رگ جاں نے وہی کھایا دم مرگ
 پیش آیا وہی تقدیر کا لکھا دم مرگ تھا گریزاں مژدہ یا ر سے دلِ تادم مرگ
 دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا

یوں تو تم بھی اُسے کہتے تھے جفا کار اُسے پھر بھی مرزائے کیا تھا تمہیں ہشیار اُسے
 کیوں تھے دیدہ و دانستہ گرفتار اُسے دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اُسے
 غلطی کی کہ جو کافر کو مسلمان سمجھا

(۲۲)

پھر مجھے یار کا دیا دیا آیا اپنا پھوٹا ہوا سر یا دیا آیا
 پھر وہی خونِ جگر یا دیا آیا پھر مجھے دیدہ تر یا دیا آیا
 دل جگر تشنہ فر یا دیا آیا

تھا ترا ہجر عذابِ جانسوز لفظِ نصرت تھا سانِ دل و دوز
 پھر نصیبوں نے دکھایا یہ دوز دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز

پھر ترا وقتِ سفر یا دیا آیا

جب ملا آنکھ پھر الی اپنی نظرِ لطف کسی دن نہ ہوئی
 کی نہ اک وز تنافل میں کمی سا دیکھائے تمنائیں

پھر وہ نیرنگِ نظر یا دیا آیا

کیوں نہ فر یا د مجھے ہو مشکل آئے منہ میں ہیں سینہ گھائل
 میں کہاں آہ و فغاں کا قابل عذر و اماندگی اے حسرتِ دل

آلہ کرتا تھا جگر یاد آیا

جستجو گرنہ تری کی جاتی پھیبیت ہی نہ جھیلی جاتی

ہاں کیوں مفت میں اپنی جاتی زندگی یوں بھی گزری جاتی

کیوں ترا راہ گزریا د آیا

مانتا ہوں وہ جگہ ہے ابھی ہیں ہاں عیش کسمان سبھی

کیا کروں گا جو طبیعت نہ لگی کیا ہی رضوان سے لڑائی ہوگی

گھر ترا خلد میں گریا د آیا

اب کہاں ضعف کے یا بے نفاں آہ کی تابش نالوں کی توں

جی لرزتا ہے جو طئی ہو زبان آہ وہ جرات فریاد کہاں

دل سے تنگ کے جگر یاد آیا

دل میں رہ رہ کے جو آتا ہے خیال کیا بلا دیکھیے لانا ہے خیال

پھر مجھے غم میں پھنسا تا ہے خیال پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال

دل گم گشتہ مگر یاد آیا

خاک ابھی ہیں نے کہاں چھائی ہے دل ٹھکرتا ہے پریشانی ہے

فرط ہیبت سے جگر پانی ہے کوئی ویرانی سی ویرانی ہے

دشت کو دیکھ کے گھریا د آیا

قدر مسکن کی ابھی جانی ہو یہی اس میں بھی پریشانی ہو
یہ پیمیش وہ لاشانی ہو کوئی ویرانی سی ویرانی ہو

دشت کو دیکھ کے گھریا د آیا

قائل اس کا ہی ہر انسان شاید کہ بدی کی ہو محافات بھی بد
جرم ہونے کو تھا ہر زاسرود میں نے مجنوں پہ لکھیں ہیں اسد
سنگٹ ٹھا یا تھا کہ سر یا د آیا

﴿۲۳﴾

آپ کے ساتھ کوئی دشمن بے پیر بھی تھا
دیر کرنے میں کوئی مائل تدبیر بھی تھا
سست رفتار کوئی از رو تیر بھی تھا
ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

تم نے جو کام کیا غیر مشیت نہ کیا
دوں جو تنہا تمہیں الزام تو ہی میری خطا
تھا مقدر جو مرے واسطے ہونا وہ ہوا
تم سے بیجا ہی مجھے اپنی تباہی کا گلا
اس میں کچھ شائبہ خوبی تقدیر بھی تھا

شاہد حال ہی ہر چہند مرا حال زبوں
سخت حیران ہوں کہ کیونکر تجھے آگاہ کروں

کچھ خبر بھی ہو کہ میں عاشقِ دیرینہ ہوں تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں
کبھی فراق میں تیرے کوئی پنچیر بھی تھا

مجھ سے کہتا ہو کہ تو کون ہو کیا بتلا دوں عاشقِ زار ہوں کیا اس کے سوا بتلا دوں
نہ رہا ہوں جو تجھے یاد تو آبتلا دوں تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں
کبھی فراق میں تیرے کوئی پنچیر بھی تھا

حد سے گزری ہوئی مٹی چاہہ گروں کی بیلد بھول کر بھی تو نہ لب پر کبھی لایا فریاد
دل پریشاں ہوں میں بھی تو رہا خورم و شاد قید میں بھی تھے حشری کو رہی لفت کی یاد
ہاں کچھ اک رنجِ گرانبازی زنجیر بھی تھا

محلِ یار میں اللہ کے اس کا عہدِ حق تو یہ ہو کہ بڑے بول کا سر ہی نیچا
خوش ہوں اس سے کہ اثر کچھ تو ہوا آہوں کا دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا
نالہ کرتا تھا ولے طالبِ تاثیر بھی تھا

وصلِ شیریں سے وہ گو ہونہ سکا شیریں کام کر گیا کام تو ایسا کہ رہا نام نہ ام
کہتے ہیں سنگتراشی کو جو آپ ادنے کام پیشے میں عیب نہیں کہتے نہ فرما دو نام

ہم ہی آشفۃ سروں میں نہ جو انیر بھی تھا

سینہ زانو سے جو اس نے نہ دبا یا نہ سہی خنجر تیز گلے پر نہ چلا یا نہ سہی

ہاتھ تھمشیر کا بڑھ کر نہ لگتا یا نہ سہی ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی

آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

ہم پہ فایق جو سمجھتے تھے کبھی اپنا حق ان کو یہ خفیہ نویسی کا ملا کیسا حق

ان کی تحریر کو کیوں مانیے سرتا پا حق پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے کھچے پر ناحق

آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

رکھتے تھے دیدہ دیدار طلب شوق لقا پھر جو دیکھا تو سنھے دید کا یار ہی تھا

جلوہ دیکھا بھی مگر دل کا نہ ارماں نکلا بجلی اک کو نہ گئی آنکھوں کے آگے تو کیا

بات کرتے کہ میں لب تشنہ تقریر بھی تھا

دی جو شبیہ سے مہر و رخشاں سے کبھی آگ غصے سے ہوا چہرے کی رنگت بدلی

اس کی تمثیل ہی گویا کوئی دنیا میں نہ تھی یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی

گر بگڑ بیٹھے تو میں لایق تعزیر بھی تھا

انخاری سے توجہ چاہو وہ کہلو غالب تم پہ دیکھا نہیں مہر زانے کسی کو غالب

کوئی دعوے سے ذرا آگے کہے تو غالب ریتختے کے تھیں استاد نہیں ہو غالب

کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

(۲۳)

دنیا میں کبھی کیا کوئی دل بر نہ ہوا تھا بکیش و جفا پیشہ و کافر نہ ہوا تھا
سفاک مگر تیرے برابر نہ ہوا تھا تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا

اور وہ یہ ہو وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا

قدرت جو لگی اور حسینوں کو بنانے اُس کا کوئی ہمتا ہو نہ چاہا یہ خدا نے
پانی نہ تھی تکمیل ابھی نور و ضیائے چھوڑا نہ خشب کی طرح دستِ تھانے
خورشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہوا تھا

کم فخر میں سے نہیں کچھ اشک ہمارے آئینہ ہوئے ہوتے تو گوہر یہی بنتے
ہر مادہ تو ایک ہی ایجاد میں ان کے توفیق بہ اندازہ ہمت ہر ازل سے
آنکھوں میں ہو وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

ابرو سے عیاں خیر و خوار کا عالم مست آنکھ مگر فتنہ بیدار کا عالم
ہو جس سے بپا حشر وہ رفتار کا عالم جب تاک نہ دیکھا تھا قہار کا عالم
میں معتقِ فتنہ محشر نہ ہوا تھا

قسمت یہ کہاں تھی کہ کبیدہ اسے دیکھوں آنکھوں سے ٹپوں پاؤں غشاہ کے مزے لوں
برسوں سے تمنا تھی کہ روٹھے تو مناؤں میں سادہ دل از روگی یا اسے خوش ہوں

یعنی سبقِ شوق مکرر نہ ہوا تھا

لکھنے میں فرشتوں نے سمندر کو کیا خشک
اک لمحہ مسلم کو کبھی ہونے نہ دیا خشک
عاصی ہوں میں ایسا کہ قدم رکھتے ہی تھا خشک
دریا، مناسی، تنگابی سے ہوا خشک

میر اسردا من بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

کیا سوز نہاں پر کسی آتش کو ہو تفصیل
جو اس سے فوائد تھے نہیں قابل تفصیل
سینہ تھا مرا درہم و دینار کی زنجیل
جاری تھی اسدِ داغِ جگر سے مری تحصیل
آتش کدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

(۲۵)

میں کب فدائے خنجر قاتل نہیں رہا
کب تیغِ نازِ یار کا بسمل نہیں رہا
لیکن وہ ضبط اب مجھے حاصل نہیں رہا
عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

دل میں بھرنے ہیں لاکھ غم اس کیئے ہوئے
پوچھو نہ سرگزشت کہ لب ہیں سیئے ہوئے
آیا تھا میں بقا کا ہتھیہ کیئے ہوئے
جانا ہوں داغِ حسرت ہستی کیئے ہوئے
ہوں شمع کشتہ درخویر محفل نہیں رہا

دشمن تھے اس کے سامنے سینہ سپر کہ میں
پھرتے تھے ہاتھ پر وہ لیئے اپنا سر کہ میں

اب غیر ہیں کہ جن سے پھری ہو نظر کہ میں مرنے کی ای دل اور ہی تدبیر کر کہ میں

شایان دست بازوے قاتل نہیں رہا

یکساں گداؤں شاہ سے یہاں ساز و باز ہو محمودِ عنبرِ نوری کے برابر ایاز ہو

دل صاف ہو کسی سے نہیں احتراز ہو برہ و سس جہت در آئند باز ہو

یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

جب سے کھٹا ہوا ہو تصور میں ناب حسن پیش نظر ہو آٹھ پہر آفتاب حسن

اٹھا ہو درمیان سے گویا حجاب حسن واکروئیے ہیں شوق نے بندِ تقاب حسن

غیر از نگاہ اب کوئی حال نہیں رہا

تھا صبح و شام و پے کیس چرخِ کج مدار تھا غم سے وقف در و خوش سینہ تھا و کار

دل تھا ہزار کاوشِ حراماں سے بیقرار گو میں رہا رہیں ستم ہائے روزگار

لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

خوننا بہ جگر سے سدا مثلِ باغباں ہم سینچتے رہے چمنِ الفتِ بستاں

دیکھا مالی کو تو تردد تھا ارے گاں دل سے ہولے کشتِ فامٹ گئی گواں

حاصل سوئے حسرت حاصل نہیں رہا

یہ تیغِ آرمائے تو حاضر ہو سراسر کھینچے یہ تیرا گر تو ہو سینہ سپر اسر

مرزا ہوں کھیل جاؤں گیس جان پر ہند بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اس
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں با



(۲۶) جس کو ہم سمجھتے تھے یارِ مہرباں اپنا ہو گیا وہی دشمن آہ ناگہاں اپنا
ہم نے اپنے ہاتھوں سے کر لیا زیاں اپنا ذکر اُس پر یوش کا اور پھر سیاں اپنا
بن گیا رقیبِ خرتھا جو راز داں اپنا
ان کو تھی ہوسنا کی بکشی میں تھی کپ پیتے تھے جو میے ساتھ کرتے تھے فقط تراب
ضد ہی کچھ سرِ محفل ان کو چڑھ گئی بیہب محو وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یارب
آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا
حالِ اضطرابِ دل کچھ اُسے دکھا سکتے مالہ کے ذریعہ سے دکھا اُسے سنا سکتے
لطف اس کے جلوے کا دمبدم اُٹھا سکتے منظر اک بلندی پر اور ہم ہٹا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا
بستر اُس کے کوچے میں اک طرف جا لینگے جو کڑی پڑے گی ابشوق سے اٹھا لینگے
اب تو اس سے ملنے کی راہ کچھ نکالیں گے دے وہ جس قدر دولت ہم ہمیشی میں لینگے
بارے آشنا نکلا اُن کا پاساں اپنا

دل میں ہو کہ ملنے کی خود ہی اُن سے ٹھہراؤں سلسلہ کتابت کا درمیاں سے اٹھواؤں
 نامہ بر سے کیا ہو گا خود ہی ان کو سمجھاؤں درد دل لکھوں کب تک جاؤں انکو دکھلاؤں
 انگلیاں ٹھکار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

ہو گیا ہوں جب عادی آستان کے سجدوں کا پھر بھی تو پہیں آخر ہوں گائیں جبیں فرسا
 پڑے پڑ جورات اور دن سجدے میں یہاں کرتا گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا
 ننگ سجدہ سے میرے ننگ آستان اپنا

لاکھ اس کی محفل میں غیر کی رسائی ہو اب کسی بُرائی میں لب ذرا ہلائے تو
 اس کے منہ سے کہلایا ہم کو کہنا تھا جو جو ناکرے نہ غمازی کر لیا ہو دشمن کو
 دوست کی شکایتیں ہم نے ہنریاں اپنا

روز کے ستانے سے کر دیا ہو تنگ اس نے حد سے اب تو اسی ہر ترزا بڑھ گئے ستم اس کے
 کہتے ہیں عداوت ہی اس کو ہر ہنرور سے ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں کتنا تھے
 بے سبب ہوا غالب دشمن آسمان اپنا



ظلم پر وہ عذر و حجت لائیں کیا غیر تاویل غلط سرماییں کیا
 چھوڑ کر ایذا دہی سرماییں کیا جو سے باز آئے پر باز آئیں کیا

کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلا میں کیا

جو مقدر ہے وہ ہو گا بے گساں پھر ہوں کیوں مصروفِ سعی راگساں

ہیں اُمیدیں بھی جو قایم ہو جہاں رات دن گردش میں ہیں سلت آسماں

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبراہٹیں کیا

صاف یوں بھی تو نہیں کہتے کہ جاؤ اور نہ یہ مژدہ سناتے ہیں کہ آؤ

وجہ تو اس بے نیازی کی بتاؤ لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ

جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوسا کھائیں کیا

جب چلا قاصد تو ہم تھے ساتھ ساتھ نا و نہرِ جانا نہ پہونچے ساتھ ساتھ

کب گئے تھے اس سے پہلے ساتھ ساتھ ہوئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ

یارب اپنے خط کو ہم پہونچائیں کیا

اس کے در پر ہم جو ہیں بسترِ جمائے قتل کے در پر ہیں سب اپنے پر اے

جس کو ہمت ہو اٹھانے کی وہ آئے موجِ خوں سر سے گز رہی کیوں نہ چلے

آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

شوق ہی میں ہو گئی ہستی تباہ جیتے جی دیکھی نہ اُس کی جلوہ گاہ

مرے ہم موت کی حسرت میں آہ عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ

مر گئے پر دیکھیے دکھ میں کیا

یا تو خط لکھتے تھے ہم کو پڑی پڑی یا تناقل سے کیا قصہ ہی طو
ہی تجاہل اُن کا مرزا طرفہ شو پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلا دو کہ ہم بتلا میں کیا

(۲۸)

شرط ہے اُس کا ذرا جلوہ نما ہو جانا پھر تو آساں ہی مجھے محبت ہو جانا
راحتِ جزو نہیں کل سے جدا ہو جانا عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

یا تو تھا مجھ سے محبت میں کبھی عہداید اب ہے کس تفرقہ انداز کے باعثِ ادو کہ
ہو گیا ایک ہی چمکی میں محبت کا رد تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

ہوتی تھی اس کے لئے فکرِ نئی صبح و شام نہ ہوئیِ واشدگی اور نہ ہوا کچھ آرام
بسکہ درمانِ مخالف سے فنا تھا انجام دل ہوا کشمکشِ چارہ رحمت میں تمام
مٹ گیا گھسنے میں اس عقدہ کا دوا ہو جانا

جب تک ہم سے تعلق تھا اور اکس کی اہ چھیڑ اٹھا یا کیے اور ظلم کیے خاطر خواہ

دفعتا پھر گئے کیوں آپ بتائیں تو گناہ اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ

اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

خونِ اک آتشِ سیالِ مرے دل میں تھا پانی ہو کر دم گریہ جو فزہ پر آیا

خاک بھی تن میں بجز عنصرِ خاکی نہ با ضعف سے گریہ مبدل بہ دم سر ہو

باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

جلوہ گران میں تصور سے ہو تیری مثالِ مردمِ چشم کا آنکھوں سے نکلنا ہو محال

جی میں جو بات کبھی و تبیحے کس طرح نکالِ دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال

ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

اپنی ہستی کو سر بزم جو کرتی ہو فنا شمع نے مجھ سے دم گریہ یہ گھلنا سیکھا

بیخ کن ہو مرا گریہ ہی مری ہستی کا ہو مجھے ابر بہاری کا برس کر گھلنا

روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

سبزہ رکھتا ہی ترے پاؤں کے بجسے کئی نسِ گل کو بازار میں لانی تیرے جلو سے کی ہوس

تجھ تک کس کو نہیں اٹکے پہونچنے کی ہوسِ گرا نہیں نہایت گل کو ترے کوچے کی ہوس

کیوں ہو گرو گروِ جولانِ صبا ہو جانا

جن کو رہتی ہو صفائی کی تنہا ہریلِ خواہشِ تصفیۂ قلب ہیں وہ ہیں بے کل

کر کے رہتا ہی ہر اک رنگ میں قہر اعلیٰ تاکہ تجھ پر کھلے اعجاز ہوا سے صیقل

دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا

قابل دید ہی ہر ذرہ پہاں کا غالب کیوں نہ پھر کیجیے نظارہ دنیا غالب

متفق تم سے ہی اس قول میں مرزا غالب بخشتے ہی جلوہ گل ذوق تماشا غالب

چشم کو چاہیے ہر رنگ میں ہو جانا

(۷۹)

پھر گلوں کا باغ میں منظر کھلا سبز سبز اوراق کا دفتر کھلا

یہ بہار اور ظلم یہ مجھ پر کھلا کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا

کاشکے ہوتا نفس کا در کھلا

ہم ہیں اس دھن میں کہ وہ خود ہی بگا کون جا کر بے طلب نعت اٹھائے

جائیں جاتے ہیں اگر اپنے پرائے ہم پیاریں اور کھلے یوں کون جائے

یار کا دیوارہ پائیں گھر کھلا

ان کو ہو دشمن کی یاری پر گھمنڈ دوستی پر جاں نثاری پر گھمنڈ

اُس کو اپنی ہوشیاری پر گھمنڈ ہم کو ہی اس راز داری پر گھمنڈ

دوست کا ہو راز دشمن پر کھلا

داغ کھا کر دل ہوا تھا باغ باغ تھا مسطر اس گل ترے دماغ
یہ اندھیرے گھر کا تھا روشن چراغ واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ

زخم لبیکن داغ سے بہتر کھلا

باز آیا ظلم سے کب وہ جواں ناز سے اس کے ہی سہل اک جہاں
پھینک دی مڑگاں نے کب اپنی سناں ہاتھ سے رکھ دی کب برو نے کہاں

کب کمر سے غمزے کی خنجر کھلا

خود ہی جب پھرتا ہی یہ گمراہ سا پھر کسی کا خاک ہو گا رہنا
خیراب یہ ساتھ ہو تو حرج کیا مفت کا کس کو بڑا ہی بدرقہ

رہروی میں پردہ رہبر کھلا

کب تک برسائے بارانِ اشک چارہ کس کس کا کرے بارانِ اشک
کیا جگر ٹھنڈا کرے بارانِ اشک سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک

آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا

ہو گیا جامِ مسرت جامِ مرگ حور کا بازو بنی صمصامِ مرگ
نکلی صبحِ زندگانی شامِ مرگ نامہ کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ

رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

اس سے بڑھ کر رند کیا ہو گا کوئی ہو نہیں سکتا کبھی ایسا کوئی
 اس کو کیا پھیلے گا اور مرزا کوئی دیکھو غالب سے گرا بچھا کوئی
 ہر ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

ردیف (ب)

(۳۰)

ہر مرے واسطے سامانِ بقا موجِ شراب اس سے جیتا ہوں کہ ہو موجِ فزا موجِ شراب
 ایک سنگ نہ تھی جلوہ نما موجِ شراب پھر ہوا وقت کہ ہو بالکشا موجِ شراب
 دے بیڑ کو دلِ دستِ آشنا موجِ شراب
 بنم زندانِ فدا رہنا ہو گلشن بادہ نوشوں کی طرح جھومتے ہیں سرو و تن
 بچو دوست ہیں مرغانِ گلستاں ہمہ تن پوچھ مت وجہ سیہ سستی اربابِ چمن
 سایہ تاک میں ہوتی ہی ہو اموجِ شراب
 جو جسے مل گئی شاہانہ داغ اس کا ہی تختِ شاہی کی پھر اس مست کو پردا کیا
 کون ہو اس کا مشاوریہ عجب دریا ہو جو ہو اغرقہ می تختِ رسا رکھتا ہو
 سر سے گزرے پہ بھی ہو بالِ ہما موجِ شراب

خشک استیجار کو بھی اس نے کیا بار آور دو رکھا ہو کہ لگیں سرو چراغاں میں شر
ہوئی ہے اس کی ہو ابھی عجب اعجاز اثر ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہو اگر

موج ہستی کو کرے فیض ہو اموج شراب

موسم گل نے گلستاں میں کیا کیا جاو پھولے پڑتے ہیں مسرت سے گل خنداں و
موج میں پھرتی ہو مستانہ گلوں کی خوشبو چار موج اٹھتی ہیں طوفان ہوا سے ہر سو

موج گل موج شفق موج صبا موج شراب

مکدے میں جوشب روز ہیں سرگرم نیاز ان سے پوچھے کوئی شادابی گنزار کارا ز
ہے بارہاں کی کرامت نہ ہو اکا اعجاز جس قدر روح بنائی ہے جگر تشہ ناز

دے ہی تسکیں بدم آب بقا موج شراب

اپنی حرمت میں یہ نکلی گل تر سے برتر رنگ پر اس کے قدا دل ہو تو صدفی جگر
قوتِ نایب نام اس کا نہو اس کا اثر بسکہ دوڑے ہو رگ تاک میں خوں ہو ہو کر

شہپر رنگ سے ہو بالکشا موج شراب

جامِ جمشید کا ہمسرہ مرا جامِ سفال سامنے ہیں مری نظروں کے جہاں کے احوال
کیوں نہ حاصل ہو مری فکر و خشاں کو کمال موج گل سے چراغاں ہو گزیر گاہ خیال

ہو تصور میں زبیں جلوہ نما موج شراب

آنکھ میں آنے ہی چڑھتی ہے یہ بالائے دماغ موجزن دل میں ہے ہر وقت ٹٹائے دماغ
 ہے جو مرغوب اسے منزلِ زیبائے دماغ نشہ کے پڑے میں ہے موجِ ٹٹائے دماغ
 بسکہ رکھتی ہے سر نشو و نما موجِ شراب

ہے عجب عالم نورانی کیفیتِ فصل کیفیت کوئی نہیں ثانی کیفیتِ فصل
 کچھ کیوں نہ ثنا خوانی کیفیتِ فصل ایک عالم پہ ہے طوفانی کیفیتِ فصل
 موجِ سبزِ نو خیز سے تامل موجِ شراب

جس کو اس بزم میں ساقی نے دیا ساغرِ دل اس کے سر میں نہاد ہم و خیالِ جزوِ کل
 شایعِ فصل گلستاں ہے نوائے بلبل شرح ہنگامہ ہستی ہے نہیے موسمِ گل
 رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے خوشامیجِ شراب

شوقِ بادِ دل مرزا میں بھرا پھر سجد بعدِ توبہ کے کہیں پھر نہ خطا ہو سرزد
 فصلِ گلِ جوش پہ ہے ابر کی بھی آند ہوش اُٹتے ہیں مے جلوہ گل دیکھ استاد
 پھر ہوا وقت کہ ہو بالکشا موجِ شراب

رویفات

(۳۱)

خار زار ایتو ہوا ہی گلشن کے خارِ دوست اونیوے سبزہ سے صرف خزاں گلزارِ دوست
چھپ گئی ہی تیرگی میں تابشِ انوارِ دوست آمدِ خط سے ہوا ہی سرو و جو بازارِ دوست
دوستِ شمع کشتہ ہو شایدِ خطِ خسارِ دوست

آنکھ اٹھائے اُس کے نظارہ کو ہو کس کا جگر کیا لڑا سکتا ہی کوئی برقی تاباں سے نظر
لن ترفانی اس کو زیبا ہی کمالِ حسن پر اسے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر
کون لا سکتا ہو تابِ جلوہ دیدارِ دوست

سامنے ہو کر مرے گزرا کچھ اُن انداز سے ہر قدم پر پامالی کے مرے میں نے لیے
کرویا سرِ تاباں اک دیدہ حیرانِ مجھے خانہ ویراں سازیِ حیرت تماشا کیجیے
صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتہ رفتارِ دوست

غیر کے ساتھ ان کو دیکھوں یہ کہاں لیرا مجھے پوچھنے آئے تو دکھلایا یہ نظارہ مجھے
کچھ نظر آیا نہ مرنے کے سوا چارہ مجھے عشق میں بیدارِ شکِ غیر نے مارا مجھے
کشتہ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست

ہوا اگر ہر آن ہم پر اک نئی افادہ ہی اپنا لب کب اُٹھائے شوہِ بیدادہ ہی

خوش ہو وہ زاری سے اور لذت کش فریاد ہو چشم مارو شن کہ اُس بیرون کا دل شاد ہو
دیدہ پرخوں ہمارا سا غم سرشار دوست

قطعہ

یہ فاقہ کی جو ٹھہرائی ہو اس نے ہجر میں چاہتا ہی دیکے دھوکا بھید کچھ لے ہجر میں
اس بہانے سے غم و ایزد انکھٹے ہجر میں غیروں کرتا ہی پیش مجھے اُس کے ہجر میں
بے تکلف دوست جیسے کوئی غمخوار دوست

ادعا یہ ہو کہ ہیں تابع مے جن و ملک مہر و مہ جو و پری و آدمی ارض و فلک
یوں بیاں کرتا ہی اس مغل کی باتیں بیدھڑک تاکہ میں جانوں کہ اس کے رسائی و اس تک
مجھ کو دیتا ہی پیام وعدہ دیدار دوست

میرے ہر اک زرد کا ظالم لگاتا ہی سرخ ادویہ کہتا ہی کہ اب حال ہوا اس سفر غ
کیا بتاؤں مجھ کو دکھلاتا ہی کیا کیا سبز باغ جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوہ ضعف و ماغ
سر کرے ہی وہ جاہل لطف غنیمت دوست

باتوں باتوں میں لگا دیتا ہی دل میں بیشتر یاد دلواتا ہی باتیں یار کی آٹھوں پہر
ہو تسلی و دلاسا سے جھنا مد نظر چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہی اگر
ہنس کے کرتا ہی بیان شوخی گفتار دوست

دشمن اس کا مسئلہ آیا ستانے کے لیے دوست بن کر ظلم اس انداز سے اس کیجئے
ہوں تحیر میں کچھ دونوں میں سے دکھ کس نے دیئے مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجئے

یا بیاں کیجئے سپاس لذتِ آزارِ دوست

بات جو ہوتی ہر اچھی دل میں کہب جاتی ہو آپ کیہنچ کر سامع کا دل اپنی طرف لاتی ہو آپ
بلع مرزا دم بر م یہ کہہ کر اتر آتی ہو آپ یہ غزل اپنی مجھ جی سے پسند آتی ہو آپ

ہو رویف شعر میں غالب زمیں تکرارِ دوست



ردیف (د)

ناز کا لطف حبیبوں سے گیا میرے بعد (۳۲) دلربا عشوہ دکش نہ رہا میرے بعد
وہ کرشمہ نہ رہا ہو شرابا میرے بعد حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد

بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

شیوہ غنچ و دلال آج جہاں سے اٹھا کام سے اپنے ہوا نازِ معطل گویا
اب کہاں ہو کوئی دل ان سے جو ہو عہدِ بڑا منصبِ فتنگی کے کوئی قابلِ نرا

ہوئی معزولی اندازِ وا دا میرے بعد

اب کہاں ہو کوئی سر باز میسر مجھ سا تیز جس کے لیے کی جائے گی شمشیر تفتنا
اب تو بیکار رہی خود جو ہر ذاتی اس کا درخور عرض نہیں جو ہر سیداد کو جا
نگہ ناز ہی سرمہ سے خفا میرے بعد

یا کبھی ان کی پھر انگشت لہو میں تر تھی یا نظر آتی تھی پوروں پہ خاک کی سُرخ
میری مرتے ہی صد افسوسِ نوبت پہنچی خوں ہو دل خاک میں احوالِ بتاں پہنچی
ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حایمے بعد

آج دُنیا سے اٹھی دستِ گریباں کی نزاع اب کبھی ایک جگہ ان کا نہ ہوگا اجماع
رہنِ عشق سے محفوظ ہوئی دل کی متاع ہو جنوں ہل جنوں کے لیے آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہو گریباں سے جدائے بعد

و کدے بند ہوئے سرو ہوا گلخنِ عشق کون ایسا ہو کہ آباد کرے گلخنِ عشق
ہو کوئی اب کہ ہوا سوارِ سر تو سن عشق کون ہوتا ہو حریتِ مئے مردِ افکنِ عشق
ہو مگر رلب ساقی پہ سلام میرے بعد

بزمِ الفت ہو دھواں دھار تو حیرت کیا ہو کیا تعجب ہو جو اندھیر پہاں چھایا ہو
مجھ سا پردانہ جانشوز کہاں پیدا ہو شمع بجھتی ہو تو اس سے دھواں ٹھٹھا ہو
شعلہ عشق سیہ پوش ہو امیرے بعد

موتوں روئے کی سرپیٹ کے حسرت میری کوئی بھی بات نہ پوچھے گا تمناؤں کی
 بیکی ہوگی پس مرگ بعد پر چھپائی غم سے مرنے والوں کو اتنا نہیں دنیا میں کوئی
 کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد

چھوٹ کر مجھے ہوا بیکیں و تنہا غالب ایسا وارفتہ کہاں اس کو ملے گا غالب
 ہاتھ ملتا ہو جو افسوس سے مرزا غالب آئے ہو بیکی عشق پہ رونا غالب
 کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد



ردیف (ر)

(۳۳)

ہوئے ہیں سدا رہ شوق در و دیوار نہ اس کو روک سکیں گے مگر در و دیوار
 کریں گے اور اسے تیز تر در و دیوار بلا سے ہیں جو یہ پیش نظر در و دیوار

نگاہ شوق کو ہیں بال و پیر در و دیوار

شب فراق میں رونے کی آگئی جو آنگ تپیل کی پل میں ہوا کچھ عجیب گھر کا ڈھنگ
 ادھر ہی خشت کا انبار ادھر ہی تودہ سنگ و غور اشک نے کاشا نہ کا کیا یہ رنگ
 کہ ہو گئے مرے دیوار و در و دیوار

خبر جو ہو کہ سرِ شام آئے گا وہ نگار تو سایہ حد سے بڑھتا کہ ہو قدم پہ نثار
چلا ہی جاتا ہو بڑھتا ہوا نہیں ہو قرار نہیں ہو سایہ کہ سنکر نویدِ مقدم یار
گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

چڑھا دماغ میں کچھ نشہ شباب ایسا کہ گرم کر دیا بازار خود مانی کا
کسی سے اب تجھے مطلق حجاب بھی نہ رہا ہوئی ہو اس قدر رزانی سے جلوہ
کہ مست ہو تے کوچے میں ہر در و دیوار

سدا جو جانب دیوار و در رہا نکتا ہوا ہو آئینہ ہر سنگ و خشت حیرت کا
کیئے ہیں کام مری چشم شوق نے کیا کیا جو ہو تجھے سر سودا سے انتظار تو آ
کہ ہیں دکانِ مستاعِ نظر در و دیوار

رہی ہمیشہ جو گردش ہی سایہ کو گھر کے یہ شوق تھا کہ بلا میں یہ اس کے گھر کی لے
نصیبِ خنہ مرے غم کدہ کے جاگ اُٹھے وہ آ رہا مرے ہمسایہ میں تو سایہ سے

ہوئے سدا در و دیوار پر در و دیوار

یہ آرزو ہو کہ اپنوں سے پائیں آزادی یہ وفاق ان کی ہنہیں ہم کو وجہِ نشادی
پہل پہل سے پریشان ہیں دل سے فریادی نظریں کھٹکے ہو بن تیرے گھر کی آبادی
ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار

ہمیشہ ضبط ہی گریہ کو کر لیا میں نے اُمٹ کے اشک جو آئے ابھیں پائیں نے
یہ عجز دیکھ کے گھر کو بچا دیا میں نے ہجوم گریہ کا سامان کب کیا میں نے
کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار

ہر ایک جزو ہو گھر کا سرور سے بیتاب ہر ایک ذرہ نظر آ رہا ہو مست خراب
ہم آئے اشک نے گویا اٹھائیئے ہیں حجاب نہوچھہ بخود ہی عیشِ مقدم سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے سر در و دیوار

نہ کوئی دوست ہو غمِ رزا کہیں زمانے میں نہ رازِ دواں ہو نہ ہو ہمیشیں زمانے میں
بھرے پڑے ہیں بہت ہل کیں زمانے میں نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانے میں
حریفِ رازِ محبت مگر در و دیوار



پایا نہ میرے گھر کو سنگِ گریہ بغیر ڈھونڈا ہو گھرِ قریب کا کیونکر کہے بغیر
بجھا مرا پستہ نہ مگر رکھے بغیر گھرِ جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

جب تک کہ دیکھتے تھے کہ ہو قدرتِ سخن اک روز بھی تو مجھ کو نہ دی نصرتِ سخن
پھٹا کبھی تو بولے نہیں فرصتِ سخن کہتے ہیں جب ہی نہ مجھے طاقتِ سخن

جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

حرام نصیب کون ہی ہمسایہ جہان میں بخلا نہ کوئی کام ہمارا جہان میں
کس طرح دیکھیے ہو گزارا جہان میں کام اس سے آپڑا ہو کہ جس کا جہان میں
یہوے نہ کوئی نام شکر کہے بغیر

کیا کیا تمہارے ہاتھ سے ہوتے نہیں ستم کیا کیا ہمیں پہنچے نہیں تم سے رنج و غم
لیکن جو ہو ذرا بھی شکایت تو لو قسم جی میں ہی کچھ نہیں ہو ہمارے ورنہ ہم
سہرا جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

ابرو کو اس کی کہتے ہیں شمشیر خوش نیام تیرا جل ہی اس نگہ جاں ستاں کا نام
ہوتا ہو مراد کے بیاں میں اک انتظام مقصد ہو ناز و غمزہ وے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہو دشمنہ و خنجر کہے بغیر

بہتر سمجھتا ہو کوئی پتھر کو پوجنا مذہب کسی کا مہر منور کو پوجنا
ایمان عاشقوں کا ہو دلیر کو پوجنا چھوڑوں گا میں اس بت کافر کو پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

ہوتا نہ کس طرح سے فرائے غم ویدو دکھلا رہا تھا عالم مستی مقام ہو
پیش نظر خدا ہو جو ساقی ہو روبرو ہر چند ہو مشاہد حق کی گفتگو

بستی نہیں ہی شیشہ و ساغر کہے بغیر

رکھتا ہوں پاس اس لیے کاغذ قلم و دوات

تھرپستے ہوتا بسہولت ہر ایک بات

مکن ہی کوئی دن کہے سمجھوں میں سکورات

سنا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

مرزا نے کچھ کیا جو کبھی حالِ نازِ عرض

انجام یہ ہوا کہ ہوئی ناگوار عرض

یوں ہی نہ ہو کہیں دلِ نازکِ پارِ عرض

غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض

ظاہر ہی تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

۳۴

اس بامِ پر تجلی افوار دیکھ کر

جیراں ہوں اپنے آپ کو ہشیار دیکھ کر

بھپکی نہ آنکھ برقِ شرر بار دیکھ کر

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر

جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

رکھتی ہو رات دن تپشِ دلِ تپاں مجھے

تَابِ سکوں ہی برق کی صورت کہاں مجھے

کرنا نہ آیا سو زحمت نہاں مجھے

آتشِ پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے

سرگرمِ ناہائے شرر بار دیکھ کر

ظلم و ستم کا وقت ہی کوئی نہ جو رکھا

اک کھیل ہو گیا کہ جب اٹھے ستار لیا

دل اب تو اُٹام سے ہی محبت کے کانپنا کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جانا

رُکنا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

نوبت نہ آئی تھی کہ گلے پر مے چلے چلنے سے اس کے پہلے ہی مرنا پڑا مجھے

یہ اور بوسے لے مے قاتل کے ہاتھ سے اتنا ہی میرے قتل کو پر جوش ششک سے

مرتا ہوں اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

مستی نے تیری کھو دیا صبر و سکونِ خلق ہی لغزشِ خرام سے زخمی درونِ خلق

شیشہ ہوا ہی باعثِ حالِ زبونِ خلق ثابت ہوا ہی گردنِ مینا پہ خونِ خلق

لڑے ہو موجِ محو تری رفتار دیکھ کر

پڑنا ہو دمِ مری سر پر الم سے ہاتھ مصروفِ سینہ کو بی ہی ہر وقت غم سے ہاتھ

قیمت کہاں وہ شمس کے ملا کر ہم ہاتھ واحترنا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ

مجھ کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

مضمون ہمارے تلے ہیں لعلِ مین کے ساتھ نسبت ہی حرفِ حرف کو درِ عدن کے ساتھ

یتنا ہی اس کو کوئی اگر قدر فن کے ساتھ یک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ

لیکن عیارِ طبعِ خرد بیدار دیکھ کر

چلنے سے پیشتر تھے لازم ہی دیکھ بھال رستے کی اونچ نیچ سے چلنا نہ وہ بال

پرسنگ آہ میں بھی ہو غافل سفر محال زنا ربانہ سبجہ صد دانہ توڑ ڈال

رہرو چلے ہو راہ کو ہوار دیکھ کر

دن رات خاک دشت کی یا چھانٹا تھا میں پا کچھ دنوں سے نقش قدم بن رہا تھا میں

مثل شکستہ پاسروادی پڑا تھا میں ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں

جی خوش ہوا ہو راہ کو پڑ خا رو دیکھ کر

اس درجہ بطنی ہو خدا جانے کیوں اُسے ہر دم یہ وہم ہو کہ محبت ہو اور سے

کہتا ہو ہنسکے مجھ کو ہری چگ اسی لیے کیا بدگمان ہو مجھ سے کہ آئینہ میں مرے

طوطی کا عکس سمجھے ہو زنگار دیکھ کر

بہت بٹھائی ہوتی طلیکار نور پر خاک سیہ پہاڑ ہوا کس قصور پر

یہ گرمیاں یہ غیظ اور اک لے شعور پر گرنی تھی ہم پہ برق تجسلی نہ طور پر

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

دیکھا جو آستانہ تو آنکھوں میں پھر گیا حرز اکا صبح و شام وہ سجدوں کا مشعلہ

دبے جو پھر لہو کے نظر آئے جا بجا سر پھوڑنا وہ غالب آشفہ حال کا

یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

یہ سرگرمی ہوا حق میری بربادی کے سناں پر
فضول اتنا ترس آیا کہ اس گریبانِ تیراں پر

عنایت کی یہ کیوں مجھ زار کے حالِ تیشاں پر
لرزنا ہی مرادِ رحمت مہرِ درخشاں پر

میں ہوں وہ قطرہ شبنم کہ ہوں غریباں پر

ہوئی گوشت کے ہاتوں زمانے بھر میں سوئی
ہو ابے ساز و سامانی پہ بھی سامانِ نیساں

سیہ خانہ میں جب آئے کہ بھگتیں قید تنہائی
نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی

سفیدی دیدہ یعقوب کی پھرتی ہو زنداں پر

جنوں مانع ہوا استاد کا احساں ٹھانے سے
فراغت پا چکا روزِ ازل پڑھنے پڑھانے سے

رہا انکار عقلِ کل کو غیبِ لہر بتانے سے
فنا تعلیمِ درسِ بیخودی ہوں اُن مانے سے

کہ جنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

جگر میں خلیش ہرگز نہ رہتی نشترِ غم سے
یہ ایذا میں نہ ہو تیں جو ہیں اچھے کئے مے

کوئی دم جان کو مہلت تو ہوتی درِ بہیم سے
فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے

بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے فلِ نکلاں پر

جدا ہو نقشہ عالم سے حسن آباد کا نقش
وہاں بیٹھا ہی سکے ہو تراول سے کرشمے کا

بہت فرمانِ جاری تھے مگر دیکھا تو یہ دیکھا
نہیں اقلیمِ الفت میں کوئی طومارِ نازِ ایسا

کہ پشتِ چشم سے جس کے ہنوسے ہنر خواں پر
 پریشانی کے عالم میں جودل بہلانے جاتا تھا
 نظر آتا تھا مجھ کو تختہ گلزار گلشن سا
 جلانا تھا مرے دل کو بھڑکنا آتشِ گل کا
 مجھے اب دیکھ کہ ابرِ شفق آلودہ یاد آیا
 کہ فرقت میں تری آتشِ ہستی تھی گلستانِ
 نہیں آناظرِ علت سے خالی صورت کا پھٹکنا
 اُڑایا جائے گا آسودگانِ خاک کا خاک کا
 لے جو خاک میں پھر انکی بربادی سے چل گیا
 بجز پردہِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہو گا
 قیامت اک ہوئے تند ہو خاکِ شہیدان پر
 نصیحت گر سے مرزا و جد کیا آخرِ خصوصیت کی
 کہ پسندِ مشفقانہ ہو دلیل اس کی محبت کی
 سرانگھوں پر ہر ہمدردی سے جو کچھ بھی نصیحت کی
 نہ لڑنا صحیح سے غالب کیا ہو اگر اس شدت کی
 ہمارا ابھی تو آخرِ زور چلتا ہو گریباں پر

»»»

(۳۷)

ہیں مصطلحات ان کے جدا ان کی نیاں اور
 الفاظ ہیں کچھ اور معانی و بیاں اور
 ہر بات دو فصلی ہی نہیں اور ہواں اور
 ہو بسکہ ہر ک ل ن کے اشارے میں نشان اور
 کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہو گماں اور
 مدت سے ہو اظہارِ تمنا سے ملاقات
 ہوں ان سے طلبگارِ مصافات و مدارات

بنتی ہی نہیں بات یہ کیا بات ہی یہ بات یارب نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات

دے اور دل اُن کو جو نہ دے چھوٹاں اور

اس کے لب شیریں کے مقابل میں ہو کیا قند ہو برق کہاں اور کہاں اُس کا شکر خند

تنبیہ دیا کرتے ہیں اکثر جو خرد مند ابرو سے ہو کیا اس نگہ ناز کو پیوند

ہو تیر مقرر مگر اس کی ہو کہاں اور

انداز ہو نخوت کا وہی نفس دنی میں وارفتہ یہ کجخت رہا کبر و منی میں

سرگرم خودی کی ہے ہم بیخ کنی میں ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں

ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہو شگ گراں اور

سر پر کبھی تازیت یہ الزام نہ لیں گے بکتی ہوئی اشیا ہیں تو کیا بخل کرینگے

مانگو گے اگر وزنئے ڈھونڈھ کے دینگے تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے

لے آئیں گے بازار سے جا کر دل جاں اور

مانا کہ مری آنکھوں سے جاری ہوا سوتا یوں آنسوؤں رونے سے تو دل خوش نہیں ہوتا

ہاں خون کے سیلاب میں اپنے کو ڈبو تا ہو خون جگر جوش میں دل کھول کے روتا

ہوتے جو کئی دیدہ خوں ناپہ فشاں اور

کھائے جوئے زخم تو بسمل کوئے آئے او کاش وہ پرئے تن مجروح کئے اڑوئے

یارب کہیں جلاد نہ تعمیل میں اُتتا ہے
مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اُٹ جائے
جلاد سے لیکن وہ کہے جائیں کم ہاں اور

نالوں کے دھوئیں کا ہوشب تار میں نقش
انجم میں ہو آہ شرر افشاں کا تماشا
ہوشعلہ الفت سے زمانے میں اُجالا
لوگوں کو ہو خورشید جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں کدِ مرغِ نہاں اور

دلِ باختہ کو کب ہوتے سر کی قسم چین
پاتا ہوں کہاں بستہ زنجیرِ الم چین
دیتے ہیں کہاں مجھ کو شبِ روز کے غم چین
لیتا نہ اگر دلِ بھقیں دیتا کوئی دم چین
کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

ٹھٹھتے نہیں رستہ جو دراپاتے ہیں نالے
بہتے ہوئے اشکوں کے چلے آتے ہیں نالے
وہ جوش ہو دریا کو بھی شرماتے ہیں نالے
پاتے نہیں جب آہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکستی ہو مری طبع تو ہوتی ہو رواں اور

پسے شعر اُکھتے تھے جو ہر بہت اچھے
ٹھٹھے سیکڑوں ایک ایک بہت بہت اچھے
مرد کے بھی اشعار ہیں اکثر بہت اچھے
ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہوا اندازِ بیاں اور

(۳۸)

وقفہ جو یہاں مجھ کو ابھی تھا کوئی دن اور تم کو بھی مناسب تھا ٹھہرنا کوئی دن اور
 تم نے نہ مرا سا تھکنا ہا کوئی دن اور لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
 تنہا گئے کیوں اب ہو تنہا کوئی دن اور

در پر ترے اس خاص غرض سے ہوں جن میں سا منظور ہو ہستی کا مجھے اپنی منسا نا
 ہو سخت اگر سنگ در اس کی نہیں پروا مٹ جائے گا سرگر ترا پتھر نہ گھسے گا
 ہوں در پر ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

بگڑے ہوئے آثار ہیں کیا بات بناؤں کچھ دھڑکے ہو تو بہت دو کہ مناؤں
 اک بات ذرا سی ہی جو مانو تو بہت ناؤں آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
 مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

دیرینہ محبت کا کیا پاس نہ تم نے حیرت ہو کہ کس دل سے جدا ہوتے ہو مجھ سے
 باز بھی ہو کر ملکِ عدم کے ہیں اداوے جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
 کیا خوب، قیامت کا ہو گیا کوئی دن اور

کس فوق سے تھا محو تماشا ابھی عارف اس بزم سے کس واسطے اٹھا ابھی عارف
 کیوں ہو گیا پیوند زمیں کا ابھی عارف کیوں ای فلک پیر جو اٹھا ابھی عارف

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

والہ تمھیں گھر کے اُجالے کا سیب تھے چھایا ہوا اک اندھیر مری آنکھوں کے آگے
کس خاک کے پروے میں تھپہ پیری نظر سے تم ماو شب چاروہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور

مانا کہ وہ آیا تھا فقط جان ہی لینے ممکن تھا کہ حیلہ سے اُسے اُلتے رہتے
کچھ بات بنا دیتے تو کیوں چھوڑتے ہم سے تم کون سے تھے ایسے کھرے دوست کے
کہ تاملک الموت تقاضا کوئی دن اور

جلدی جو یہ کی جانے میں کیا جی میں سمائی جاتے ہوئے ہر ایک کیوں آنکھ پھرائی
افسوس نہ اپنوں کی بھی الفت تمھیں آئی مجھ سے تمھیں نفرت سہی میرے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ مناشا کوئی دن اور

ناراض ہی تم تھے تو دل غمزدہ تھا خوش تم سامنے تو رہتے تھے ناخوش ہے یا خوش
جب تم نہ رہے یہ تو کہو دل ہے کیا خوش گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جو انمرگ گزارا کوئی دن اور

چوڑے گی ابھی جان کہاں رشتہ قالب مرزا ابھی سمجھے نہیں تم اس کے مطالب
کیا زیت ہے ایسے کی جو ہو موت کا طالب ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالب

قسمت میں ہو مرنے کی ٹمنا کوئی دن او

✱

(۳۹)

اجابتوں پہ دعاؤں کی کیجیے کیا ناز نہ عجز اپنا ہوا کارگر نہ سوز و گداز
ازل میں بسکہ ہر اک شو کا ہو چکا ہو طراز حریف مطلب مشکل نہیں فسونِ نیا ز
دعا قبول ہو یا رب کہ عمر حضور دراز

نظری جب نہیں پھر دوڑ و صوب ہو بے سود ابھی ہو تجھ سے بہت ورنہ نزلِ مقصود
ہر ایک ذرہ میں ہو نور ہستی مبعود نہ ہو ہر ذرہ بیاباں نور و ہم وجود
ہنوز تیرے قصور میں ہیں نشیب فراز

ہم آج تک تو رہے شکل و یدہ حیراں ہوا نہ سامنے نظروں کے حسنِ یار عیاں
گزاریں صبر میں کچھ اور دن کہاں یہ توان وصالِ جلوہ تماشا ہی پر دماغ کہاں
کہ دیکھیے آئینہ انتظار کو پرواز

رہا ہو یہ تہہ خنجر بھی ذوقِ دید میں مست گیا ہو جان سے پھر بھی ہوا خیالِ پست
کیا ہو یار کے پر تو نے اس کو نیست بہت ہر ایک ذرہ عاشق ہو آفتاب پرست
گئی نہ خاک ہوے پر ہوائے جلوہ ناز

عجب مقام میں مر رہا ہو کیا کہوں غالب مثال اس کو اگر دوں تو کس سے دل غالب

فضائیں عالم امکاں سے ہو فزوں غالب نہ پوچھ وسعتِ مینا نہ حسنوں غالب
جہاں یہ کاسہ گردوں ہو اکب خاک انداز

(۴۰) مفت ہوتے ہیں پریشان عزیز کیا مجھے سمجھے ہیں نادان عزیز
جھک رہی یا رکاشِ فرمان عزیز کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہو مجھے ایمان عزیز
مشکل اس کا ہی نکلنا دل سے ہو قفلِ بھی بلا کا دل سے
تیر کو تو نے جو کھینچا دل سے دل سے نکلا یہ نہ نکلا دل سے
ہی ترے تیر کا پیکان عزیز
اُن نہ مرزا نے کبھی کی غالب جو مصیبت پڑی جھیلی غالب
ضبط لازم ہو تمہیں بھی غالب اب لاتے ہی بے گی غالب
واقعہ سخت ہی اور جان عزیز

(۴۱) میری ہستی ہوا ک نوکھاراز ہیں بقا و فنا ہم دم ساز
ظاہر انجہام ہو نہ کچھ آغاز نہ گلِ نعمہ ہوں نہ پردہ ساز

میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تجھ کو ہنسنے سے کام صورتِ گل میں ہوں اور ہم نوائیِ بلبل
لاگ دونوں میں اُڑی باکل تو اور آرایشِ خم کا کل

میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

بس زیادہ نہ لے تسلی کی غیر ممکن ہو دل کی آزادی
کیا عجب ہو کھلے یہ پردہ کبھی لافِ تمکین فریبِ سادہ دلی

ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

جب سے کنجِ نفس کیا آباد بھول کر بھی نہیں چین کی یاد
دل نہیں چاہتا کہ ہوں آزاد ہوں گرفتار الفتِ صیاد

ورنہ باقی ہو طاقت پرواز

تنگ آیا ہوں ہجرِ دلبر سے کیوں نہ آنکھوں سے اشکِ غولبر سے
دل کہاں تک فراق میں تر سے وہ بھی دن ہو کہ اس شکر سے

ماز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

یہ کوئی ضبط ہی کہ میں چپ ہوں دل ہو خالی تو کیا لہو روؤں
روتے روتے ہوا ہی حالِ زبوں نہیں دل میں مرنے وہ قطرہ غول

جس سے مرگیاں ہوئی نہ ہو گلباز

تسخ بڑاں تری ہنگامہ تیز
عشوہ تیرا جہاں سے گرم سیز
خوش خرامی تری قیامت خیز
اے ترا جلوه پاک متلم انگیز
اے ترا ظلم سر بسر انداز

اٹھ گیا ہی نقاب روئے نکو
خوب نکلیں گے حسرتیں اب تو
منع ہا بوس سے نکر مجھ کو
تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو
رینزش سجدہ جبین نیاز

غم سے کس دن میں جاں بلب نہ ہوا
ورد سے حال غیر کب نہ ہوا
لطف مجھ پر یہ بے سبب نہ ہوا
مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا
میں غریب اور تو غریب نواز

سرخوش و مست نظم رہتا تھا
دل سے نکاشا ہر سخن پہ فدا
روئے خاک اڑا اے حرزا
اسد اللہ خاں تمام ہوا

اے درینا وہ رند شاہباز

ردیف (ک)

(۳۲)

چاہتے یہ شوخ تو دنیا میں کیا کم تھا نمک
انگ کے بدلے یہ لے سکتے تھے پتھر کا نمک
ان کے ہاتھوں کب دہان زخم نے چھانک
زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک
کیا مرہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

بے سبب کب ہو نمک سے احتراز زخمِ دل
تو نہیں اقف تو مجھ سے پوچھ را ز زخمِ دل
اُس کی خاکِ پا پھر کئی چارہ ساز زخمِ دل
گردِ راہِ یار ہی سامانِ ناز زخمِ دل
ورنہ ہوتا ہی جہاں میں کس قدر پیدا نمک

چاہتا ہوں میں تو یہ پیرا کوئی تہہ و بہو
اور مرہ مجھ کو یہ ہی دیکھوں اسے ہنستا بہو
حسرتیں نکلیں کہیں فصلِ بہاری آئے تو
مجھ کو ارزائی رہے تجھ کو مبارک ہو جو
نالہ بلبیل کا درد اور خندہ گل کا نمک

غیر ممکن تھا کسی مرہم سے ہو اس کا علاج
تھا اسی درماں کا طالب اس کے زخموں کا علاج
تھی تاکِ دو کس کی اس کو اور کس کی اجیلج
شوہرِ جولاں تھا کنارا بحر پر کس کا کہ آج
گردِ ساحلِ ہی بہ زخمِ موجِ دریا نمک

یکھ لے اُس شوخ سے کوئی محبت کا نباہ
گو بظاہر ہو چکی ہی مجھ سے ترکِ ہم دریاہ

پھر بھی مجھ پر کس قدر مہربانی کی نگاہ
داد دیتا ہے مرے زخم جگر کی واہ واہ
یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہو وہ جس جانک

لو آکر یہ کیسی لگ رہی جوان کو
ماں کہ ہو اس حسرت کا قصہ آسانی سے طو
تم گئے مجھ پر لگے ہونے لگاھے پڑ پڑ
چھوڑ کر جانا تن مجروح عاشق صیف ہو
دل طلب کے تاہو زخم اور مانگیں ہیں عصا نامک

ہو درد سے چارہ جوئی باعثِ تحقیر درد
کیوں کسی کی سعی سے حاصل کرتا تیر درد
اس کے منسنے سے مجھے ہاتھ آگئی تدبیر درد
غیر کی منت نہ کھینچوں گا پسے تو غیر درد

زخم مثلِ خستہ قاتل ہو سرتا پانک
اپنی آنکھوں سے جو تیرے شوق کو پھر دیکھ لیں
اب کہاں ہ زخم کھائے اور کہاں ہ لذتیں
یاد ہیں غالب مجھے وہ دن کہ دھیر ذوق ہیں
زخم سے گرتا تو تو پلوں سے چیتا تھا نامک



ختم قصہ ہو شبِ ہجر بسر ہونے تک
صورتِ شمع ہوں جہانِ سحر ہونے تک
کیا خبر حال ہو کیا تجھ کو خبر ہونے تک
آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

اک تلامذہ ہی بیا کیوں نہ ہے پھر دل تنگ روز طوفان حوادث کا ہوا مادہ جنگ
کس طرح دیکھئے بیچارہ کی نکلے گی اُمنگ دام ہر موج میں ہی حلقہ صد کام نہنگ

دیکھیں کیا گزرے ہی قطرہ پہ گہر ہوئے تاک

آتش ہجر سے حالت ہو جگر کی جو خراب کشکش سے ہی مری جان گرفتار عذاب
دل یہ کہتا ہو کہ پہلے مجھے کیجئے خون تاب عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب

دل کا کیا رنگ کروغن جگر ہوئے تاک

تم سے اور وعدہ وفا ہی ہو کبھی ناممکن دیکھ لیں خیر کہ لائے ہو خدا کو صفا من
اپنی اس دار فنا میں ہو بقا ہی کو دن ہم نے مانا کہ تنافل نہ کرو گے لیکن

خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہوئے تاک

ہو گیا حسن کی ہیبت سے دل کوہِ دو نیم سخت حیرت ہو کہ زندہ رہے کس طرح کلیم
فرض عاشق ہو دم جلوہ کرے جان تسلیم پر تو خور سے ہو شبنم کو فنا کی تعلیم

میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہوئے تاک

ظرف لکھتا ہو تو کربادہ پرستی غافل ورنہ یہ بزم رہے گی نہ یہ بستی غافل
تجھ کو محروم نہ کر دے تری مستی غافل اک نظر بیش بہاں فرصت ہستی غافل

گرمی بزم ہی اک قصہ شر ہوئے تاک

پوچھنے کیا ہو یہ فرما سے کہ کیسا ہی مزاج کل تھی فرصت اسے اندوہ مصیبت سے نہ آج
وہ مرض ہی کہ معالج نہ دوا کا محتاج غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہو سحر ہونے تک

ردیف دل

(۳۴)

یہ بے شعور جب سے ہوئی مبتلائے گل بچھا نہیں ہو اس کی نظر میں سوائے گل
بھولی ہوئی ہو عہدِ قیام و بقائے گل ہو کس قدر ہلاک فریبِ وفائے گل
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
مدت سے یادِ گل میں عناد دل کو تھا شغف اشجارِ برگِ باسے خالی تھے صفت بصف
اب گل سے شاخ شاخ ہوئی جامِ جم بکف آزادی نسیمِ مبارک کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقہٴ دِوامِ ہوائے گل
جوشِ بہار میں کوئی غنچہ اگر کھلا کمتر کسی طرح دل صد چاک سے نہ تھا
سمجھا نہ کوئی خستگی گل کا ماجرا جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا
ای وائے نالہ لبِ خویش نوائے گل

جب پاسبوس کی بھی اجازت مجھے نہ دے
مجرم بنوں لگاؤں جو آنکھوں سے پاؤں کو
کم قسمتی کا اپنی گلہ مجھ کو کیوں نہ ہو
خوش حال اُس حریف یہ مست کا کہ جو
رکھتا ہو مثل سایہ گل سر پہائے گل

گل کو جو دیکھتا ہوں کھٹکتا ہے دل میں غار
اس کے وجود پر ہو مجھے رشک بار بار
کہتا ہوں ہونہ یہ کہیں تیرے گلے کا ہار
ایجا دکرتی ہے اسے تیرے لیے بہار
میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل

دل تکتا گیا ہے غم روزگار سے
خالی ہے ہاتھ سر میں گرانی خار سے
فرحت ہو خاک سیر گل ولالہ زار سے
شرمندہ رکھتے ہیں مجھے باد بہار سے
میناے بے شراب دل بے ہوائے گل

یو باس اس نے حسن میں حاصل ضرور کی
نسیکین کیا ہو اس سے دل نا صبور کی
لیکن وہ بات اس میں کہاں تیرے نور کی
سطوت سے تیرے جلوہ حسنِ غیور کی
خوں ہو مری نگاہ میں نگاہ دائے گل

رکھتا ہے غنچہ دل میں زل سے مرے چپک
نرگس بھی چاہتی ہے ترے نور کی جھلک
سنبل کو کر رہی ہے پریشاں ترنی لٹک
تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا کہ آج ٹک
بے اختیار دوڑے ہو گل در فضاے گل

پھلی ہوس کی بوے دل آویز چارسو
 حاصل ہو جس سے ہر گلِ خدا کو رنگِ بو
 مرزا کو جس کی باغِ جہاں میں ہی جستجو
 غالب مجھے ہو اس سے ہم آغوشی آرزو
 جس کا خیال ہو گلِ جیب قبائے گل

ردیف (ن)

(۴۵)

اب وہ دل اور وہ خیال کہاں وہ تصور وہ ذیکھ بھال کہاں
 وہ خوشی اور وہ ملال کہاں وہ فراق اور وہ وصال کہاں
 وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
 جب تک آزادہ بہاں ہم تھے دید بازی میں ہم نے دن کاٹے
 دل ہواب اور غم ہیں دنیا کے فرصتِ کار و بار شوق کسے
 ذوقِ نظارہ جمال کہاں
 اب نہ دل میں خیال گیسو کا اور نہ آنکھیں ہیں محو شوقِ لقا
 دلولہ مٹ گیا جو دل میں تھا دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا
 شورِ سودائے خط و خال کہاں

کیا کروں گریزِ زمانہ نے وصلے پست کر دیئے دل کے
نرہ وہ سخن کا ذوق سنبھلے تھی وہ اک شخص کے تصور سے

اب وہ رعنائی خیال کہاں

بہہ چکا خون دل میں جتنا تھا کوئی قطرہ جگر میں بھی نہ رہا
ہمنشیں طعن کیا یہ بھبھکو دیا ایسا آسان نہیں ہو رونا

دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

تھے کبھی حاکِ استناء عشق اب نہ وہ ہم نہ وہ زمانہ عشق
جیب پڑ تھی تو تھے یگانہ عشق ہم سے چھوٹا تھا رخاۂ عشق

واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں

جو گردوں اٹھائے جاتا ہوں ٹھوکریں صبح و شام کھاتا ہوں
روزِ ایندا نی اٹھاتا ہوں شکر دنیا میں سر کھانا ہوں

میں کہاں اور یہ وبال کہاں

کہیے مرزا کا حال کیا غالب بے طرح ضعف ہو گیا غالب
ہو یہ پیری بھی کیا بلا غالب مضمحل ہو گئے توئے غالب

وہ عناصر میں اعتدال کہاں

(۳۶)

بھاگتا ہوں دام توڑ کے آفت سید ہوں بیجا نہیں جو سایہ سے اپنے زیدہ ہوں
 ہیبت زدہ ہوں چاشنی غم چشیدہ ہوں ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
 میں دستِ غم میں آہوئے مینا دیدہ ہوں
 کہتے ہیں یوں تو سب مجھے باختیار ہو لیکن خدا گواہ جو کچھ اختیار ہو
 مجبور ہو پھر اسے کیا اختیار ہو ہوں درد مند جبر ہو یا اختیار ہو
 گے نالہ کشیدہ گے اشکِ حلیدہ ہوں

چکے ہوئے غصہ و غم کا مزہ دہن خوش ذائقہ علاوتِ جاں مجھے کیا دہن
 اس درجہ تلخ تھا دمِ آخر مرا دہن جاں لب پر آئی تب بھی نہ شیریں ہوا دہن
 از بسکہ تلخیِ غم ہجراں پیشیدہ ہوں
 بے حس ہوں مثلِ عضوِ معطل پڑا ہوا جنبشِ مجھے ہو ڈرہ برابرِ مجال کیا
 بس لائقِ جزا ہوں نہ مستوجبِ سزا نے سچ سے علاقہ نہ ساعت سے واسطہ
 میں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں

یہ دشمن فرشتہ نہ جن و پری سے لاگ جیواں کی تاک میں نہ کسی آدمی سے لاگ
 بنے سے ہی لگاؤ نہ کچھ غیر ہی سے لاگ ہوں خاکسار پر نہیں مجھ کو کسی سے لاگ

بغزل مروجہ دیوان میں نہیں ہو مصنف کو غالب کے قلم خاص کی لکھی ہوئی اپنے استاد سوزناں سے ملی تھی۔

نے دانہ فاق ہوں زودم چیدہ ہوں

پوچھو نہ ہمد مومری حسرت کی داستاں حراماں نصیب کر کے قضا لائی ہو میاں

انکامیاں نصیب میں نہ ہیں کہ الاماں ظاہر میں میری شکل سے افسوس کے نشاں

خارالم سے دست بدنداں گزیدہ ہوں

سنبھل نے اپنی زلف کے کھوئے نہیں شکنج سبزان بلغ ابھی نہیں گرم دلاں و غنچ

بلغ خیال دل سے مٹائے ہوئے ہو سنج ہوں گرمی نشاط تصور سے منمہ سنج

میں عندلیب گلشن نا آفرین ہوں

مسکن نہ آسماں نہ زمیں ہو مری جگہ کرسی بجاور نہ عرش بریں ہو مری جگہ

میں خود کہیں ہوں اور نہ کہیں ہو مری جگہ ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہو مری جگہ

ہوں میں کلام نغزوئے ناشنیدہ ہوں

ہواک زانہ بر سر کہیں و محالفت دنیا کو ہو عروج میں میرے مزاحمت

پہناں ہو شہتری کی نظر سے مری صفت جو چاہئے نہیں وہ مری قدر و منزلت

میں یوسف بہ قیمت اول خریدہ ہوں

مشراب پو میرے کیوں ہونے کو قال و قیل میں بھی ہوں اپنے رنگ میں بے مثل و بیل

نیکوں نے فرض کر لیا بد مجھ کوئے و سبیل اہل دس کے زمرے میں ہر چند ہوں ذلیل

پر عاصیوں کے فرستے میں میں برگزیدہ ہوں
مرزا ہی سے نہیں ہونا نے کو کچھ حسد میرے لئے بھی بن گئے افسانہ دام و دود
اس طرح کھائے لیتے ہیں جس کی نہیں ہے حد پانی سے ساگ گزیدہ ڈسے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئندہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

(۶۴)

ہم سے برتاؤ برا ہو تو بھلا کہتے ہیں لطف بیجا کو جوان پر ہی بجا کہتے ہیں
کچھ صواب اس نے کیا بھی تو خطاب کہتے ہیں کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جانا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہو کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں
دل پریشان ہر مضمون میں پریشان اپنے ایسی آشفٹ بیانی کو کوئی خاک مٹنے
کہ نہ بیٹھیں کہیں کچھ اور خدا خیر کرے آج ہم اپنی پریشانی خاطر ان سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں
درد و دل خود بھی جو رکھتے تو سمجھتے اس کو درد انگیز ہیں اندوہ فرا ہیں یہ تو
سادگی سے گراں جو یہ کہیں سب سن لو انکے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو می و نسخہ کو اندوہ رہا کہتے ہیں
رات دن رہتی ہی یہاں نزع کی حالت غش سے نالہ کش خاک ہوں ہمتی ہی بری گت غش سے

ب تک آجا ہوتی ہے جو مہلت عش سے دل میں آجائے ہے ہوتی ہے جو فرصت عش سے

اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں

ہیں موجد بخدا شرک ہو دل سے مفقود ہم معبود ہیں نہ کہے کے نہ کعبہ معبود

بقبلہ ہیں تو صرف ایک بہت ہے مقصود ہے پے سرحد ادراک سے اپنا مسجود

قبلہ کو اہل نظر قبلہ بنا کہتے ہیں

یوں تو کانٹوں پہ ہمیشہ ہیں تڑپا ہوا اب محبت کا تری لطف مگر پایا ہے

حالتِ نادر پہ تو نے جو ترس کھایا ہے پائے افکار پہ جب سے تجھے رحم آ یا ہے

خارہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں

سوزِ باطن کا جو کچھ حال ستم گرنے سنا دلنشیں ہونے کو تھا ہی کہ یکایک جھوٹا

ہم نے بھی رنگِ بیاں کو ہم میں اپنے بدلا اک شرِ دل میں ہے اس کوئی گھبرایا کیا

اگ مطلوب ہو ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

کرتے ہم رو و فتح اُس سے تو ہوتا دل تنگ گفتگو کرتے ہوئے رہتا ہے آمادہ بجنگ

ہاں میں ہاں اُس کی ملاتے ہیں تو بھرتی ہو تنگ دیکھیے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ

اس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں

سُن کے یہاں نہ مرزا بھی و دیں شاید جو سخنِ سنج ہیں اس غم کو نہ بھولیں شاید

بزم ماتم ہو پیا بزم سخن میں شاید وحشت و شفتہ اب مرثیہ کہوں شاید
مرگیا غالب آشفتنہ نو کہتے ہیں

(۴۸)

عشق کیا جب شل قمری طوق گردن میں نہیں وہ جنوں کیا پتھروں سے زخم اگر تن میں نہیں
اس کو جنوں کیا کہیں جس کا کہاں بن میں نہیں ابرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں
ہر گر سیاں ننگ پیراں جو دامن میں نہیں

پہلے دامن میں جی گلکاری تھی گاش میں نہیں لطفِ نونبای جو تھا مڑگاں میں ن میں نہیں
دل تزلزل اتو ہو گہائے گردن میں نہیں ضعف سے اے گر یہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اڑ گیا جو خون کہ دامن میں نہیں

چونکہ دیواریں ہوئی تھیں سدراہ آفتاب اس لیے وہ در ہوا ہی سجدہ گاؤ آفتاب
تھی جو زبدیدہ نگاہی اک گناہ آفتاب ہو گئے ہیں جمع اجزاء نگاہ آفتاب
دڑے اس کے گھر کی یواروں کے وزن میں نہیں

دریہ خانہ کا میرے اک وہاں شیرازی موت کے منہ میں اٹھ جینے سے طبیعت سیرازی
دڑے انگریز ہیں زمین خاکِ سیہ کا ڈھیرازی کیا کہوں تارسیکی زندانِ غم اندھیرازی
پہنہ نور صبح سے کم جس کے وزن میں نہیں

اس کو مارا اُس کو زندہ کر دیا اعجاز سے اس کو غم سے کیسا ہل تو اُس کو ناز سے
گھر بنایا اس نے ہر دل میں نئے انداز سے رونق آستی ہو عشقِ خانہ ویراں ساز ہو

انجن بے شمع ہو گر برقِ خرمین میں نہیں

عمر بھریں اس نے لے دیکر فطرتِ سیکھا ہو طعن دیکھئے انصاف سے تو سر بسر بیجا ہو طعن
ہو فطرتِ نا تجربہ کاری کہ یہ کرتا ہو طعن زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جونی کا ہو طعن

غیر سمجھا ہو کہ لذتِ زخمِ سوزن میں نہیں

جیتے جی اُس شکِ گل کے خوب نظر آئے ہوئے مر کے بھی پوئے پوئے ہی رمانِ لے آئے ہوئے
قبر میں پیشِ نظر وہ گل سے رخسار آئے ہوئے بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے آئے ہوئے

جلوہ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

کرنہ درماں چارہ گر مجھ خستہ ورنجور کا ہر مسام اک زخم ہو گا اس تنِ محروم کا
دل کی حالت دیکھ چھا ہو گیا زنبور کا قطرہ قطرہ اک ہیولا ہوئے نئے ناسور کا

خوں بھی ذوقِ درد سے فاریغِ مے تن میں نہیں

کثرتِ دہرِ ہوشیخی پیرِ میخانہ کو ہتی ڈٹ گیا میں رندِ پینے پر تو قلعہ کی کھل گئی
ایک کش میں خم کے خمِ قالی کیے اور بن کی لے گئی ساقی کی نچوٹِ قلزمِ آشامی مری
موجِ مری کی آج رگِ سینا کی گردن میں نہیں

عزم جو آنے کا ہی پھر کو نہ آئے دل سے دوو کیا اُدھیرا پنجہ پیری نے تن کا تار و بود
 نیستی ہی اپنی ہستی اور عدم اپنا وجود ہو فشا رصفت میں کیا نا توانی کی نمود
 قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مے تن میں نہیں
 کس طرح مرزا ہو اس کی یہ خلقت میں قد مال میں جس کا نہ حصہ ہو نہ ہو دولت میں قد
 قد کی حسرت عیش و جبہ قسمت میں قدر تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
 بے تکلف ہوں ہشت خس کہ گلشن میں نہیں

(۴۹)

اب جو مستانہ گھٹا آئے برستی ایک دن آدھل جل کر اٹھا میں لطف ہستی ایک دن
 دیکھ لو گے پنجہ دوں کی تیز دستی ایک دن ہم سے کھل جاؤ بوقت محو پرستی ایک دن
 ورنہ نہ ہم چھڑیں گے رکھ کر غدر مستی ایک دن
 جب گرہ میں ام تھے پیرمناں تھا مہر باں رات دن پیہ پیہ پلانے سے تھی تب فرصت کہاں
 منطقی میں بھی نہ اس جھپکے سے باتی آیاں قرض کی پیٹے تھے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
 رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن
 بے بہا اس دور کی ایک ایک ساعت جانیے اس کی رونق کو نہ کچھ بقدر و قیمت جانیے
 زار ناںی بھی جو ہو تو سار عشرت جانیے نمنہ ہائے غم کہ بھی احوال غنیمت جانیے

بے صدا ہو جائے گا یہ ساریستی ایک دن

زعم و نامانی پر اس درجہ نہ کرنا و اس نہ ہو مثل گل پڑ مرده ہوگا ورنہ یوں خندان ہو
چارون کی رفعت ہو ہم پر نازاں نہ ہو عرقہ اوچ بنائے عالم انکاں نہ ہو

اس بلندی کے نصیبوں میں ہیستی ایک دن

شب سحر محل جو با تھا پائی وہ کرنے لگا کون کہتا ہو کہ غیروں نے لے لے اکسا دیا
اس بُرے برتاؤ میں مرتزا نہیں اس کی خطا دھول دھپا اس ہر اپا ناز کا شیوہ نہ تھا
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب سہیستی ایک دن

۵۰

ظاہر میں گو شفیق نہیں مہرباں نہیں ان کے ہمارے ربط کوئی دریاں نہیں
لیکن خفا بھی ہم سے وہ جان جہاں نہیں ہم پر جفا سے ترک وفا کا لگاں نہیں
اک چھیڑا ہو ورنہ مراد امتحاں نہیں

تم پوچھنے جو آئے تو مجھ پر کرم کیا کچھ بھی اگرچہ رسم عبادت نہ کی ادا
کیا کم ہو یہ نگاہِ ترجم سے دیکھنا کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا
پریش ہوا و پائے سخن دریاں نہیں

ہوتا نہیں وہ رام تو اس کا رم عزیز بڑھتا ہو جس سے شوق نہ ہو کہا ہو کم عزیز

خفگی کا بھی تو شوق کی ہی ہم کو غم عزیز
ہم کو ستم عزیز ستم گر کو ہم عزیز
نا مہرباں نہیں ہو اگر مہرباں نہیں

کیا جانے ذوق جو رو جانا کو عدو سا ہیز
ہم جس سے یاد آتے ہیں ہو ظلم ہی چیز
اس لطف معنوی کی کہاں غیر کو تمیز
ہم کو ستم عزیز ستم گر کو ہم عزیز
نا مہرباں نہیں ہو اگر مہرباں نہیں

کیا بات میں نے کی ہو کہ تم کو بری لگی
حیرت سی نام بوسہ لب سن کے ہو گئی
میں نے کیا سوال تو مجھ سے خطا ہوئی
بوسہ نہیں نہ وہ بھیجی و فٹام ہی اسی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گوداں نہیں

قطرۂ

ہر چند غمے یار میں اک التہاب ہو
ہر چند مجھ کو اس کی حضوری عذاب ہو
ہر چند غیظ و غصہ بوقت خطاب ہو
ہر چند جاں گدازی تہر و عتاب ہو
ہر چند پشت گرمی تاب تو اں نہیں

لیکن جہاں سے رحم و کرم کی امید ہو
جو گشتگوئے تلخ ہی حلوئے عید ہو
اس وقت و انبساط میں شکوہ بعید ہو
جان مطربہ ترانہ ہل من مزید ہو
لب پردہ سنگ زمرۃ الاماں نہیں

صادق اگر عشق تو پھر کیا ہو خوف و بیم کمند زیار گو ہر جاں بھی نہ بن لیم
پیدا وہ درو کر کہ ہو حال جگر سقیم خنجر سے پیر سینہ اگر دل نہو دیم
دل میں پھری چھو جو مرہ تو نچکان نہیں

بے داغ سینہ ہو تو نہ سینہ لے کہو خالی ہو سوز سے تو جگر کو خال دو
مضطر اگر نہو تو سلام ایسی جان کو ہو ننگ سینہ دل اگر آتش کہہ نہو
ہو علو دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

وحشت میں سر کو پھوٹا ہوں کھلے بیچ قباب دیوار و در گریں کہیں ہو کچھ تو انقلاب
دیوانہ ہوں تو کیا مجھے آتا نہیں حساب نقصان نہیں جنوں ہیں لایسے ہو گھر خراب
سو گزین کہ بے بیاباں گراں نہیں

تھا بندگی کا مادہ میری مرثیت میں بیت لہضم میں عمر کٹی یا کشتیت میں
ہوتا تھا اور خاک مرے بختیت میں کہتے ہو کیا لکھا ہو تری سر نوشت میں

گویا جہیں پہ سجدہ بت کا نشان نہیں

ہو حرف گیر اگر ہو زبیاں خاص و عام کی پروا نہیں کسی کے خیالات خام کی
شہرت ملا لیکہ میں بھی ہو میرے نام کی پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگر چہ مرا ہنر باں نہیں

مرزا سوال بوسہ لب کو وہ ہر گھڑی سُن کر جو ملتا ہے تو سو جھی ہے دور کی
جب لب لبائے گاتو خود ہوگا مقتضی جان ہی بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی
غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

(۵۱)

میں جو آوارہ ہوں اس میں مری تصویر نہیں میری تحریر جہیں لایق تصویر نہیں
قابل چارہ مری گردشِ تفتیر نہیں مانع دشتِ فردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہو مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

دل کا اک لولہ ہے جو لپٹے پھرتا ہے کشاں بچو دانتا ہوں کہ اور راہ بھی نظروں سے نہاں
کوئی منزل بھی تو پیدا نہیں جز وہم و گماں شوقِ اسِ شستین ٹوڑے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادو غیر از نگہِ دین تصویر نہیں

جان تو نذر میں جلا دے دی جاتی ہے اس کے خوش کرنے کی تدبیر تو کی جاتی ہے
لیکن اُمید چھا قطع ہوئی جاتی ہے حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے
جادو راہِ رفتِ جزو دم شمشیر نہیں

نہیں ناکامیِ سرِ یاد کی پروا مجھ کو نہ خیالِ آہ کی بربادِ روی کا مجھ کو
ہو نہ پوری نہ سہی ہے تو منتِ مجھ کو رنجِ نومیدی جاوید گوارا مجھ کو

خوش ہوں گر نالہ زبونی کش تا نہیں

خشک ہو زخم تو بے چین دل اپنا ہو جائے جب تک اک زخم نیا اور نہ پیدا ہو جائے
سنگِ طفلان جو نہ کھاؤں مجھے سوا ہو جائے سر کھجاتا ہی جہاں زخم سرا چھا ہو جائے

لذتِ سنگ باندازہ قسیر نہیں

کر لیا عفو کا جب وعدہ راسخ اس نے کون شرمندہ ہو پھر شرم گنہگاری سے
نفس کہتا ہے کہ لے خوب گناہوں کے منے جب کرمِ نصرتِ بیباکی و گستاخی سے

کوئی تقصیرِ جہنمِ غلت تقصیر نہیں

وہ بھی مہرِ زاسا جریدہ ہو بقول ناسخ صاحبِ اوصافِ حمیدہ ہی بقول ناسخ
ہند میں شاعرِ حمیدہ ہی بقول ناسخ غالب اپنا یہ عقیدہ ہی بقول ناسخ

آپ بے بہرہ ہی جو معتد تیر نہیں

تری رہ گزریں جو ہم دیکھتے ہیں فضا ایسی جنت میں کم دیکھتے ہیں
گل و لالہ ہر جا بہم دیکھتے ہیں جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

ہوئے ہم جو مشتاق اس کے سخن کے یہ آثار گویا ہیں دیوانہ پن کے

دہن ہی نہیں اس بتِ سحر فن کے دل آشفٹ کساں خالی کنجِ دہن کے
 سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں
 ترے قدموزوں نے پایا وہ عالم عجیب کیا قیامت کرے خیر مقدم
 جو تو ہوسہ اماں تو محشرِ مسلم ترے سروِ قامت سے اک قد آدم
 قیامت کے گفتے کو کم دیکھتے ہیں
 جو ہی حیرتِ آئینہ تجھ کو پیاری تو اس سے بھی بڑھ کر ہی حیرت ہماری
 فقط اک نگہ کی ہی اُمید واری تماشا کر ای محوِ آئینہ داری
 تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں
 رہے ہجر میں رات بھر گرم نالے گئے قافلے جانبِ عرش ان کے
 نہ ہوتا نشان تو نشان بھی نہ پاتے سراغِ توف نالہ لے داغِ دل سے
 کہ شبر و کافکش قدم دیکھتے ہیں
 نہیں رکھتے مرزا کسی سے مطالب نہ دل جانبِ عیش دنیا ہو راغب
 تمنا سے زرا ہو نہ دولت کے طالب بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
 تماشا سے اہل کرم دیکھتے ہیں

(۵۲)

جلتا ہوں ان کی گرمی تہر و عتاب میں کیونکر مرے نہ پاؤں عذاب عتاب میں
پہچھو نہ مجھ سے گرمی دوزخ کے باب میں مٹی ہی خوشے یا رستے نار الہتاب میں

کافر ہوں گر نہ مٹی ہو لذت عذاب میں

آیا ہوں درد و غم کے لیے انتخاب میں دن زندگی کے کاٹا ہا ہوں عذاب میں
ہوں عرصہ دراز سے اس پیچ و تاب میں کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں
شہائے ہجر کو بھی رکھوں گہ حساب میں

کیا کہیے ہوتی تھی شب غم کس طرح بسر اختر شمار یوں ہی میں ہو جاتی تھی سحر
ٹوڑا ستم یہ اور نیا چشم شوق پر آپھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر

آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

آنکھوں میں ہیشتری نہ تھا نیند کا گزر کرتا تھا صبح ہجر میں سر پٹ پیٹ کر
غفلت جو روتے بٹتے ہوئی شب کسی قد آپھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر

آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

لکھ تو دیا انھیں کہ مرا مال ہی زبوں ہواں سے آرزوئے تسلی ترا جب سوں
آگاہ آن کی عادت خصلت سے خوب ہیں قاصد کے آتے آتے خطا ک اور لکھ رکھوں

رہتے تھے ہم پرالہ جہاں اُسے خاص و عام
پینے میں آج تجھ کو نہو کس طرف کلام
اُٹھتا تھا ایسی بزم سے میں روز نشہ کام
مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا درجام

ساقی نے کچھ ملانہ دیا ہو شراب میں

آنکھیں بھی اہ میں جو بچھاتا ہوا چلے
چالیں ہزار بار سے یہ پُر دغا چلے
ملن نہیں کہ مکر و نموں غیر کا چلے
جو منکر و وفا ہو فریب اس پہ کیا چلے

کیوں بد گمان ہوں دست دشمن کے باب میں

دشمن کاٹھے تو یہ ہے کہ دشمن نہ آ کرے
تم ہنستے ہنستے ہو گئے خاموش کس سیئے
جاتے ہوئے تھیں مے گھر سے نہ دیکھ لے
میں مضطرب ہوں صل میں خوفِ قیام سے

ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

وہ آج میرے گھر جو چلے آئے مست و
جاتے ہوئے وصال کا وعدہ بھی کر گئے
شکر خدا کہ ہو گئے قصے تمام ٹو
میں اور خط و صل خدا ساز بات ہو

جاں نذر دیتی بھول گیا اضطراب میں

شاہ پرہہ کچھ اثر ہیں نمایاں عتاب کے
اتار بات بات میں ہیں پیچ و تاب کے
لیکن ہیں چُپ خیال سے شرم و حجاب کے
ہو تو رسی چڑھی ہوئی اندر نقاب کے

ہو اک شکن پڑی ہوئی طرف نقاب میں

آتا ہیوں تو ان کو لڑانا لگا ہ کا نظریں بچا کے سب کی ملا نا لگا ہ کا
آفت ہوا نہ مگر نہ اٹھانا لگا ہ کا لاکھوں لگاؤ ایک چرانا لگا ہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

وہ نالہ جو کہ عرشِ معلیٰ کو بھی ہلائے وہ نالہ جو زمین کو بھی زلزلے میں لائے
وہ نالہ اور کان تک اس شوخ کے بچائے وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالہ سے شکاف پڑے آفتاب میں

جادو وہ چیز ہے کہ جو اس کو عمل میں لائے مشکل سے مشکل امر کو آسان کر دکھائے
لیکن مجھے یہی تو ہوا فوس ہائے وہ سحرِ مدِ طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سینہ رواں ہو سرب میں

تھے یاد ہم پیالہ ہمارے سبھی کبھی دیکھا نہ ہم نے ہوش میں قرڑا کو بھی کبھی
وہ دن کہاں کہ شغل سے فرصت نہ تھی کبھی غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ برابر و شبِ ماہِ شباب میں

۵۳

جامِ سب کو رکھ نہ بچا کر سحاب میں شامل نہ کر جموجی کو شب کے سحاب میں
دہاں کچھ کمی نہیں کہ ہو تو منظر اب میں کل کے لیے کراچ نہ خست شراب میں

یہ سوئے ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں

یا تو ملائکہ سے بھی تھا مرتبہ بلند ہم سا نہیں ہی یا کوئی اب غوار و مستند

پہونچا رہا ہے ہر شمس ہمیں گز ند ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند

گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

انرا کیوں یہ دوح کا قالب سے انزع کیوں بھٹکے کہ ب سانس کا ہوتا ہے نقطاع

سننے سے اس کے کہتے پہنچ پہنچ الوداع جان کیوں نکلنے لگتی ہی تن سے دم سماع

گر وہ صدا سمانی ہے چنگ و رہا ب میں

کہتے ہیں صاف صاف یہ انداز چال کے لینا نہیں عدم سے ادھر دم کہیں اسے

بے اختیار ہوں کہیں مجھ کو گرا نہ دے رو میں ہی رخش عمر کہاں دیکھیے تھمتے

وئی ہاتھ باگ پر ہی نہ پا ہی رکاب میں

کی لاکھ فکر ہستی آشنا میں پڑی پڑی قصہ ہوا نہ ان کے وجود و عدم کا طو

حیرت میں مبتلا ہوں کہ میں بھی ہوں طرفہ شیرو اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بعد ہی

جتنا کہ دہم غیر سے ہوں بیچ و تاب میں

ایسا دیکھا کہ موجود و موجود ایک ہی سب مہبودوں میں عابد و مہبود ایک ہی

کیا ذکر سجدہ سجد و مسجود ایک ہی اصل شہود و شاہد و مشہود و ایک ہی

حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہو کس حساب میں

موج و حباب میں ہی مقررہ وجود بحر
ان کا وجود بھی ہو سرا سر وجود بحر
کہیے انہیں عرض تو ہی جو ہر وجود بحر
ہو مثل نمود صوہ پر وجود بحر

یاں کیا دھرا ہو قطرہ و موج و حباب میں

جیتے ہیں تانہ سن سے ہم کو ہو آگہی
ہر ہروں کے واسطے سامان گمراہی
جب پھپھکے نہ ذات پرفے کی کیا رہی
شرم اک اٹلے ناز ہو اپنے ہی سے ہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

گو خود نما نہیں ہو وہ پردہ نشیں ہنوز
نظارگی نہیں کوئی اس کا کہیں ہنوز
ہو مجرناز خود بھی وہ ناز آفریں ہنوز
ارایشِ جمال سے فالغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہو آئینہ دائم نقاب میں

اشیاء کی ہو تصور اشیا سے سب نمود
دیکھا جو غور سے تو خیالی ہیں سب وجود
ہستی کی واسطے کی بدولت ہو ہستی بود
ہو غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے میں غائب ہیں

مرزا کو ایک عمر سے ہو جستجوئے دوست
کچھ آرزو نہیں ہو بجز آرزوئے دوست
انکبیں ہیں سمنشیں کی طرف لہو سودست
غالب ہم دوست آتی ہو بے دوست

مشغول حق ہوں بندگی بو تراب میں

(۵۵)

کس طرح روکوں گریہ شام و سحر کو میں رونے میں رونہ بیٹھوں کہیں چشم تر کو میں
کس کس کے بیخ و غم میں کھپاؤں گا سر کو میں جیساں ہوں ل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

مانا نہ دل سے تیرا پتہ دشمنوں کو دوں آگاہ تیرے نام سے اغیار کو کروں
آوارہ و خراب تری جستجو میں ہوں چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

جس راہ میں قدم کا بھی لکھنا تھا تنگ عار طحسیر کے بل کیا اُسے اللہ رے اضطراب
دم بھر کو بھی تو دل نے نہ لینے دیا قرار جانا پڑا قریب کے در پر ہزار بار
اچھی کا شس جانتا نہ تری رہ گزر کو میں

آمان میرے قتل کو کس زعم پر ہوئے انجان تم نے جان لیا جان من مجھے
دہلی میں تو وہ آئے نہ معلوم ہو جسے ہی کیا جو کسکے باندھو گے میری بلاؤں سے
کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں

میں جانتا تھا مجھ کو فقط ان سے کام ہے الفت ہو ماسول سے تو سودائے غلام ہے

اُس پر بھی ہے یہ قدر تو میرا سلام ہو لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے شک و نام ہو
یہ جانتا اگر تو سلطانہ گھر کو میں !

کرتا ہوں تنو قدم بھی اگر تو ہو کے ساتھ یعنی ہر اک قدم پہ ہوں کھنڈر کے ساتھ
آہستہ رو کے ساتھ کبھی تیر رو کے ساتھ چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

ہر جذبہ کدوں ہی میں سب عمر دی گزرا لیکن خدا گواہ کہ ایماں ہے ہر قرار
ہاں شوق دید کا تو ہوں بیشک گناہگار خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوچھتا ہوں اُس بت پیدا کر کو میں

پھر گم ہوا تلاش میں اس کی میں دلفگار ہوش و حواس پر نہ رہا پھر کچھ اختیار
پھر سعی و جستجو کا جنوں سر پہ ہے سوار پھر بیخودی میں بھول گیا راہ کوئے یار
جاتا دگر نہ ایک دن اپنی خیر کو میں

پرساں حال کوئی ہنسر کا نہیں ہا باقی جہاں میں قدر ہنر و نہیں ذرا
مجھ کو یہ زعم اب بھی ہیں گاہک ہزار ہا اپنے پہ کمر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا
سمجھا ہوں دلپذیر متاع ہنر کو میں

مرزا میری دعا بھی ہے ہر بصد نیاز دیکھوں جال یار میں ای رب کار ساز

جس طرح پہلے کہہ گیا ہو اک سخن طراز غالب خدا کرے کہ سوار سمنڈ ناز
دیکھوں عسلی بہادر عالی گہر کو میں

۵۶

کون کہتا ہو خفا مجھ سے وہ مغرور نہیں کینہ و بعض جو مجھ سے ہو وہ مستور نہیں
لے سکے نام مرا کوئی یہ عقدر نہیں ذکر میرا بہ بدی بھی لے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ وہ نہ نہیں

بہد اک عمر کے بیدار ہو طالع شوق خوش نصیبی ہو کہ چکا تو ذرا طالع شوق
آج تو بہ سربازی ہو مرا طالع شوق وعدہ سیر گلستاں ہو خوشا طالع شوق
مردہ قتل مقتدر ہو جو مذکور نہیں

ہو فقط نقطہ موہوم اگر ہو عالم دہن اس شوخ دل آرا کا مگر ہو عالم
وہم ہی وہم ہو گو پیش نظر ہو عالم شاہد ہستی مطلق کی مگر ہو عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہو پرا ہمیں منظور نہیں

غور سے دیکھ اگر رکھتا ہو چشم باطن تجھ پہ کھل جائے گا یہ عقدہ مشکل اک دن
جزو ہو کل سے جدا یہ نہیں ہرگز ممکن فطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہو وہ یاسین
ہم کو تقلید تناک طرفی منصوبہ نہیں

وائے ناکامی اُمید کہ ہمت نہ ہی بار غم جس سے اٹھائے تھے وہ قدر نہ ہی
چسدرول کا ہوا ہست وہ جرات نہ ہی حسرت اذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ ہی
عشق پر پردہ کے گوں تن رہجو رہیں

ہنسکے کہتے ہیں گئے آپ اگر جنت میں ہونگے غلمان ہی غلمان دہان یا حوریں
کچھ تعجب نہیں جو آپ وہاں جو رہی لیں میں جو کہتا ہوں کہ ہم لینگے قیامت میں تمہیں
کس لعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم جو نہیں

یہ تو ممکن نہیں تو دل سے مجھے بھولا ہو ہاں جو اغماض سے لے کام تو چارہ کیا
کچھ بہانہ بھی رہے یاد کا تو اچھا ہو ظلم کر ظلم اگر لطافت دریغ آتا ہو
تو تغافل سے کسی رنگ میں معذوری نہیں

ای خوش از ہم طرب جس میں بہم ہیں ہم لوگ دافعِ سنج و اطم و دشمن غم ہیں ہم لوگ
آن تک اہر و نقش قدم ہیں ہم لوگ صاف دردی کش پیمانہ جم ہیں ہم لوگ
وائے وہ بادہ کہ افشردہ انگو رہیں

ہو فدا ہی مرے نکم توں کا فدا فی غالب میری حکمت کا ثنا گر ہو شنائی غالب
پوچھو مرزا سے مری نعمہ سرا ہی غالب ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب
میر کے دعوے کو یہ حجت ہو کہ مشہور نہیں

(۵۷)

قابلِ رجزِ فنانِ دلِ ناسا دہیں آہِ وزاری یہ مری لایتِ ایرادہیں
 ہو فقط یادِ وہانی کوئی فریادہیں نالہ جزِ حسنِ طلبِ اسوِ ستمِ ایجا دہیں
 ہو تقاضا، جفا شکوہِ بیدادہیں

ماشتوں کو نہیں محبوب سے جاں بھی محبوب ہاں سمجھتے ہیں صبا جوئی دشمنِ معیوب
 نگہِ عشاقِ مخافرا د کا بیجا اسلوب عشق و مزدوری عشرتِ گمِ خسرو کیا خوب
 ہم کو تسلیم نہ کو نامی فرما دہیں

کتنی تھی خانہ نشینی تگ و دو سے محروم اب کا وٹ دیمِ حشمتِ ہونہ دل ہو مغموم
 گویا ہاں میں ہو آبادیِ رونقِ معدوم کم نہیں وہ بھی خرابی میں یہ وسعتِ معلوم
 دشت میں ہو مجھے وہ عیشِ گھرا دہیں

ہر تغیر سے زمانہ کے ہو عبرتِ مطلب دور اس کا سبق آموزیِ عالم کا سبب
 یہ موزب وہ ہو جو خوب سکھاتا ہوا دہ اہلِ بینش کو ہو طوفانِ حولتِ کتب
 نظر موجِ کم از سیلی استا دہیں

کس خوشی سے تو تھبلا کیے ہم جو رو جفا آہ و نالہ کو کیا ضبطِ سمجھ کر شکوہ
 پھر بھی سمجھا نہ ستم گار نے پا بندِ رضا وائے محرومیِ تسلیم و بدا حالِ وفا

جاننا ہی کہ ہمیں طاقت فرما نہیں

آشیانے سے قدم اب تو خال اپنا کہیں
اب نہیں ہو وہ زمانہ کہ ہے گوشہ نشین
شکر کرا ج کوئی دام نہیں فرشتہ میں
سبد گل کے تلے بند کرے ہی گلپیں

مژدہ ای مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں

دل کے لینے کو تو ہر دم تھا تقاضا لا لا
بوسہ مانگا تو بہ تکرار یہ بولا لا لا
تھا تو ممدوم دہن لانے معما کھولا
نفی سے کہتی ہی اثبات تراوش گویا

دی ہی جائے دہن اس کو دم ایجا نہیں

شبم اس عشرت گلزار پہ گریاں کیوں ہی
دیدہ نرگس حیرت زدہ حیراں کیوں ہی
منقبض غنچہ گل وقت بہاراں کیوں ہی
دیدہ نرگس حیرت زدہ حیراں کیوں ہی

گرچہ چراغان سرورہ گزر باد نہیں

تم اگر بھول گئے اپنی حکایت غالب
مسنو مرزا سے وہ پرورد روایت غالب
ہو گئی سہو کی یہ کیا تھیں عادت غالب
کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب

تم کو بے مہری یاران وطن یاد نہیں



مرے عقایدِ راسخ میں کچھ فساد نہیں
خدا نخواستہ میں منکرِ معاد نہیں

خوب گل چھترے اڑا کوئی مرزا ہی نہیں

غلط کہ یا مجھے طویل روزداد نہیں نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں

شب فراق سے روز جزا زیاد نہیں

یہ بات ساقی ہوش نے کیا بنائی ہے کہ ہو نہ ابر تو پینے میں کیا برائی ہے

ایسے کیا اسی صورت سے پی پلائی ہے کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا برائی ہے

بلا سے آج اگر دن کو ابر باد نہیں

کون رقیب برائی بھی تو بُرا نہ کہیں بھلائی لاکھ ہو مجھ سے مگر بھلا نہ کہیں

کجی زباں سے کوئی کلمہ خیر کا نہ کہیں جو آؤں سامنے ان کے تو مرجھا نہ کہیں

جو جاؤں پاس سے ان کے تو خیر باد نہیں

دل و جگر غم و انداے رشک بہتے ہیں سرشکِ خونِ جگر چشمِ نر سے بہتے ہیں

عدو کے ساتھ وہ مصروفِ عیش رہتے ہیں کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں

کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

کھلا ہی رہتا ہے آنکھوں پہرِ فیض کا باب اس آستانے سے ملتا نہیں کسی کو جواب

جو صرفِ راہِ خدا ہو نہیں کچھ اُس کا حساب علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب

گداے کو چہ میخانہ نامراد نہیں

ایسے جہان میں ہم مبتلاے رنجِ مدام کھلی جو آنکھ تو دیکھا نہ جز غم و آلام

سنا نہیں بھی ہم نے سرورِ عشق کا نام جہاں میں ہوں غم و شادی بہم ہیں کیا کام
 دیا ہی ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں
 اک لہاس تو مرزا کی بھی سُنو غالب کرو وہ بات نتیجہ بھی جس کا ہو غالب
 خیف ہو گئے یہ چھیڑاں سے چھوڑو غالب تم اُن کے عیسے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب
 یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

(۵۹)

روزِ مضمون نیا باندھتے ہیں روزِ مرہ بھی جدا باندھتے ہیں
 تجھ کو ہم برقِ ادا باندھتے ہیں تیرے تون کو صبا باندھتے ہیں
 ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں
 نالہ دل کی حقیقت کیا ہے کامیاب اس سے کوئی ہوتا ہے
 چھیڑنا اس کو فقط منشا ہے اہ کا کس نے اثر دیکھا ہے
 ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں
 تجھ کو وہ چال ہے حاصلِ عمر دم میں طی کرتی ہے منزلِ عمر
 تیری رفتار ہے کاملِ عمر تیری فرصت کے مقابلِ عمر
 برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں

بند کا جبکہ ہی بندہ مفہوم مرگ کی پھر ہی توقع موہوم
کیوں رہیں شوقِ اجل میں مفہوم قید ہستی سے رہائی معلوم
اشک کو بے سرو پا باندھتے ہیں

سر میں لکھتا ہی نہ یہ نشہ مل نہ اسے نازشِ عشقِ بلبل
ناز ہو حسن پر اپنے باکل نشہ رنگ سے ہو واشدِ گل
مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

ان کی بندش کو سخنِ صیت پوچھ کس طرح لیتے ہیں تحسینِ مت پوچھ
شعرا کی غلط آئیں مت پوچھ غلطیہائے مضامین مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

مجھ سے وحشی کا کیا کیا درماں ڈال دی پاؤں میں گیا جولاں
چارہ گر لینے ہیں کتنے ناداں اہل تدبیر کی واماندہ گیاں
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

تھے وہ مرزا ہی سے پہاں غالب ہم سے دھوکا نہیں آساں غالب
ہم کو سمجھا کوئی ناداں غالب سادہ پرکار ہیں خواہاں غالب
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

(۶۰)

جب تیری خاک سہ کی برابر نہیں ہوں میں کیا شکوہ سنج جو رعت در نہیں ہوں میں

رہتے میں سنگ در کا بھی ہمسر نہیں ہوں میں داہم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں

خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

ہو جائے مضطرب تو نہیں کچھ خطائے دل انصاف شرط ہو کبھی راحت بھی پائے دل

دن رات جو چرخ کہاں تک اٹھائے دل کیوں گردشِ مدام سے گھبرانہ جائے دل

انسان ہوں پیالہ وس غر نہیں ہوں میں

بیچارہ کیوں سمجھتے ہیں اہل جہاں مجھے نقصان کیا کسی کو ہو میرے وجود سے

سہواً ظلم نہیں ہوں کہ معنی بدل گئے یارب مجھے زمانہ ٹٹاتا ہو کس لئے

لوح جہاں پہ حرف مکر نہیں ہوں میں

تجویزِ قتل مجرمِ الفت کے واسطے ہو سنگ مدعیِ عدالت کے واسطے

یہ جو ر و ظلم اہلِ محبت کے واسطے حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے

آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

حضرت حقیر جانتے ہیں کس لئے مجھے بے آبرو کیا مری تقدیر نے مجھے

نسبت نہیں ہو کوئی جادات سے مجھے کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے

لعل و زمر و زرد و گوہر نہیں ہیں

اجرام چرخ بھی تو نہ محروم ہوں درین
اور مجھ سے آج کٹا وہی جوں کا توں دین
بندہ نواز کس لیے آخر ایویں درین
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں کیوں دین
رُبتے ہیں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہیں

گردوں نے بوسے پاؤں کے کس شوق سے لیے
سر پر قدم تھا لے زمین تک نہ لے گئے
یہ بوسہ ٹوک ہی تو فقط ہی مرے لیے
کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کے لیے

کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

مرزا کی طرح شغل تمھیں بھی کوئی نہ تھا
بیکار بیٹھے بیٹھے زمانہ گزرتا گیا
خواہیدہ نخت شکمہ ای بیدار تو ہوا
غالب نے طیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے تو کہ نہیں ہیں میں

۶۱

تھیں کبھی زلفیں جو زیب سنبلستاں ہو گئیں
خار بن کر جلوہ گر دلہ وزیر گھاں ہو گئیں
شکل زکس چشمہائے شوخ و فتاں ہو گئیں
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پہاں ہو گئیں
آہ ای عہد جوانی وہ اُمٹیں اب کہاں
تو ہی جب نصرت ہوا پھر کیا ہی عمر جاوے

دلوئے ہی دل میں تھے کچھ اور جسکے تھے جواں
یاد تھیں ہم کو بھی لکھا رنگ بزم آرائیاں

لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

ہو گیا ہر چند پہلو سے جدا تختِ جگر
دکھتی آنکھوں ہوا گم ایک سبک نورِ نذر

دیدہ بے نور واقعے شوق سے آنکھوں پہر
قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر

لیکن آنکھیں روزِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

سیکڑوں قربانی رشکِ قنابت مر گئے
ہیں زبانِ خلق بہرِ دن رات جن کے تذکرے

غیر کا نظارگی ہونا نہ چاہا عشق نے
سب رقیبوں سے ہیں مخلصینِ زمانِ مصر سے

ہو زلیخا خوش کہ مچو ماہِ کنساں ہو گئیں

ہم کو یہ سمجھے ہوئے ہیں اس قدر بے ننگ نام
ننگِ ہر ان کیلئے ہم ہوں گراں کے غلام

خیر اگر چاہا خدا نے پھر تو بن جائے گا کام
ان پر نیرادوں سے لینگے حنکد میں ہم انتقام

قدستِ حق سے یہی عوریں گرواں ہو گئیں

دل میں تو بیشک اُترتی ہیں یہ پھریاں بارِ بار
اُن واحد کیلئے لیکن نہیں ان کو قرار

تیرن کر آ رہی ہیں جا رہی ہیں برقِ وار
وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یہ لکے پا

جو مری کو تا ہی قسمت سے نرگاں ہو گئیں

دیدہ ہوا ذنِ رباں نے تو کھا کر پیچ و تاب
کم ہوا منتِ حاجتِ مری اس کا عتاب

ہو گیا ہی سہل گو خصل میں ہونا یا ریا ب
واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یا دھتھیں جتنی دعائیں صرف رباں ہو گئیں

کام اچھا دے گیا صبر و سکون انجام کار
ورنہ پہنچی تھی یہ نوبت پیر ہن ہوتا رہا
دل فٹاں کرنا تو پھر ہاتھوں کو کیوں ہوتا قرار
بسکہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں بار بار
میری آہیں بخیہ چاک گریباں ہو گئیں

یکدم میں تشنہ بجور نہ نا کام آگیا
چشتہ آب بقا تک وہ مو آ شام آگیا
جی گیا جو شستہ شمشیرِ لام آگیا
جاں فزا ہی یادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں

اپنے نصب العین ہیں جملہ مذاہب بالعموم
نقش ہیں دل پر تمام ان کے قوانین و علوم
ایسے ہیں اپنی نظر میں لکھتے ہوں سب کی حدیم
ہم موحہ ہیں ہمارا کیش ہو ترک رسوم
ملتیں جیب مٹ گئیں اجزاء ایماں ہو گئیں

ابتدا میں تو بہت کچھ دل کو ترپاتا ہو رنج
غزوہ کی جان کو آٹھوں پر کھاتا ہو رنج
ضبط و اعتدال سے آخر بے تنگ آتا ہو رنج
رنج سے جو گر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہو رنج
مشکلیں چھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

دو تاروں نے کامیرے کیوں اڑاتے ہو مذاق
یہ لہو روٹا بھی ہو آنکھوں کا حسن اتفاق

روح کلام غالب
۱۱۳
ہو گیا ہی سہل گو خصل میں ہونا یا ریا ب
واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یا دھتھیں جتنی دعائیں صرف رباں ہو گئیں
کام اچھا دے گیا صبر و سکون انجام کار
ورنہ پہنچی تھی یہ نوبت پیر ہن ہوتا رہا
دل فٹاں کرنا تو پھر ہاتھوں کو کیوں ہوتا قرار
بسکہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں بار بار
میری آہیں بخیہ چاک گریباں ہو گئیں
یکدم میں تشنہ بجور نہ نا کام آگیا
چشتہ آب بقا تک وہ مو آ شام آگیا
جی گیا جو شستہ شمشیرِ لام آگیا
جاں فزا ہی یادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں
اپنے نصب العین ہیں جملہ مذاہب بالعموم
نقش ہیں دل پر تمام ان کے قوانین و علوم
ایسے ہیں اپنی نظر میں لکھتے ہوں سب کی حدیم
ہم موحہ ہیں ہمارا کیش ہو ترک رسوم
ملتیں جیب مٹ گئیں اجزاء ایماں ہو گئیں
ابتدا میں تو بہت کچھ دل کو ترپاتا ہو رنج
غزوہ کی جان کو آٹھوں پر کھاتا ہو رنج
ضبط و اعتدال سے آخر بے تنگ آتا ہو رنج
رنج سے جو گر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہو رنج
مشکلیں چھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں
دو تاروں نے کامیرے کیوں اڑاتے ہو مذاق
یہ لہو روٹا بھی ہو آنکھوں کا حسن اتفاق

ہو شبِ ہجران کی تاریکی زیادہ دلکشانک
اشکِ خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہر نام فرتا
میں یہ سمجھو نگاہِ دو سمجھیں فروزاں ہو گئیں

بزم میں جو ہمیشہ تیرا ہی راہیں اس کی ہیں
صبحِ نظر نہ پس کہ دیتا ہو راہیں اس کی ہیں
اس سے بھی خوش نصیب ہے ہزاراں اس کی ہیں
نیناس کی ہو دماغ اس کا ہو تپس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پلٹیاں گئیں

اگر غضب کا یہ طوفان خیز دانا لاماں
اس کی آنکھوں نے تو باندھا ابرو بار لکھاں
کو پیئے اس نے بھی مرزا کی طرح دیرا رواں
یوں ہی گزرتا رہا غالب ای اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو نظم کہ ویراں ہو گئیں

(۹۲)

دشتِ ہر اور طاقت رفتا رہی نہیں
دامنِ بقدرِ خلعتِ یکِ ظاہر بھی نہیں
ہمساجنوں زوہ کوئی نادر بھی نہیں
دیوانگی سے دوش پہ زنا رہی نہیں

یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

ہو کر غریب در طہ حیرماں ابھر چکے
یہ یاس جیتے جی ہی تو سمجھو کہ مر چکے
دن اپنے جبکہ شوقِ لقائیں گزر چکے
دل کو نباہ کر حسرت دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقت دیدار بھی نہیں

ملنے ہیں تجھ سے کہنے ہیں جو سر سے اہ طو
البتہ تجھ کو پا نہیں سکتے ہیں سست چڑی
لمن کبھی ہوئی نہیں کوئی محال شو
ملنا تیرا اگر نہیں آساں تو سہل ہو
دشوار تو یہی ہو کہ دشوار بھی نہیں

میں اک نحیف نزار ہوں بے طاقت توان
اس پر یہ دل کے ولولے یشوق جاں تل
حیرت یہ کہہ ہی ہو کہ اب چاہیے کہاں
بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہو اور یاں
طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں

سودائے سرا ہو چہ پراگندگی ہوش
وحشت ابھارتی ہو کہ کرنا لہ و خروش
گراؤں بائے کس سے کہ جائے جنوں کا ہوش
شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہو وبال دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

دشمن ہی کچھ عناد کو سمجھا کریں شرف
پھر نے بھی ہو جو پھٹتے ہیں دن رات سرکف
لیکن میں جو بنفٹ ہو کچھ بھی تو لو حلف
گنجائش عداوت اغیار یک طرف

یاں دل میں صفت سے ہوں یا رہی نہیں

زیاد میں جو میں نے ہادی کبھی زبان
قائم نہ پھر نہ میں رہے گی نہ آسمان
آسان میری آہ جہاں سوز کو نہ جان
ڈرنا لہائے نزار سے میرے خدا کو مان

آخر فدائے مرغ گرفتار بھی نہیں

ہو زخم زار سینہ کو پیکاں سے روکشی دھجی جگر کو خنجر بہاں سے روکشی
کرتا ہو اس کا تیر نظر جاں سے روکشی دل میں ہر یاد کی صفِ ترگاں سے روکشی
حالانکہ طاقتِ خلش غار بھی نہیں

لیتے ہیں کامِ اداؤں سے آلاتِ حرب کا خنجر کی اور تیر کی حاجت نہیں ذرا
کرتے ہیں خونِ خلق بہتے ہیں وہ تو کیا اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اور خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

مرزا جو بادشاہ تھا تسلیمِ شعر کا جس کا ہو ملکِ نظم میں جھنڈا اگر اہوا
فرزانہ کوئی ہو گا یہ غالب گمان تھا دیکھا استاد کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہو تو ہوشیار بھی نہیں

۶۴

روؤ گس طرح شک ہو بھلا تیرے ٹہری پن میں کہ بیٹھا ہو رو کرے مرنے نٹوں کو دامن میں
کچھ لیتا جو ہوتی تجھ کو کچھ بھی آنکھ اس فن میں نہیں ہو زخم کوئی نہ خیمے کے زورِ مے تن میں
ہوا ہوتا را شبکیں مستہ چشمِ سوزن میں

دمِ نظارہ دیوار و در ہوں وقفِ حیرانی کہ اچھا رنگائی اشکِ چشمِ ترکی طغیانی
ان آنکھوں کی بدست بھر گیا امید پر پانی ہوئی ہر مائعِ ذوق تماشا خانہ ویرانی

کعب سید اب باقی ہو رنگِ پنیہ و زن میں

کبھی ابرو کے سر صدف میں قف تیغ برآں ہوں کبھی ترچھی نگاہوں سے جراحتِ خوارِ پیمائیں ہوں
دورِ سوزِ غم سے جلوہ گاہِ داغِ پیناں ہوں و دیوت خانہ بیداد کا و شہائے مرگاں ہوں

لیکن نامِ شاہدِ ہر مرابہ قطرہ خوں تن میں

نہ چھو کیا بلا ہو تیرگی شہائے ہجراں کی چمکے سے کی ہوں میں مہرِ درخشاں کی
سیاہی مات ہو تختِ سیمہ کی فردِ عصیاں کی بیاں کس سے ظلمتِ گستری میرے شیشےاں کی

شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنیہ دیو اولیٰ درن میں

ہنسی یاروں نے کیا کی کس نصیحت بھگو فرمائی نہ اب ہوش و حشمت ہے نہ فرطِ ناشکیبائی
سکوں سا ہو گیا دل کو گیا سامانِ رسوائی نکو ہوش مانے بے رطبی شورِ جنوں آئی

ہوا ہو خندہ اجابِ بخیہ چیشہ امن میں

نہے تقدیرِ آئینہ کہ یہ ہو سامنے اُس کے کہاں پہنچا دیا شانِ خدا اس کے مقدر نے
ہجرت ہو ضیاءِ پانی ہو کیا اُس کی تجلی سے ہوئے اُس روش کے جلوہ مثال کے اُس کے

پرافشاں جو ہر آئینہ میں مثلِ تہِ درن میں

کردوں کیا ہمیشہوں سے مری حالتِ مخالف ہو مرادِ مہبِ جد اس کے مری ملتِ مخالف ہو
نکھے ڈالا ہوا ہمنسوں میں کیا قیمتِ مخالف ہو نجانوں نیکوں سے ہر ہوں پر صحبتِ مخالف ہو

جو گل ہوں تو ہوں گلشنِ بخشش ہوں گلشنِ بخشش میں

مقامِ شکوہ کیا؟ درد اگر لاکھوں دے مجھ کو ذرا پیسے بھی تو بخشے درد کی برداشت کے ٹھکڑے
سبکدوشی نہو گی اس کے احسانات سے مجھ کو ہزاروں دل دے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو

سید ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

خیالِ گیسو سے پرہیز میں پابندِ جواں ہوں بتوں کے دم میں پابن ہوں اک سیدِ مسلمان میں
اداپران کی سرز آئی طرح کیونکر نہ قریاں ہوں اسدِ زندانیِ تاثیر الفت ٹٹے خواہاں ہوں
نہم و سستِ فرائض ہو گیا ہر طوق گردن میں

۶۴

طمانیتِ دلِ اربابِ زمینِ خاک نہیں خیالِ زر کے سوا اور سر میں خاک نہیں
چمورپن ہو یہاں اور گھر میں خاک نہیں مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر سو جگہ میں خاک نہیں

خالی ہو کہ وہاں بختِ نارسا لے جائے کوئی اٹھا کے چہن تک نفس مرا لے جائے
غرض ہو کیا اسے عیاد کی بلا لے جائے مگر غبارِ ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے
وگر نہ تاب و توانِ بل و پیر میں خاک نہیں

ہوئے ہیں فرشِ زمیں گلِ بہار بے حد کھڑا ادب سے سر راہ سر و خوش قد

وجودِ عینِ مرکبِ گلوں سے شاید ہی
 یہ کس بہشتِ شمائل کی آمد آمد ہو
 کہ غیرِ جلوہ گل رہز میں خاک نہیں
 جو فکروں مجھے ہوتی تو یوں نہ کھل جاتا
 سنبھالتا کسی صورت سے اس کو بھلاتا
 مجھے ہی جب نہیں پروا وہ کیوں نہ کھاتا
 بھلا اُسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا
 اثر مرے نفس بے اثر میں خاک نہیں
 کیا خدانے نہ مجھ کو کسی سے شرمندہ
 ہوا کسی کی نہ منت کشی سے شرمندہ
 نہیں اے کچھ بھی تو ہوں اپنے جی سے شرمندہ
 ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
 سوائے حسرتِ تمیر گھر میں خاک نہیں
 دامِ طالبِ حسنِ المآب میں و کشش
 کسی کی یاد میں بے ارتباب ہیں میکش
 زمانہ کہتا ہے مستِ شراب ہیں محو کش
 خیالِ جلوہ گل سے خراب ہیں میکش
 شربِ بخانہ کی دیوار و دریں خاک نہیں
 جو دیکھتے ہیں مضامینِ تازہ کی آمد
 مذاقِ اُڑاتے ہیں مرزا تمام الِ حد
 کہا جب ہی غالب نے ہو کے دق بے حد
 ہمارے شعر میں اب صرف دل لگی کے سد
 کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

(۶۵)

ہم سے نہ کہیے بار بار کرتے ہو یا مائے کیوں
 اپنے ہی دل سے پوچھیں زخم جگر دکھائے کیوں
 فطالم سے خونِ لال شک میں پہنچائے کیوں
 دل ہی تو ہر نہ سنگِ خشک سے بھڑکے کیوں

روینکے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

اس میں کسی کو دخل کیا بلکہ عدو نہیں زمین
 سر پہ ٹھاکے ہم اسے لے تو بجائینگے کہیں
 اپنا نشان مٹائینگے صورتِ نقشِ پا یہیں
 دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاناں یہیں
 بیٹھے ہیں رہ گزر رہ ہم کوئی ہمیں ٹھاکے کیوں

چشمِ بشر میں ہو اگر حسرتِ مہر نیم روز
 دیکھ سکے نہ بھر کے جی طلعتِ مہر نیم روز
 تاب کہاں کہ ہو اسے لو بیتِ مہر نیم روز
 جب وہ جمالِ و لغزِ صورتِ مہر نیم روز
 آپ ہی ہو نظارہ سوزِ پردے میں مہر نیم روز

خوف سے تیرے پروا نہیں سکے مہر و ماہ
 ان کو کہاں یہ تاب ہو دیکھیں جی تیری جلوہ گاہ
 سکھتا ہوا نہ کو بھی ڈالے تو اگر نگاہ
 دشنہ غمرہ جانستاں ناوکِ ناز بے پناہ
 تیرا ہی عکسِ رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

دہر میں شادی و اہلِ مینِ نون ایک ہیں
 زندگی و محنِ بہیمِ اہلِ مینِ نون ایک ہیں
 قطرہ آبِ آسیمِ اہلِ مینِ نون ایک ہیں
 قیدِ حیات و بندِ غمِ اہلِ مینِ نون ایک ہیں

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اُن سے مدد کا سادہ پتہ گئی بواہوس کی شرم
باندھ کر آیا تھا کفن گئی بواہوس کی شرم
مال کیا وہ تیغ زن رہ گئی بواہوس کی شرم
حسن اور اس چمن نلن گئی بواہوس کی شرم
اپنے یہ اعتماد ہی غیب کو آزمائے کیوں

ہم کو یہ دھن کہ چھٹ بجے رات صواب پاس وضع
اس کو یہ صدا دھستے ہو کچھ تو جواب پاس وضع
مان رہم وراہ ہو غوئے خواب پاس وضع
وال وہ غرور عزو نازیاں یہ خواب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں نہ وہ بلائے کیوں

ہیں ہوں تلاش یار میں کہتے ہو جس کو گم رہی
بک نہ لگاؤ ہمدموں تم نے یہ بات کیا کہی
اس کی بھاء ہر سے مجھ کو ہو خوب آگئی
ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بیوفا سہی
جس کو ہودین و دل عزیزا کی گلی میں جاکیوں

لم ہوئی میکشتی کچھ دور مدام بند ہیں
بزم سے اٹھ گئے سبویا کہیں جام بند ہیں
میں خوشی سے میرزا خاص نہ عام بند ہیں
غائب تھے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

۶۶

نہ اٹھائے سے مجھے کیا یہ بتا دیا کہ یوں صاف جواب دے مجھے میرے سوال کا کہ یوں

چپکے چپے گا کام کیا لب تو ذرا ہلا کہ یوں! غنیمت ناشکفنتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں

بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

غمرہ جو اس کا دیکھ لے سینے میں پھر نہ دل رشتہ ناز و کرشمہ دیکھ کر ہوش اڑیں رہے ہے
بیچ ننگہ اگر چلے ہو کے ہو جگر نہ ہے پریش طرز دلبری کھچے کیا کہ بن کے

اس کے ہر اک شاہ سے نکلے ہو یہ ادا کہ یوں

ہیم و امید میں ہے کیا کہیں کس طرح ہے حسرت یا س غرض عمر کے دن گنوا دیے
ہاتھ اٹھا اٹھا کے ہم دل سے دھا کیا کیے رات کے وقت مہرے ساتھ رقیب کو لیے

آئے وہ یاں خدا کرے پر کرے خدا کہ یوں

لی ہیں جگر میں چٹکیاں طور بھنا تو دیکھے مجھ کو جواب کیا دیا طرز ادا تو دیکھے
کیسا حجاب ٹھا دیا شرم و حیا تو دیکھے غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھے

سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھت کہ یوں

سکتے میں خاص و عام ہیں عرب جمال پر سے ہونٹ سیٹے ہوئے سے ہیں آج تو اہل بزم کے
حکم سکوت بھی ہمیں گو نہ دیا ہوشوخی نے بزم میں اس کے و بر و کیوں نہ خوش بیٹھے

اس کی تو خاموشی میں بھی ہو یہی عا کہ یوں

کیا کہیں بزم یار میں بات ہی کچھ بگڑ گئی مفت میں ہو گیا مرن مد نظر تھی دل لگی

دیر تک امنی ہی بات بن آئی غیر کی میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے ہی

سُن کے ستم طریقت نے مجھ کاٹھا دیا کہ یوں

اُس کے دکھاؤں عشق کا جوشِ خروش کس طرح لاسے زباں پہ حالِ دل شمعِ جھوٹ کس طرح

شوقِ ہوس کیں ہیاں دیدہ و گوشت کس طرح مجھ سے کہا جو یا نے جاتے ہیں ہوش کس طرح

دیکھ کے میری بھڑوی چلنے لگی ہوا کہ یوں

آزاد و ہاں جو تھی طبع اسی میں شاد تھی تادریار ہو گزر دل کی یہی مراد تھی

خاک میں بھی اگر ملا خاک بھی وقفِ یاد تھی کب مجھے کوئے یار میں ہنسنے کی وضع یاد تھی

آئینہ دار بن گئی چہر تِ نقشِ پاکہ یوں

عشق میں صدق ہو اگر اُس کا مالِ ہموال جزوِ جوکل سے جا ملا ہو گیا ایک ن کا حال

دوسروں و اتحاد کیوں ہو پھر یہ اتصال گرتے دل میں ہو خیالِ صلِ شوق کا زوال

موجِ محیطِ آب میں اے دوستِ پاکہ یوں

یوں تو ہیں ہند میں بہت فنِ سخن کے مدعی ہیں یہ جدا ہی بنائیں طرزِ ادا کا و رہی

حق تو یہی جو میرزا ختم ہوئی سخنِ نوری جو یہ کہے کہ رنجتہ کیونکہ ہو زنگِ فارسی

گفتہ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ لیں

ردیف (و)

(۶۷)

کچھ بات ہو بطر زمامت ہی کیوں نہ ہو عزت ازی ہم کو خواہ امانت ہی کیوں نہ ہو
کچھ کہئے ہم سے مل میں کورت ہی کیوں نہ ہو وارستہ اس سے ہیں محبت ہی کیوں نہ ہو
یکجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

مکن نہیں ہو دل میں گزرا نبساط کا دل میں ہ شوق ذوق کہاں ارتباط کا
اب نہ میں رہا نہ زمانہ نشاط کا چھوڑا نہ مجھ میں صنعت نے رنگ اختلاط کا

ہو دل پہ بار نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

آزادگی کا اپنی مجھے مل گیا صلہ ٹوٹا ہی التجا سے اعانت کا سلسلہ
تکوہ کسی کا ہی نہ کسی کا مجھے گلہ ڈالا نہ بی کسی نے کسی سے معاملہ

اپنے سے کھینچتا ہوں نجات ہی کیوں نہ ہو

لیں چکیاں جگر میں جو مجھ سے کبھی ملا پھیرا ہمیشہ مشکوہ دشمن کا سلسلہ
کی بات بھی تو وہ کہ دیا جس نے دل ہلا ہو مجھ کو تجھ سے تذکرہ غیب کا گلہ

ہر چند بریل شکایت ہی کیوں نہ ہو

کیسوی ہو بشر کو میسر یہ ہو حال اس کے لئے ہو خلوت خلوت کا ایک حال

تہا بھی ہو تو نفس سے تہی ہو فیل دقال ہو آدمی بجائے خود اک محشر خیال

ہم آنجن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہو

ہم انقلاب سے متاثر ہوں کیا مجال ہرگز نہ لیں ہزار سبق دے جہاں کا حال

دارنگی میں تہ و غیرت کا رکھ خیال ہنگامہ نہ بونی ہمت ہو انفصال

جہل نہ کیجئے دہرے عبرت ہی کیوں نہو

ازادگی جہان سے فرزا نگہ نہیں کیا رم ہو اور چیر جو دیوانگی نہیں

دُیا سے بھاگنا کوئی مردانگی نہیں وارستگی بہانہ بیگانگی نہیں

اپنے سے کر نہ غیر سے جنت ہی کیوں نہو

رکھنا ہو شاہراہ فنا میں قدم کوئی ہوتا ہو محو دل سے خیالِ عدم کوئی

اس فکر جاں گداز سے پھٹتے ہیں ہم کوئی مٹتا ہو قوتِ فرصتِ مستی کا غم کوئی

عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہو

کرتے پھریں قیامِ چناں و چینیں اسد جاتے ہیں اس کے کوچے سے عزرا کیلین اسد

دیکھیں گے آپ قبر ہماری وہیں اسد اُس فتنہ خوکے ڈسے اب گھٹتے نہیں اسد

اس میں ہمارے سر یہ قیامت ہی کیوں نہو

ستایا تو نہیں میں نے کسی مرغِ نوازن کو
فنائن تہا ہوں میں جب دکھتا ہوں نشیمن کو
مجھے یوں پکھتے ہیں جیسے پکھیں اپنے دشمن کو
قفس میں تہں گرا چھپکھنی جانیں میرے شیون کو

مرا ہونا بڑا کیا ہو تو اسجان گلشن کو
یہ مانا غیر صورت آشنا اس کا نہ محرم ہو
مگر یہ روسیہ اس کے شمس میں تو ہر دم ہو
وجودِ غیرِ حب تک ہی تو مجھ کو کچھ نہ کچھ غم ہو
نہ دی ہوئی تھارایا آنسوئے دوستِ دشمن کو

بھرتایا بھیرے گرا دل بھی ظالم میری حالت پر
ہنسی آتی ہے مجھ کو تیرے دعوائے محبت پر
اشر و الاہ اس منظر نے بھی تیری طبیعت پر
نہ نکلا آنچھ سے تیری کائناتِ سوسِ حراحت پر

کہا سینے میں جس نے نہ بچکاں شکانِ سوزن کو
ہوئی ہے کیا بلا دیوانگیِ عشق پر پوش میں
کہ یا اے سکونِ مطلق نہیں قلبِ مشوش میں
جنوں کی حرکتیں قائم ہیں گویا عشق میں
خدا شرمائے ہاتھوں کو کہتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دہن کو

ہم اپنا غنّ خونِ نابجا آساں سمجھتے ہیں
نکلنا جانبِ قتلِ ترا آساں سمجھتے ہیں
رواں ہونا گلے پر تیغ کا آساں سمجھتے ہیں
بھی ہم قتلِ گہہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں

ہنیں دیکھا سنا و عجبے خوں میں سرے تو سن کو

رہا ستوراہن سے سناں و تیر بٹے کا ہمیشہ مادہ اس میں ہا شمشیر بٹے کا
زمانہ اب جو اس کے لائق تو قیر بٹے کا ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بٹے کا

کیا بیتاب کاں ہیں جنبش جو ہر نے آہن کو

مجھے کیا اس سے ابر تر گھمے یا گھر کے کھل جائے دُر خوش آب پانی کی جگہ یار و زبر سائے
نیہی تجھتا ہوں اگر کالی گھٹا چھائے خوشی کیا کھیت پر سیے اگر سو بار ابر آئے
سمجھتا ہوں کہ دھوٹے جو ابھی سے برق خرمن کو

بے ثمت کہ اس سامنے مثالِ جاناں ہے بتوں کو جان کر سگانِ کعبہ دل سے قواں ہو
اگر کچھیں حقیقت یہاں تو وہ پکا مسلمان ہو وفا داری بشرطِ استواری اہل ایمان ہو

مے بُتِ خانہ میں تو کبھی میں گا رو بہرہن کو

پھرا یا سر بکثِ شوقِ اجل نے چار سو مجھ کو لیے پھرتی تھی زور جاں دہی کی آرزو مجھ کو
رہی جلا دہی کی زندگی بھر جستجو مجھ کو شہادت تھی ہری قسمت میں دی تھی یہ جو مجھ کو

جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

جو ہوتا مال مٹی نیند کیونکہ خاک پر سوتا زرو گوہر کے ہوتے کس طرح ٹھنڈے جگر سوتا
متاعِ رفتہ رہ جاتی تو پھر کیا بے خطر ہوتا نہ لٹا دن کو تو کب ات کو یوں بے خبر سوتا

رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں بہن کو

مضامین کے خزینے بہتے ہیں سینے میں شاعر کے
خزینہ دار و مالک ہیں سخنورانِ وفائے کے
گہر کی قدر کیا ہو سامنے الفاظِ نادر کے
سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ چو یا ہوں جاہر کے

جگر کیا ہم نہیں کھٹے کہ کھو دیں جا کے معدن کو

دراقدس کا اک دربان ہو مفتوح ہیں غالب
سکندر کو ہو فخر آستانِ بوسی ہیں غالب
اسی دروازہ پر رکھتا ہو مرزا بھی ہیں غالب
مرے شاہِ سلیمان جاہ سے نسبت نہیں غالب
فریدوں و جم و کینسر و دداراب و سہمن کو

(۹۶)

سنگِ سمنائی من ہوئے اُس خستہ تن کے پاؤ
جانا کہاں کہ ہو گئے ایک ایک من کے پاؤ
کیا جانتا تھا وہ نہیں جھوٹے سخن کے پاؤ
دی سادگی سے جان پڑوں کو کہن کے پاؤ
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرِ زن کے پاؤ

جی ہیں ہو چو جیے بت نازک بدن کے پاؤ
جیسے سچا بری پوچھے ہیں برہمن کے پاؤ
ہاتھ آئیں کس طرح مگر اُس پُرفتن کے پاؤ
دھوتا ہوں میں پیچے کو اس سیم تن کے پاؤ
رکھتا ہو ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤ

کہتے تھے اپنے نفس کو ہم ناسرا ہو یہ
بچتے تھے اس کے سایہ سے گویا بلا یہ

اتارہ اب ہمارے لیے ہو گیا ہو یہ بھاگے تھے ہم بہت سوا بس کی سڑاوی یہ
ہو کر اسپر دابتے ہیں راہزن کے پاؤ

سارا بدن ہو فرط جراحت سے چور چور عاجز ہوں میں دواؤ دوش سے تو کیا تھو
جمل کچھ علاج تو ان کا بھی کر ضرور مریم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور
تن سے سوا انکار ہیں اس خستہ تن کے پاؤ

صد چاک دل ہو صورت صد برگ چار برگ صحرائیں تھکانہ کچھ بھی غم برقہ و تلک برگ
پھر ہو چلا ہو قبر میں وحشت کا ساز و برگ اللہ سے ذوق وشت نوروی کہ بعد مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤ

گلبں کی شاخ شلخ ہوئی جام گل بکف ہیں قبریوں کی تاک میں سب سرو صفت نصبت
کس کس کی جان دیکھیے امسال ہو تلف ہو جوش گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
اڑتے ہوئے اُکھٹے ہیں مرغِ چین کے پاؤ

ناز و نراکت مٹی بھی دیکھی مٹی نہیں رفتار کے خیال سے تھکتا ہو وہ حبس
ظاہر ہیں سب تہکان کے آثار ہم نشین شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دکھتے ہیں آج اس بت ناکثان کے پاؤ

ایسا سخن شناس تو شاید سنا نہ ہو پڑھ کر سخن ظفر کا جلوب چاٹنا نہ ہو

مہرِ ایقین کیوں مجھے اس قول کا نہ ہو غالب مرے کلام میں کیوں کہ مرانہ ہو
پتیا ہوں دھوکے خسر و شیریں سخن کے پانوں

۴۰

یہ قدم رنچہ پا کیا کوئی کم ہو ہم کو ان کا لانا ہی سرِ بزمِ کرم ہو ہم کو
خاکِ بوسی کا عجب شوقِ اتم ہو ہم کو واں پہونچکر جو غش آتا پڑی ہم ہو ہم کو
صدرہ آہنگ میں بوس قدم ہو ہم کو
سہریں سودائے چمن ہو نہ ہو اے گلشن تیرے در سے ہو نہیں پاؤ اٹھانا بھی کھن
لاغری وہ ہو کہ اک بال ہیں گویا اہم تن ضعف سے نقش پڑی مور ہو طوقِ گردن
تیرے کپچے سے کہاں طاقتِ رم ہو ہم کو
آج ہمدرد زمانے میں کہاں پیدا ہو ایک کا ایک کو ہو درد تو بے جا کیا ہو
غم سے جو واسطہ میرا ہو وہی دل کا ہو دل کو میں اور مجھے دلِ محو و فار کھتا ہو
کس قدر ذوقِ گرفتاری ہم ہو ہم کو
دائے غفلت کہ نہیں اتنی خبر بھی اب تو سامنے کون ہو اور آپ نے دیکھا کس کو
ہم سے اب یدہ و دانستہ ہوا غماض ہو جو جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز تو رسمِ ہی ہم کو

رہنے دین دست ہی طرح ہیں گوشہ نشین سیر گلزار سے دل اور بھی ہو گا غمگین
 لکھائے زخم جگر پر یہ ہمیں تاب نہیں رشک ہم طرحی و درد اثر بانگ حزیں
 نالہ مرغِ چمن تیغ و دم ہو ہم کو
 صاف ظاہر ہو کہ وعدہ تھا مگر صاف تھا وقت اصرار کھلا آ کے نتیجہ اس کا
 ایسی قسموں کا بھروسہ ہمیں کیونکر ہوتا سر اڑانے کے جو وعدے کو بکتر چاہا
 ہنس کے بولے کہ تڑے سر کی قسم ہو ہم کو
 بے سبب اشکِ رواں کا تو نہیں اندھا نا عین جو ہر اک یہ ان کا کہ ہوں آنکھیں غبار
 نہ ہاں روئیں تو مڑگاں پہ کہاں آئے بہار دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ و لیکن ناچار
 پاس بے روفی دین اہم ہو ہم کو
 داخل شکوہ سمجھتے ہو جو خاموشی کو حال کیا ہو جو کبھی نالہ پر در دُسنو
 کیا کریں چین کسی طرح نہ جب لینے دو تم وہ نازک کہ خموشی کو فناں کہتے ہو
 ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہو ہم کو
 عقل حیران ہو کس وجہ سے چھوڑی ہٹی کچھ تو ہو جس لئے طو کی ہو مسافت اتنی
 یک بیک چھوڑ دی کیوں الفتِ راحت کی لکھو آئے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
 ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہو ہم کو

جب چلے گھر سے تو مٹی دل میں پیاں اور ہی لہر بیٹھ رہنا ہیں اور ترک سفر ہو اک قہر
قصہ ہی دور کا مانع جو نہ ہو گردن ہر مقطع سلسلہ شوق نہیں ہے یہ شہر

عزم سیرِ نجف و طوافِ حرم ہو ہم کو
آپ کی طرح ہی مرزا بھی کرم کا طالب
دل کھنچا جاتا ہے اربابِ کرم کی جانب
وجہِ نقل و حرکت کیا کہوں مرزا صاحب
لئے جاتی ہے کہیں ایک توقعِ غالب
جادو رہ کششِ کافِ کرم ہو ہم کو

(۷۱)

کیا قابلِ خطاب وہی روسیہ ہو مجھ پر نہ بھول کر بھی کرم کی نگاہ ہو
چاہو اُسی کو دل میں گراں کی چاہ ہو تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

الزام رکھ کے غیر پہ کیا صاف ہو گئے گویا یہ خون ہی نہیں دسے جناب کے
فرماتے ہو کہ قتل کیا تجھ کو غیر نے بچتے نہیں مواخذہ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہو تو تم گواہ ہو

جس طرح قتلِ خون میں حسین بے ہراس ہیں کیا وہ بھی یوں ہی دشمنِ جانِ اناس ہیں
کیا یوں ہی ان کے شیفہ بھی قتلِ یاس ہیں کیا وہ بھی بے گنہ کشِ حقِ نامشاس ہیں

ماتا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

مخل تمام شوق بقائیں ہی بے قرار
تکتے ہیں غیسر بھی نگہ سے باریبار
یہ رشک کس طرح نہ کرے مجھ کو دل نگار
اُبھرا ہوا نقاب ہیں ہر ان کے ایک تار

مرا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

رکتا نہ میکان سے تو رکھتا جگہ کی قید
آزاد کے لیے نہیں زیبا جگہ کی قید
وارستگی بجا ہی تو بے جا جگہ کی قید
جب میکانہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید

مسجد ہو مدبر سے ہو کوئی خانقاہ ہو

ہر چیز باغِ خلد کی ہی منتخب درست
حور و تصور و شہد و انار و غنہ درست
مشہور ہو کہ ہی وہ مقام طرب درست
سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست

لیکن خدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو

سُونَا نہ ہو گا دیس اگر ہم نہ ہوں کہیں
ذاتی نہ کوئی گھر ہی نہ گھر کی کہیں زمیں
مرزا و جو شاہ ہی رونق فزاے دیں
غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں

دُنیا ہو یا رب اور مرا بادشاہ ہو

نہیں مضبوطے جب کام لو تو کیونکر ہو
نہیں نہ فرصت تدبیر دو تو کیونکر ہو

اب اس سے حضرت بل بات ہو تو کیونکر ہو
کئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو

کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو

حصولِ صلت و دیدار تو ہی امرِ محال
فقط ہی باعثِ تسکین تصورِ مثال

امید و یاس کو سمجھا ہو آرزو کا مال
ہماری ذہن میں اس فکر کا ہونا مصل

کہ گرنے ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو

کبھی خیال کہ اظہارِ مدعا کیجے
کبھی یہ وہم کہ ہرگز نہ یہ خطا کیجے

کہاں تک اپنے مقاصد کا التوا کیجے
ادب ہی اور یہی کشمکش تو کیا کیجے

جیسا ہی اور یہی گو گو تو کیونکر ہو

مختارِ ادل ہو کہ رشک و حسد کا بغینہ
بھرا ہی رہتا ہو بغض و نفاق سے سینہ

یہاں تک اپنے مقابل سے ہر تمہیں کینہ
الچھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ

جو تم سے شہر میں ہوں ایک تو کیونکر ہو

وہ رشک مہرِ رات بھر تو جلوہ نما
منود ہونے نہ پائی سحر کہ چل نکلا

مری نگاہ میں اندھیر کیوں نہ چھا جاتا
جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا

وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

لیا جو فرطِ عقیدت سے ہم نے بوسہ پا
تو تم نے غایتِ نخوت سے سر کو ٹھکرایا

نہ شرم کچھ تھیں بندوں کی ہر نہ خوف خدا تھیں کہو کہ گزارہ صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو جو بھاری سی ہو تو کیونکر ہو

کہیں حضرت دل خاک وہ بھاری قدر ہوئی نہ کچھ بھی ہماری سوائے خواری قدر
گنوا چکے ہوں ہاں ہم جب اپنی ساری قدر ہمیں پھر ان سے اُمید اور انھیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو

ہیں تو آجہ قرآن تھا جو مضمون تھا بجا ہی ہم نے جو پڑھ کر کہا ہوا آیتا
وفا ضرور کریں گے وہ وعدہ فردا غلط نہ تھا ہمیں خط پر گمان لگی کا
نہ مانے دیئے دیدار جو تو کیونکر ہو

سکوں سے کام نہ لوں اضطراب میں تو قصود مگر ہوں ضبط میں اس اضطراب سے مغفود
زمانہ بھر میں نہ مرزا سا پائے گا صبور مجھے جنوں نہیں غالب دے بقول حضور
فراق یا ریں سکین ہو تو کیونکر ہو

(۷۳)

جو ناب ضبط غم ہوا شک نکھوں سے رواں کہیں ہو کسی سے دل کی بی تابی کا درد پر وہ بیان نہیں ہو
جو بود و آشنا تو شکوہ درد نہاں کیوں ہو کسی کو دے کے دل کوئی نوا سخ فغاں کہیں ہو
نہ ہو جب دل ہی پہاویں تو پھر نہ نہیں ماکیں ہو

وہ ہر دم سلسلہ توڑیں تو تم کب تک سے جو رہیں
 رہیں ہم جو نظارہ کہاں تک جیت ہنہ توڑیں
 خنواہ ہیں تو ہوں تم رشتہ تمکین کو کیوں توڑیں
 وہ اپنی خونہ چھوڑینگے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
 سب سے پیش کیا چھپیں کہ ہم سے سرگراں کیوں تہ

چھپا رکھا تھا ہم نے اپنے دل میں ازا الفت کو
 نہ کی اُٹ صبر و استقلال سے جھیل اہر افست کو
 خیر کیا تھی ہمارے در و پہنائی کی خلعت کو
 کیا غنوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
 نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں تہ

نہ کرنے دے ہمیں وحشت میں بھدہ اپنی چو کھٹ کا
 پہاڑوں تاک کے یگا رہبری سو داسے سراپنا
 ہیں ہر کچھ نہ کچھ تو چارہ جو شش جنوں کرنا
 وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر چھوڑنا ٹھہرا
 تو پھرا دی سنگل ل تیرا ہی سنگ ستاں کیوں تہ

گل و سرور یا حین کا مفصل ذکر کر ہم دم
 کڑا دل کر کے سب طالات مجھ سے کہہ کر ہم دم
 یہ میرے پوچھنے پر تو نے تھا ما کیوں جگر ہم دم
 نفس میں مجھ سے رو دا دجہن کہتے نہ ڈر ہم دم

گری ہو جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیانہ کیوں تہ
 نظربندی کیسی ہو مہا کیا ہو سمجھاؤ
 طبیعت کو عجب کچھن ہو اس گٹھی کو سلجھاؤ
 اگر پرہیز نہیں مد نظر تو سامنے آؤ
 یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں لیکن پہنلاؤ
 اگر دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہا کیوں تہ

کچھ ایسا ہی ہر انسان کی طبیعت کا تقاضا ہے کہ یہ اپنی خطا کو غیر کے سہم ڈال دیتا ہے
 ہوں ٹھہرے گنہگاروں میں یہ انصاف اچھا ہے غلطی جہنم لکاشکوہ دیکھو جمع کس کا ہے
 یہ کھینچو گرم پیتے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

یہ رخ کا آئینہ دنیا کی حیرانی کو کیا کم ہے پریشیاں نصفِ عالم کی پریشیاں کو کیا کم ہے
 نگاہ تیز جانبازوں کی قیانی کو کیا کم ہے یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
 ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسمان کیوں ہو

عنایت تم نے کی جس پراسی کا ناک میں دم ہے ہوئے غمخوار جس غم کیں کے تم وہ طعنہ غم ہے
 تھاری مہربانی میں بھی جلا دی کا عالم ہے یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
 ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسمان کیوں ہو

مصیبت رنک کی ظلم و دن رات بہتے ہیں تھاری مہربانی سے پریشیاں حال رہتے ہیں
 امنی سو جھی ہو تم کو آشکریاں نکلوں سے بہتے ہیں یہی ہی آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
 عدو کے ہو لیئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

ابھی آئے ابھی جاتے ہو جاناکس کو کہتے ہیں یہ آنا ہی تمھارا تو نہ آنا کس کو کہتے ہیں
 کرم بکھا ہی اس کو تو جلا نا کس کو کہتے ہیں یہی ہی آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
 عدو کے ہو لیئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

جو کہتا تھا بڑی اور غیر کے گھر محفل آرائی تو ہنس کر مالتے تھے مجھ کو ٹھہرتے تھے سوائی
 لگے اب بحث بھی کرنے جتا کر اپنی دانائی کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں سوائی
 بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہنا کہ ہاں کیوں ہو
 چلا جا دو نہ جب قہر نہ اس کے برو غالب کرے گی کیا اندر پھر خاک تیری گفتگو غالب
 میر بزم اس سے بے فائدہ کیوں بدو غالب نکالا چاہتا اور کام کیا طعنوں سے تو غالب
 ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہر بیاں کہوں ہو

روایت (۱)

(۷۴) سب ملتوں کے ساتھ مراعات چاہیے آپس میں اتحاد ہو وہ بات چاہیے
 رندی و تراہدی میں مساوات چاہیے مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے
 بھوں پاس آنکھ قبلہ حاجات چاہیے
 رخ کے قریب زلف کی ظلمات چاہیے دن سے ملی جلی ہوئی یہ رات چاہیے
 ہر شو کا اس کی منہری سے اثبات چاہیے مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے
 بھوں پاس آنکھ قبلہ حاجات چاہیے
 مصروف آپ مشوق بھائی میں تھے عمر بھر مطلق نہ تھی کسی دل مظلوم کی خبر

بیٹھے ہیں اب تو ہاتھوں سے تھامے ہوئے جبکہ عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر

آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

جرات تو دیکھ اس دل کو تاہ دست کی اس نامراد نے کبھی ہمت نہ پست کی

اب غم ہو نیست کا نہ خوشی اس کو ہست کی دے داد ای فلک دل حسرت پرست کی

ہاں کچھ نہ کچھ تلافی مکافات چاہیے

صورت کو ان کی روح جب اپنی ترس گئی نہ بیرکار گر نہ ہوئی کوئی دید کی

اس سے زیادہ شکل رسائی کوئی نہ تھی سیکھے ہیں مہر خوں کے لیے ہم مصوری

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

یہ لوٹتا ہو ثروت و اقبال و جاد کو کرتا ہوں غافل اس سے دل عیش خواہ کو

سمجھا نہیں ثواب کبھی اس گناہ کو مڑے غرض نشاط ہو کس رو سیاہ کو

اک گو نہ بخودی نگھے دل ات چاہیے

بیکار شو ہیں ہم وہ محرک اگر نہ ہو ق مژدایہ راز وہ ہو جو پاتے ہیں از جو

اسی کا سب ظہور عدم سے ہو جان لو نشو و نما ہو اصل سے غالب فروع کو

غاموشی ہی سے نکلے ہو بات چاہیے

ہر لعل کی ہو لبغ جہاں میں فصاحت جدا ہر گلستاں نے پائی ہو آب ہوا جدا

ہر گل کی بوجہ ہر روش اور ادب جدا ہر رنگ لال و گل و فسرین جدا جدا

ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

سر میں اگر خودی ہو نہ لے نام بے خودی خود میں ہی تو نہ کر ہو میں خام بے خودی

کر جہدہ شکر کا جو ملے جام بے خودی سر پائے خم پہ چاہیے ہنگام بے خودی

رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیے

قائم ہو ایک حال پہ کس طرح آدمی کرنی ہو راہ طواسے جذب و سلوک کی

ہر فعل کی ہو حالت موجودہ مقتضی سر پائے خم پہ چاہیے ہنگام بے خودی

رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیے

خالی نہ ہو حقیقت عرفاں سے کوئی بات انسان حرف حرف سے پیدا کرے نکات

نظارہ صفات سے ہو جائے محو ذات یعنی بحسب گردش پیمائے صفات

عارف ہمیشہ مست و ذات چاہیے

(۷۵)

ذرا سی جان تن میں ہو فنا کرنے کو ہوں وہ بھی رگوں میں جو لہو تھا ہی سرشک لالہ گوں وہ بھی

جگر رکھتا تھا لیکن اب ہی با حال نہ ہوں بساط عجز میں تھا ایک دل کہ قطرہ خون نہ بھی

سور ہٹا ہی بانداز چکین سرنگوں وہ بھی



یہ کیا کم مہربانی ہو کہ ٹالا بات کو اس نے
خدا نا خواستہ دل سے نہ وہ روٹھنا نہ ہم ٹھٹھے
وگر نہ مفت میں لینے کے دینے پر گئے ہوتے
ہے اُس شوخ سے آرزو ہم چندے تکلف سے

تکلف پر طرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

نکلے کو نسے ارمان دل آخر مقدر نے
طبیعت کو ذرا ابھھاؤ سا ہی اس قصور سے
کہ ہم ہوں منتظر پیبِ اجل کی آمد آمد کے
خیال مرگ کیا تسکین دل آرزوہ کو بخشے

مرے دام تمنا میں ہو اک صیدِ زیوں وہ بھی

مشرکِ نوح جانے سے تو تھا یہ مدعا ہمدم
مگر اس سے تو سوزِ قلب نہ ہوا ہو گیا ہمدم
کہ دل کی آگ اس پانی سے کم ہو گی فریاد ہمدم
نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم

کہ ہو گا باعثِ افزائشِ رودوں وہ بھی

بگاہی زور بازو پر جہاں تک اپنے اتراؤ
بہرِ قل نہ یادہ اس کے جوہر کو نہ چمکاؤ
کہ وہ تعریف اپنی سرخرو اس کو بٹھہراؤ
نہ اتنا بے شیش تیغ بھاپر ناز و مبراؤ

مرے دریائے بیتابی میں ہو اک موجِ خوئے بھی

توق کیا سوال اس سے اگر اکے ور کا کیجے
سو خالی دکھاتا ہی جو عرضِ مدعا کیجے
مناسب ہو کہ اشکِ حسرت و اراں پیا کیجے
مئی عشرت کی خواہش ساقی گردوں کیا کیجے

لیجے بیٹھا ہو اک ڈوچار جام و انگوٹھ بھی

آئینہ و بیم میں مرزا ہوں کہ سے سرگرداں نہیں آئے ہیں تائیں سے ملنے کا کوئی سااں
 کسی صورت میں لکھیے ہوتی بھی آساں مے دل میں ہو عاشقِ قِ صیل و شکوہ ہواں
 خدا وہ دن کہے جو اس میں یہ بھی کہوں وہ بھی

۱۱۱۱۱۱

(۷۶)

نکالے گی نہ چکر سے ہمیں گردش زمانے کی یہ گردش جس قدر بھی ہو سزا ہو دل لگانے کی
 نہیں پر اب کوئی صورت نہیں آرم پانے کی غم دنیا سے گریا پی بھی فرصت نہ ٹھانے کی
 فلک کا دیکھنا تقریب تیر سے یاد آنے کی

اُسے اپنی تپش کا حال کچھ لکھ تو دیا یارب مگر خط کو مرے وہ پڑھ بھی لے اُمید کیا یارب
 جلا ہی دے کہ سوزِ دل تو ظاہر ہو یا یارب کھلے گا کس طرح مضمون مے مکتوب کا یارب
 قسم کھائی ہو اُس کا فونے کا فذ کے جلانے کی

اگر آہ آتشبار نالہ آتش افشاں ہو نہیں چارہ کہ عالم آشکارا رازِ پنہاں ہو
 دباؤں یہ دہتی آگ کیونکر عقل حیراں ہو لپٹنا پر نیاں میں شعلہ آتش کا آساں ہو
 دے نیشیل ہو حکمتِ دل میں سوزِ غم چھپانے کی

کوئی بیکار اُن کا جانب گزار جانا تھا گلستاں کو مگر اس رنگ سے مقتل بنا تھا
 گلوں کو بھی تو اپنے زخمِ غورِ دوں میں لانا تھا انھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھنا تھا

اُٹھتے سیر گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

مقدّر ہی میں تھا کچھ تجھ سے فسوں ساز پر مرنا بد انجامی تھی اپنی خوبی آغاز پر مرنا
مناسب تو نہ تھا اس ظاہری انداز پر مرنا ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا ظالم مگر مہربانے کی

غمِ دُورِ اے کسے شکوے سے جھپٹ کھل گئی اپنی طبیعت کی وہ قوت اور وہ جولانی غلط نگلی
حسینوں کی اُٹھائے بات کس کو تاب ہو اتنی لکھ کو بے حادث کا تحمل کر نہیں سکتی
مری طاقت کہ ضامن تھی تبوں کے نالٹھانے کی

زمانے میں نہیں سچی محبت کا نشان غالب جھپٹتے ہیں مخلص دستِ لبِ ہر کہاں غالب
بیانِ حال میں صراحتِ مرزا کی زباں غالب کہوں کیا خوبی و ضلعِ اپنا رزماں غالب
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی بھی بارہائی کی

۶۶

نڈال سے بھی زیادہ بُرا یہ مکان ہو اک قید میں پڑے ہیں مصیبت میں جان ہو
یہاں نقطہ خیالِ زمیں کا نشان ہو کیا تنگ ہم ستم زدگیاں کا جہان ہو
جس میں کہ ایک ہفتیہ مور آسمان ہو

سیارے گھومتے ہیں فلک پر ترے لیے اسباب اور کچھ بھی نہیں ان کی سیر کے

چکر دیئے ہیں چرخ کو تیری تلاش نے ہو کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے

پر تو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہو

بیچارہ دل حوادثِ دنیا سے ہو بہ تنگ ہو کیوں نہ چور چور کہ کھایا ہو سخت سنگ

اس سنگِ نیک و ہم سے ہو میری عقلِ دنگ حالانکہ ہو سیلی خوار اسے لالہ رنگ

غافل کو میرے شیشے پہ ہو کا گمان ہو

اپنا تو دل تھا آگ سے گویا بھرا ہوا کمر تا قیام بھروہ اس آتشِ کدے میں کہا

خالی تھا سوزِ عشق سے ہاں دلِ قریب کا کی اس نے گرم سینہ اہلِ ہوس میں جا

آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہو

کچھ بات جھک کے کان میں کہنا سہا نہ تھا آہز کوئی سبب بھی تھا دامن کی آڑ کا

اب تم ڈھٹائی سے تو نہ جھٹلاؤ بر ملا کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا

بس چپ ہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہو

آنکھیں لگی ہیں جانبِ در انتظار میں تصویرِ ساخوش ہو شوقِ نگار میں

آیا ہو گشتِ کمر کے ابھی خارِ زار میں بیٹھا ہو جو کہ سایہ دیوارِ یار میں

فرماں والے کشورِ ہندوستان ہو

غم نے ہو پلانے کا اچھا صلا دیا اک داغِ جاں گدازِ جگر پر لگا دیا

اس داغ نے تمام جگر کو حیلادیا ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کیس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہو

اس پر چڑھتے نہیں وہ قہر کی نظر ظاہر ہوا نہیں ہی بھروسہ رقیب پر
مہر کا بخت برسرِ یاری ہی سبیر ہو جائے اعتماد و فاداری اس قدر
غالب ہم اس میں غش ہیں کہ نامہربان ہو

(۷۸)

یا تو میں کرتا تھا غم سے آہ و فاداری ہائے اور نہ کہ تانا تھا کچھ غم گساری ہائے
یادِ دم آخر جتنی مشرطِ یاری ہائے ہائے درد سے میرے ہو تھکونے فراری ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شکاری ہائے

دل کا دل ہی میں ہا کچھ بھی نہ نکلا حوصلہ پست ثابت ہو گیا الفت میں تیرا حوصلہ
منہ چھپایا مجھ سے بس اتنا ہی تھا کیا حوصلہ تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری ہائے

عہد تجھ سے زندگی بھر کے لیے تو لیا کیا خبر تھی زندگی بھلے گی تیری سنے وفا
مانے آیا مری تفتدیر کا لکھا ہوا عمر بھر کا تو نے پیمان وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں تھی پاداری ہائے ہائے

اٹھ چکے ہیں جبکہ سامانِ بھٹائے زندگی ہو پھر اس سے کیا نئی کیا دل کو بھائے زندگی
 کون مر کر جیسے چوٹھے میں جائے زندگی نہ ہر گزتی ہو مجھے آبِ دہو اسے زندگی
 یعنی تجھے تھی اسے ناسازِ نگاری ہائے

ناز کی سے یاد کیا تھا تر از رخِ پھول سا صورتِ برگِ خزاں یا اب ہو مر جھایا ہوا
 کس ہونے اور گلِ تر تجھ کو پترِ مرنِ کیا گلِ فشانِ ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
 خاک پر ہوتی ہی تیری لالہ کاری ہائے

تجھ کو رہنا تھا ہائے دیدہ مناک میں یا مناسب تھا بنانا گھرِ دلِ صد چاک میں
 خوشنشین داری سے تیری آگیا دمِ ناک میں شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
 ختم ہو الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے

کامیابی اب کہاں نہ بات ہی اور دل گئی وہ بہارِ عاشقی وہ رونقِ محفل گئی
 عہدِ لینے کی وہ ساری سستی لا حاصل گئی خاک میں ناموس پہانِ محبت مل گئی
 اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے

منہ چھپایا خاک میں کیوں آخر آیا کیا خیال کیا کسی پر ہو گیا ظاہر تو نے ل کا خیال
 جیکر رسوائی کا تھا ظاہر منہ تجھے اتنا خیال کیوں مری غنوارِ گی کا تجھ کو ۱ یا تھا خیال
 دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے

ادچھے اوچھے وار جب اس نے لگا سے بار بار
 ڈکھ گئی نازک کلائی اور بار بار ویشل ہوا
 پھر بھلا کس طرح نکلے اپنے دل کا مدعا
 ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
 دل پر اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے

کر دیا جو بے طرح رنج و الم نے خستہ حال
 موت کا آنا کھٹن ہی اور جینا ہی و بال
 صبح کرنا شام کا فرقت زدہ کو ہر حال
 کس طرح کاٹے کوئی شبہائے تابہ برنگال
 ہو نظر خو کر و اختر شماری ہائے

کون جواب سننے والا کس سے کہیئے اپنا مال
 دور کیجے کس کی صورت دیکھ کر دل کا مال
 کوئی دیکھے تو مری حیران نصیبی کا کمال
 گوش محروم پیام چشم محروم جمال
 ایکٹل نش پر یہ نا اُمید داری ہائے

نام کو مشہور دنیا میں ہوا بے نام و ننگ
 حال مرزا دیکھ کر ال جہاں ہوتے ہیں دنگ
 دل میں باقی تھی ابھی صحرا فردی کی اُننگ
 عشق نے پکڑا نہ تھا غالب بھی حشت کلا رنگ
 رہ گیا تھا دل میں کچھ ذوق خواری ہائے

(۷۹)

کیوں قید زندگی سے دل اتنا اُداس ہے
 جب اس سے چھوٹنا ہے تو پھر کیا ہر اس ہے
 کہتے ہیں جس کو موت وہ ہر وقت پاس ہے
 گشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے

تسلیں کو دے تو یہ کہ مئے کی آس ہو

پھرتا ہی رات دن یہ پریشاں ادھر ادھر
اس کو نہیں قیام کبھی ایک حال پر
وحشتِ نوح کے حال سے اور غفلت اس قدر
لیتا نہیں مرے دل آوارہ کی خبر

اب تک وہ جانتا ہی کہ میرے ہی پاس ہو

بغات کو دکھائی نہ اس درد کی جھلک
محروم اس مرنے سے رہے سر بسر ملک
ہوں اس عطائے خاص سے منت کش فلک
کیجے بیان سرور تب غم کہاں تلک

ہر مو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہو

ہوتا ہی صحبتوں ہی سے انساں بُرا بھلا
صحبت ملی بھی اُس کو مگر کیا اثر کیا
ہونا تھا آشنائی دل سے حق آشنا
ہو وہ غرورِ حسن سے بیگانہ وفا

ہر چند اس کے پاس دلِ حق شناس ہو

سودا ہی ہیں وہ جن کو ہر صہبائے اجتناب
انساں کو چاہیے کہ پیئے جائے بے حساب
کرتا ہو خوب جذبِ طوبات آفتاب
پی جس قدر طے شبِ مہتاب میں شراب

اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہو

مہرِ زرا پھر ہی دشت میں چاروں طرف آس
رونی فزا وہاں ہو درختوں کی صف آس
دُور نہیں ہی باعثِ قدر صدقِ آس
ہر اک مکان کو ہی مکیں سے شرفِ آس

مجنوں جو مر گیا ہے تو جگمگ آداس ہے

(۸۰)

میری سنوڑی پہ عبث قیل و قال ہے مطلب کے میرے پائے کوئی کیا مجال ہے
کہتا ہوں سب کچھ اور زباں میری لال ہے گر خامشی سے فائدہ انھائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی مجال ہے

اجاب چپ ہیں سُن کے دلِ ار کا گلہ درو زباں ہی چرخِ ستم کا رکھ گلہ
سُننا ہے کون یا رِ جنا کا رکھ گلہ کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ
دلِ فردِ جمع و خراجِ زبان ہاے لال ہے

دارِ فتنہ دل کو کب سے ہو ارمان دید کا آنکھیں مری ہوں کاش کبھی جلوہ آشنا
مشکلِ تجھے نہیں کہ حجاباتِ دے اٹھا کس پرہ میں ہو آئینہ پر دارِ کو خدا
رحمت کہ عذرِ خواہ لب بے سوال ہے

پر دوا اُسے کسی کی ہو کیا وہ تو ہو غنی پر خاش ہو کسی سے اُسے یہ ہے بد ظنی
روکے ہوئے حجاب ہے یا پاک دامن ہے ہی خدا نخواستہ وہ اور دشمنی
ای شوقِ مفصل یہ تجھے کیا خیال ہے

خوشبوئے مصطفیٰ سے معطر ہے یہ مکان جس پر رو د بھیجتے رہتے ہیں نسِ فغان

اس کے طواف میں ہو شب و روز آسمان مشکیں لباس کعبہ علی کے قدم سے جان

نافِ زمین ہو نہ کہ نافِ عزال ہو

گردش کا میری اور ہی کچھ رنگِ تنگ ہو گردوں بھی دیکھ کر مری حالت کو تنگ ہو
جوشِ جنوں میں یہ تک و دو کی اُمنگ ہو وحشت پہ میری عرصہ آفاق تنگ ہو

دریا زمین کو عسوقِ انفعال ہو

مہرِ ناز کی طرح نفیس کو سمجھائیو اسد اس خواب پر نہ بھول کر اترائیو اسد
دھوکہ نہ دواہم سے کہیں کھائیو اسد ہستی کے مست فریب میں آجائیو اسد

عالم تمام حلقہٴ دایم خیال ہو

(۸۱)

غیر سے تجھ کو محبت ہی سہی تجھ سے اغیار کو الفت ہی سہی
مجھ پر اغیار کو سبقت ہی سہی عشقِ مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی

میری وحشت تری شہرت ہی سہی

کونسی ایسی خطا کی ہم نے جس سے لائق نہ ہے محفل کے
بیلسلہ کچھ تو لگا سے رکھئے قطع کیجئے نہ نفاقِ ہم سے

کچھ نہیں ہی تو عداوت ہی سہی

ہو کہاں کی یہ بھلا دانا ئی کیوں ہو مرغوب تھیں تنہائی
 نہ جنونی ہوں نہ میں سودائی میرے ہونے میں ہو کیا بوائی
 اور وہ مجلس نہیں خلوت ہی ہی

عالم کن کو دستاں سمجھو اس سے ملتا ہی سبق انسان کو
 بھول کر غیر کا احسان نہ لو اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
 آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

ہو کہاں مثل شر اس کو قیام گرم رفتار یہ رہتی ہو صدام
 نہ توقف اور نہ دم بھر آرام عمر ہر چند کہ ہو برق خرام
 دل کے غول کرنے کی فرصت ہی سہی

رات دن عشق کا دم بھرتے ہیں رنج و ایزد اسے نہیں ڈرتے ہیں
 اُن پہ مرنے کے لیے مرتے ہیں ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں
 نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

شاد ہیں دور میں تیرے اجلاں اور ناشاد و حزیں ہیں اشرف
 اس قدر دین نہ ہو گی اسراف کچھ تو دے اور فلک نا انصاف
 آہ و فریاد کی فرصت ہی سہی

ہجر میں غم کو ترے پالیں گے داد بھی اس کی کبھی پالیں گے
جس طرح ہو گا یہ دن ٹالیں گے ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے

نئے نیازی تری عادت ہی سہی

کیا عجب ہو کہ وہ شہزادے آس کچھ کرے رحم ترس کھائے آس
یہی مرزا کی بھی ہوائے آس یار سے چھپڑ چلی جائے آس

گر نہیں مل تو حسرت ہی سہی

(۸۲)

آواز سے رات غیر سحر تک کسائیے دل کھول کر مذاق برابر کھائیے
پاک خموش مجھ کو جو چاہا کھائیے اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی چائیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے

بن کر فقیر میں ترے در پر اگر گیا در بان مجھ کو دیکھ کے غصے میں بھگیا
چپ چاپ ہیں جو تیری گلی سے گزر گیا دل ہی تو ہی سیاست در بان سے ڈر گیا
میں در جاؤں در سے ترے بے صدا کیے

آئی ہے پھر چین میں بہا بر خستہ پی اس میہمان کی مجھے خاطر عزیز یاد
قصہ ہوا ہوا نہ ہر ریائی کا آج طو کرتا پھروں ہوں خرقة و سجادہ بہن و

مَدّت ہوئی ہی دعوتِ آب و ہوا کیے

ہو دستیاب آدمی کو گرچہ عمرِ خضر لاکھوں ہی پائیں ایک نہ دو گرچہ عمرِ خضر

وانا کبھی نہ لے اُسے دو گرچہ عمرِ خضر بے صرفہ ہی گزرتی ہی ہو گرچہ عمرِ خضر

حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے

سچا امین اس کو سمجھتے رہے فہیم سب مال اس نے ہضم کیے بے ہوش نیم

اب وہ جواہرات کہیں ہیں نہ زرد نہ سیم مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ ای لیئم

تو نے وہ گنجھائے گراں مایہ کیا کیے

دن رات ہی ہماری بُرائی کی جستجو پھرتے ہیں مارے مارے تجس میں کو بکو

بہان اٹھاتے بہتے ہیں ہنگامِ گفستگو کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے حدو

کس دن ہمارے سر پہ نہ آ رہے چلا کیے

خرپڑی کہاں سے اُسے ہمتیں یہ خو ہرگز کسی حسین کو زیبا نہیں یہ خو

لٹاٹھا پیشتر تو نہ وہ مہمبیں یہ خو صحبت میں غیر کی نہ پُری ہو کہیں یہ خو

دینے لگا ہی بوسے بغیر التجا کیے

ہوں ہیں یوں تو اور بھی دنیا میں نازیں لیکن نہیں ہر سادہ دل ایسا کوئی حسین

ہمد میں تو اس کو کہوں گا نہ ہم نشیں صد کی ہی اور بات مگر غو بُری نہیں

بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے

صبرِ امانے عرضِ حال کا پایا جواب کیا لوگے تم اپنی بات کا اچھا جواب کیا
چاہو نہ تم جواب تو اس کا جواب کیا غالب تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

(۸۳)

وحشتِ اشرفیاتِ بہانِ خراب ہو مثلِ شررِ قیام کی یہاں کس کو تاب ہو
اس ہ گزریں جو ہو وہ پادرِ رکاب ہو رفتارِ عمر قطع رہ اضطراب ہو

اس سال کے حساب کو برقِ آفتاب ہو

ہیں نرم مویں ہنگِ نرالے بہار کے ہر جامِ پُر شرابِ گل تر ہو دیکھ لے
مُرخِ چین کا ہو بیڑی پر گماں مجھ مینا سے موی سر و نشاطِ بہار سے

بالِ تدر و جلوہ موجِ شراب ہو

تبادلِ کوشوقِ اک نگہِ التفات کا معلوم تھا نہ حال اُن آنکھوں کی گھات کا
طو ایک تیر میں ہوا قصہ حیات کا زخمی ہوا ہی پاشنہ پائے ثبات کا

نوبھانگے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہو

دہرِ خراب ہیں ہی خرابیات کی صفت مرنے ہو میکشوں کو تو مستوں کو تہنیت

جاگیر یہ وہ ہے کہ انھیں کوہی تو لیست جاداد یادہ نوشی زنداں ہو پیش بہت

خافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

نارِ نظر کو کرتی ہے اس کی چمک فنا اس پر نگاہ ڈالے کسی کو ہوتا کیا

اساں نہیں ہے مہرِ درختاں کو دیکھنا نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا

جوشِ بہارِ جلوے کو جس کے نقاب ہے

پہلے ہی کچھ تو شوق میں تھا حالِ دل نہیں دیدار سے تو اور بھی اس کا بڑھا جنوں

اب اور ہی کچھ اس کو تمنا ہے کیا کہوں میں نامِ راد دل کی تسلی کو کیا کروں

مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کا میاں ہے

بھڑتے ہیں پھول یوں تو لبِ راز دار سے مہرِ لہرِ گل مرے لیے کیا کم ہیں خاں سے

یہ اور بات چیت کرے اس نگار سے گزرا اسدِ مسرتِ پینا مِ یار سے

قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

۸۴

وہ اگر میری تمنا پر ترس کھا جائے ہے سامنے آنکھوں کے برقِ حسن چمکا جائے ہے

خود بخود آنکھوں کے آگے خیرگی چھا جائے ہے دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پر شک جائے ہے

میں اُسے دیکھوں بھلا کب ٹھ سے دیکھا جائے ہے

لا نہیں سکتی ہو ہرگز تابِ آتش کوئی شہ
ہوتے ہی دو آتشہ تیزاب ہو جاتی ہو
سوز پہناں بڑھ کے قصہ خود بخود کرے ٹکڑ
ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گوندیشے میں ہو

آگینہ تند ہی صہبا سے پگھلا جائے ہو

تھا مناسب کوئی تدبیر ایسی دشمن کی کہے
گفتگو میں تانا دہ ہر بار بے باکی کرے
کیوں نہ دل اس کا بڑھے جب دگرزاتی کہے
غیر کو کیونکر وہ یارب منع گستاخی کہے

گر جیابھی اس کو آتی ہو تو مٹا جائے ہو

صبر کب تک کچھے اور کب تک غم کھائیے
تا بکی حالِ دل پرورد سے دکھ پائیے
دل کو ضبطِ نالہ کی تدبیر کیا بتلائے
شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہو

کیا مسرت خیز ہو ای دوسرت تیری بزمگاہ
تو جہاں ہو پھر وہاں غم ہا نہیں سکنا ہو
واہ ہوتی ہو وہاں جا کر اگر کرتا ہوں آہ
دو چشم بد تری بزمِ طرب سے واہ واہ
نغمہ ہو جاتا ہو داں گر نالہ میرا جائے ہو

ہم یہ کب کہتے ہیں ظاہر ہو کوئی اندازِ عشق
یا ہمیں دنیا کہے وارفہ و جانبِ عشق
کیا کریں جب بدحوای اپنی ہو غمازِ عشق
گرچہ ہو طرزِ تغافل پر وہ دایرِ عشق
پر ہم ایسے کھوے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہو

دشمنوں کے حال پر وہ آج کل ہو مہرباں کچھ ہماری بھی سنے اتنی اُسے فرصت کہاں
وہ ہو اور آٹھوں پہراغبار کی دلہاریاں اس کی بزم آریاں سنکر دلِ بنجور یہاں
مثل نقشِ مدعائے غمیرہ بیٹھا جائے ہو

اک تو قدرت ہی نے اس کو ناز نہیں پیدا کیا اور اس میں تھا ہی کیا ناز و نزاکت کے سوا
اور سونے پر مہیا کا عشق کا انا ہوا ہو کے عاشق وہ پری سرخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہو جتنا کہ اڑتا جائے ہو

دیکھیے تصویر کی آنکھیں بھی افسوں ساز ہیں اور عشقِ لب میں ظاہر جو ہر اعجاز ہیں
اللہ اللہ ایک کھینچنے میں بھی سوا انداز ہیں نقش کو اس کے مصوٰر پر بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہو جس قدر اتنا ہی کھینچتا جائے ہو

رکتے ہیں مرنے سے احبابِ وطنِ انصاف دیکھیے اس سبکی کی بھی کہیں ہوتی ہو حد
پیرہنتی لائی ہو کیا رنگِ اذلہ الصفا سایہ میرا مجھ سے مثل دو و بھاگے ہو اسد
پاس مجھ آتشِ بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہو

۴۵

جان شادی کی تننا میرے آبِ گل میں ہو کچھ تننا اور ہی لیکن دلِ بسمل میں ہو
کیا کروں تدبیرِ ریبِ جانِ اک مثل میں ہو سادگی پر اس کی مرجانے کی سرٹل میں ہو

بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کف قاتل میں ہو

دل سے دل کو راہ ہو مجھ کو یقیں ہرگز نہ تھا گفتگو کی آج کچھ اس نے تو عقدہ کھل گیا

کوئی میرے جی سے پوچھے اس کی باتوں کا مزا دیکھنا تقصیر کی لذت کہ جو اس نے کہا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میسے دل میں ہو

قطع مجھ سے کر چکے وہ دوستی کا سلسلہ اُن کی بزمِ عیش کے قابل کہاں میں غمزدہ

پھر بھی ہر دم کچھ نہ کچھ رہتا ہی میرا تذکرہ گرچہ ہو کس کس بُرائی سے ولے با اینہم

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہو کہ اس مغل میں ہو

تو اگر چھا جائے گی ہم پر مصیبت ٹھائے گی جب نہ ہوگا شغل دل پر اک قیامت آئے گی

زندگانی بے مزہ کر کے مزا کیا پائے گی بس ہجوم نا اُمیدی خاک میں مل جائے گی

یہ جو اک لذت ہماری سچی بے حال میں ہو

ہم تو کرتے سر کے بل چل کر رہے مقصود طو بیٹھنے کا ضعف کرتا ہی تقاضا پڑی بہ پڑی

پاؤں نے پکڑی زمین بنجیر پا ہو کوئی شو رنج رہ کیوں کھینچے واما ندگی کو عشق ہو

اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہو

دل قیبیہ وسیع کا عیش کی منزل سہی ہم نے لومانا کہ ہم جلنے ہی کے قابل ہی

سوزِ غم رگہائے تن میں خون کے شال سہی جلوہ زار آتش و دُرخ ہمارا دل سہی

فتنہ شور قیامت کس کے آپ گل میں ہو

تھا تو نے نزدیک منزلِ قابلِ قہر و عتاب پھر کیا اک بے گنہ کو کیوں گرفتارِ عذاب
اس مصیبتِ کمال اس کو کہ حالتِ ہو خراب ہو دلِ شوریں غالبِ طلسمِ بیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہو

(۸۶)

خالی نہ تیری چشمِ کرم کی نظر گئی چکی مثالِ برقِ ادھر آئی ادھر گئی
سینے ہی تک نہ صرف یہ آکر گزر گئی دل سے تری بجھا ہر گرتاک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی

وہ دورِ جامِ محو ہو نہ وہ محو پرستیاں وہ بزمِ دل رہا ہو نہ ساقیِ دلستاں
مرفوش کہاں خمار سے ہیں اب تو سرگراں وہ بادِ شبانہ کی سرستیاں کہاں
اُٹھئے بس اب کہ لذتِ خواب سحر گئی

ات سے آرزو تھی دل بے قرار میں پر ہوں تو اڑ کے جا پیے بزمِ نگار میں
رکھ بیٹھ گیا ہوں میں اس رہ گزار میں اڑتی پھرے ہو خاکِ مری کوئے یار میں
بارے اب اسی ہوا ہو بس بال و پر گئی

بلکہ لہجائے ہم کو نہ پر وازِ نقشِ پا گھر کر رہا ہو دل میں ہر اک نازِ نقشِ پا

دلکش ہو گیتی طرزِ فسوں سا نہ نقشِ پایا
دیکھو تو دل فریبی اندازِ نقشِ پایا

موجِ خرامِ یار بھی کیا گلِ کستری گئی

تھی خاص یہ روش بھی مردانِ کار کی
یہ وضع ہر وضع نے اب اختیار کی

جانی رہی تمیز ہی اغیار و یار کی
ہر بواہوس نے حسنِ پرستی شعار کی

اب آبروئے شیوہ اہلِ نظر گئی

عالم ہی اور ہی ترے حسنِ شباب کا
شکل ہو دیکھنا رخِ پیر آب و تاب کا

بے سود و رایگاں ہوا اٹھنا حجاب کا
نظارہ نے بھی کام کیا وہاں نقاب کا

مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

جانا وہ مجھ سے ہاتھ چھڑا کر غضب ہوا
ہر چند تم نے وعدہ فرما کیا تو کیا

دُشوار ہو گیا دل مضطر کا تمنا
فردا و دسی کا تفرقہ یکساں بارش گیا

کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

موتِ نہا کی طرح دیکھتے تھے شادماں تمہیں
پیری میں بھی جہان نے پایا جواں تمہیں

لیکن غمِ دالم نے کیا خستہ جاں تمہیں
مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں

وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

(۸۷)

رہنے کو کیا بُرا ہے جو جنت میں گھر لے
پھر تو جہاں جہاں ہو وہاں تو اگر لے
آرام دل کو جلوہ رخ دیکھ کر لے
تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوق لڑ لے
عورانِ خلد میں تری صورت گر لے

اس طرح کر چپا کے قبر دفن بعدِ قتل
طاہر نہ ہو ہوا ہو کہ ہر د فن بعدِ قتل
قاتل اگر ہو تو نظر دفن بعدِ قتل
اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر لے

بھولا ہی پیکی بھی تو وفاداری قدیم
ایسا گیا کہ جا کے وہیں ہو گیا مقیم
ظالم کے انتظار میں ہو حالِ دل ستیم
تجھے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر لے

مشہور ہو جہاں میں اثر جذبِ عشق کا
صحرا میں کھنچ کے ناقہ لیلیٰ چلا گیا
اُس جذب کا ہمیں نہیں بے وجہ ادعا
تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غم نہاں سے گر لے

ٹوکی ہیں اُن کے ساتھ بہت ہم نے منزلیں
لیکن نہ پیشرو کبھی مانیں گے ہم آہنیں
اس رہ میں راہبر کی ضرورت نہیں ہیں
لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں

مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

نام خدا تم آج ہو ساقی جامِ جہنم اغیار اور حریف ہیں اس بزم میں ہم
دیتے ہو ہم کو موت و نہا کسی سے کم ساقی گری کی ہنرم کرو آج ورنہ ہم

ہر شب پیا ہی کرتے ہیں جو جس قدر ملے

موت ہوئی ہمیں ہنر نہا کا کچھ پتا اس آستان کے خاک نشینوں میں بھی تھا
وہ بھی وہیں لے گا جہاں ہو گا رہنا اسی سا کہان کو چہ دلدار دیکھنا
تم کو کہیں جو غالب آشفہ سر ملے

*

(۸۸)

اس طرف کچھ نا توانی اور ہو افس طرف زعم جوانی اور ہو
گرہنی نا مہربانی اور ہو کوئی دن گر زندگانی اور ہو
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہو

میرے سینے پر ہو گلخن کا گماں ہو زبانِ شمع کی صورتِ زباں
کہا بتاؤں اپنے دل کی گرمیاں آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غمہائے نہانی اور ہو

ہنشیں ان سے سفاقت کیا کریں حکم یہ ہو نام بھی میرا نہ لیں

کیجئے اب کس طرح راضی انہیں بارہا دیکھی ہیں ان کی رہنمائی

پر کچھ اب کے سرگرائی ادھر

ایچی کو کیا زوال اور کیا خطر صاف کہہ دے گا بیان ہی ہوں اگر

ہو رہا کیوں تامل اس قدر دے کے غمناک دیکھتا ہے نامہ بر

کچھ تو پہنچاں زبانی اور ہو

دور میں ہیں چرخ گرداں پر نجوم رات دن ہیں دائرہ محور نجوم

دہر میں ہیں وجہ خیر و شر نجوم قاطع اعمار ہیں اکثر نجوم

وہ بلائے آسمانی اور ہو

اچھا ہے غم تریب اختتام ٹوٹے دالا ہو کوئی دم میں ام

منتظر رہتا ہے صبح و شام ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام

ایک مرگ ناگہانی اور ہو

(۸۹)

کچھ دہاں کی خبر نہیں آتی کیوں صبا راہ پر نہیں آتی

کوئی تدبیر کر نہیں آتی کوئی اُمید بر نہیں آتی

کوئی صورت نظر نہیں آتی

چرخِ آزار کے ہو کیوں درپڑی چین دیتا نہیں مجھے ہی، ہی
 ہوتی ہو اپنے وقت پر ہر شے موت کا ایک دن معین ہی
 نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

دل ہی جب گم ہو دل لگی کیسی پاس تھا جب تو کچھ اُننگ بھی تھی
 کچھ ہیں اب تو ہو گئے رُمٹی آگے آتی تھی حالِ دل پر مٹی

اب کسی بات پر نہیں آتی
 حسن بندوں کا ہو ریاضتِ زہد ہندگی اور نیک سیرت و زہد
 زیورِ عبد ہو عبادتِ زہد جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد

پر طبیعتِ اِدھر نہیں آتی
 ہونے دو حسرتوں کا دل میں غم وہ بگڑ جائیں گے اگر کہدوں
 اپنے دل میں ہو اور ہی مضمون ہو کچھ ایسی ہی بات جو چپٹیں
 ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

میرے نالے کہیں ٹھہرتے ہیں جا کے روز ان کے کان بھرتے ہیں
 خوش تو ہیں وہ مگر مگرتے ہیں کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں
 میری آواز گر نہیں آتی

دُکھ سے فرصت جو میں ذرا پاتا چیر کر سینہ تجھ کو دکھلاتا
عقل ہوتی تو خود سمجھ جاتا داغِ دل گر نظر نہیں آتا

بو بھی اس چارہ گر نہیں آتی

اوشکایتِ عبثِ تغافل کی کیا کہیں کچھ خبر نہ اس نے لی
جب ابھی خود خبر نہیں اپنی ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

روز کے غم سے جان پر پہنچی یارب اس سے نجات کب ہوگی
ہو گیا سیرِ زندگی سے جی مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہی پر نہیں آتی

ہوش میں تم جو آؤ گے غالب پسند مکرنا اسے پاؤ گے غالب
حق کو کیا منہ دکھاؤ گے غالب کہے کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرمِ تم کو مگر نہیں آتی

❖
(۹۰)

نالہ و آہ میں دھرا کیا ہے حاصلِ گریہ و بُھکا کیا ہے
اس تڑپنے سے مدعا کیا ہے دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہو یہاں دل کو شوقِ جلوہ یار اور وہاں پر وہ مایہ دیدار

ان کو ہی بات بات پر انکار ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار

یا الہی یہ ماحیرا کیا ہے

غیر کب تک کہے گا حالِ دروں آپ کب تک سنیں گے مضمون

ہو چکی انتہائے ضبط و سکون میں بھی منہ میں زبان کھتا ہوں

کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

کہتے ہیں واقفانِ غیب و شہود ایک ہیں عبد و عابد و معبود

آخر ان کا ہی اس سے کیا مقصود جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجد

پھر یہ ہنگامہ ادا کیا ہے

جگھٹے کیسے عاشقوں کے ہیں اور معشوق کس کو کہتے ہیں

حسن کے پھر یہ کیسے جلوے ہیں یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں

عشوہ و غمرہ و ادا کیا ہے

ایک سے ایک نازیں کیوں ہے دام بردوش ہر حسین کیوں ہے

فکرِ صیدِ دلِ حسنین کیوں ہے شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے

ہنگمو چشم سرمہ سا کیا ہو

کس لیے پھول رنگ لاسے ہیں کیوں یہ لالے نے دل کھائے ہیں

کس نے یہ تازہ گل کھائے ہیں سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں

ابر کیا چسپز ہو ہوا کیا ہو

ہیں محبت کے بھی نرالے بھید آہ نغمہ ہو اس میں نالہ نشید

یاس کو خرٹ اور اجل کو نوید ہم کو ان سے وفا کی ہو امید

جو نہیں جانتے دغا کیا ہو

دیکھ کسی کو دیا تو کیا ہو گا تیرے حق میں بہت بُرا ہو گا

بد نتیجہ بُرائی کا ہو گا ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا

اور درویش کی صدا کیا ہو

کب یہ مکر اختیار کرتا ہوں کب دُعا بار بار کرتا ہوں

طرز دشمن سے عار کرتا ہوں جان تم پر نثار کرتا ہوں

میں نہیں جانتا دُعا کیا ہو

فصل موشا ہو گود ہیں غالب شعر کہتا ہو دلنشیں غالب

ہو مگر رند بالیقین غالب میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب

مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہی

(۹۱)

ای چارہ گرو تم انھیں سمجھا کے تو ہو گئے اور ساتھ لیئے قرن آمد بھی ہو گئے
اظہارِ تمنا سے مگر بات ہی کھو آئے کہتے تو ہو تم سب کہ بہتِ غالب ہو گئے
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہہ دو آئے

احسانِ اجل ہی جو ذرا دے مجھے مہلت ہو اس کے نظارے کی تمنا دمِ جلت
وہ دیکھ تو لے آنکھ سے اپنی مری حالت ہو کشتکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت
کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے دیکھنے کو آئے

آکر مرے گھر بھی وہی وحشت ہو وہی رم آتے ہی اجازت کے تقاضے ہوئے ہم
میشکل ہو قیامِ ایک جگہ کا انھیں اگم ہو صاعقہ و شعلہ و سیلاب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں میری آنا نہیں گئے

تربت میں مری آ کے نہ بھاگینگے نکیرین مردہ بھی مجھ پا کے نہ بھاگینگے نکیرین
پریش سے بھئی کتا کے نہ بھاگینگے نکیرین ظاہر ہو کہ گھبرا کے نہ بھاگینگے نکیرین
ہاں منہ سے مگر بادہ ووشینہ کی ہو آئے

ہیں تیغِ بکف کون جو پھرتے ہیں اکڑتے یہ کون ہیں جو وعظ میں دنیا سے ہیں لڑتے

در پردہ کوئی اور ہی ہم کس سے بگڑتے جلا دے طرے ہیں نہ واعظ سے بھڑکتے

ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

ہم ہوں تو ہر انسائیں دے طعنہ نایافت ہاں اہل طلب کون سنے طعنہ نایافت
ہم کم ہوئے اور ختم ہوئے طعنہ نایافت ہاں اہل طلب کون سنے طعنہ نایافت

دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھوئے

ہم وہ نہیں نکامیوں کے نام سے بیٹھیں اندیشہ مایوسی انجام سے بیٹھیں
رج سفر و سختی احرام سے بیٹھیں اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں

اس در پر نہیں یا تو کیسے ہی کو ہو آئے

اُس شوخ کے لانے کی تو کرنے گئے تدبیر اور واں ترے رونے کی لگے کھینچنے تصویر
دوبنی ہوئی تقدیر سے اُلٹی ہوئی تاثیر کی ہم نفسوں نے اثر گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے

ک لطف ہاں عید کا دن ات ہی غالب کیا جلسہ یا ران خوش اوقات ہی غالب
منا کے لیے وہ در حاجات ہی غالب اس انجمن ناز کی کیا بات ہی غالب
ہم بھی گئے واں ادتری تقدیر کی دوائے

(۹۲)

جب سے رنگِ بہار طاری ہو کچھ عجب کیفیت ہماری ہو
پھر ہوشِ چشم تر سے جاری ہو پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہو

سینہ جو بائے زخمِ کاری ہو

پہلے بیکارِ محض تھا ناخن اب مگر کام دے گیا ناخن
داغِ دل کی طرف بڑھا ناخن پھر جگر کھودنے لگا ناخن
اب فصلِ لالہ کاری ہو

پھر عبادت کا ہو نیا انداز اور ہی سمتِ رخ ہو وقتِ نماز
سُن کے ناقے کی دل ربا آواز قبلہ مقصدِ نگاہِ نیاز

پھر وہی پردہِ عمارتی ہو

ہو کے گاہک بنے ہیں سودائی دیدہ و دل کو کچھ نہ سیدہ آئی
رہ گئی ان کی ساری دانائی چشمِ دلال جنسِ رسوائی

دل خریدارِ ذوقِ خواری ہو

مل کے دونوں نے ہو یہ ٹھہرائی ایک عالم بنے تماشا ئی
دونوں ذلت کے ہیں تنائی وہ ہی صد رنگِ نالہ فرسائی

وہ ہی صد گونہ اشکباری ہو

تنگ ہوں ہجر جاں گداز سے پھر عشق ہی اس قدر دہراؤ سے پھر

مست ہوں چشمِ نیماؤ سے پھر دل ہوا ہی خرامِ ناز سے پھر

محشرستان بے قراری ہو

حُسن پھر ترک تاز کرتا ہی پھر درِ فتنہ باز کرتا ہی

نُونِ اہلِ نیاز کرتا ہی جلوہ پھر عرصِ ناز کرتا ہی

روز بازارِ جاں سپاری ہو

لاکھ صدے نئے گزرتے ہیں جان اُس پر نشان کرتے ہیں

پھر دم اُس پُر دغا کا بھرتے ہیں پھر اُسی بے وفا پر مرتے ہیں

پھر وہی زندگی ہماری ہو

ن

اے ہیں دادخواہ اہلِ نیاز ہیں جفا پیشہ گوشِ بر آواز

ظاہر ایسے گئے حسنِ عشق کے راز پھر کھلا ہی درِ عدالتِ ناز

گرم باز اور فوجِ مداری ہو

ہر زبِ بدست ہو گیا ہی شیر زیرِ دستوں کو کر رہا ہی زیر

عدل و انصاف میں نہ کیوں ہو دیر ہو رہا ہی جہان میں اندھیر

زلف کی پھر سر مشتمل داری ہے

پھر کیا دل نے یوں بیاں احوال رو دے سن کے حاکم و عمال

سیر اجلاس پھر ہی قال و مقال پھر دیا پارہ حب گرنے سوال

ایک فریاد و آہ وزاری ہے

ابھی ثابت نہیں جفا کا سبب نہ ابھی ہی ثبوتِ قہر و غضب

دیکھیے ہو معاملہ طو کب پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب

اشکباری کا حکم جاری ہے

عشق انصاف پر اگر آیا بال کی کھال ہی رنگالے گا

دیکھیے اس کا ہو نتیجہ کیا دل و نرگاں کا جو مقدمہ تھا

آج پھر اس کی رو بکاری ہے

ہی یہ مضر اکو تو یقین غالب ہوئے منلوب تم کہیں غالب

دل گیا ہی کوئی حسین غالب بے خودی بے سبب نہیں غالب

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

(۹۳)

کی سرکشی تو فرطِ ندامت سے خم ہوئے اپنی قسیوں سے نخل دم بدم ہوئے
حد سے بڑھے تو موردِ رنج و الم ہوئے بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

لالے پڑے ہوئے ہیں ہمیں اپنی جان کے کب تک ہیں گے دیکھیے ظلم آسمان کے
چکھے نہ ہم نے کچھ بھی مزے اس جہان کے پہناں تھا دامِ سختِ قریب آسمان کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

اب کیا میں پہلے کیا تھے یقینہً طویل ہو ہم ہیں بھی کچھ اسی میں بھی قال و قیل ہو
ہر روز انحطاط ہو مہلتِ تسلیل ہو ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہو
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

مستور پر وہ لائے خفا میں ہیں اس قدر آنکھوں کے سامنے ہیں اور آتے نہیں نظر
گویا گئے ہیں ہستی موہوم سے گزر سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہو کیا خبر
وہ لوگ فتنہ رفته سراپا الم ہوئے

وہ کون ہو کہ جس نے ستایا نہیں ہمیں حیراں ہیں تیرے سامنے کس کس کا نام لیں
کیا کہیے جو فلک نے نکالی ہیں کاوشیں تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہریں

تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے قسم ہوئے
 گوجرم عرضِ حال میں کافی گئی زباں
 چھوڑا مگر نہ حسرتِ دل کا بھی بیاں
 تحریر بھی کیا کیئے وحشت کی داستان
 لکھتے رہے صوفیوں کی حکایاتِ خونچکاں
 ہر چند اس میں باتھ ہمارے قلم ہوئے
 یالبت ملک پہنچے ارادے تھے عشق کے
 یا گھٹکے دل میں رہ گئی سب جوصلے گھٹے
 ڈر سے کیا تباہ و فنا خود کو آہ نے
 اللہ سے تیری تندہی جو جس کی ہم سے
 اجزا رنالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے
 ہو کس طرح سے کوئی فرومایہ فردِ عشق
 دشمن کا حوصلہ ہو کہ سہ جائے درِ عشق
 ہوتا ہو کوئی جان چرا کر بھی مردِ عشق
 اہلِ ہوس کی فسخ ہو ترکِ نبردِ عشق
 جو پاؤں اٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے
 مجبور کر دیا ہو و دیت سے یار نے
 آنا پڑا وجوہ میں گویا اسی لیے
 ہوتا بھرا ہوا جو نہ دل دم نہ مارتے
 نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
 جو اوں نہ کھنچ سکے وہ یہاں آکے دم ہوئے
 دل کو لگی ہوئی تھی یہاں صحنِ جویش کی
 اور دل لگی کی بھی ہمیں عادتِ قدیم تھی
 صحرانِ طبعِ آن رسیِ مفسی میں بھی
 چھوڑی آسنا ہم نے گدائی میں ل لگی

سائل ہوئے تو عاشق اہل کرم ہوئے

❦

(۹۴)

گھر گھر نشاط و عیش کا جوش و خروش ہو بزمِ طرب کیں ہو کہیں ناؤ نوش ہو
اور یہاں دُورِ غم سے پراگندہ ہوش ہو ظلمتِ کدہ میں میسے شبِ غم کا جوش ہو
اک شمع ہو دلیلِ سحر سو خموش ہو

ہو چونکہ دردِ ہجر میں دنوں کا ایک حال ممکن نہیں کہ ایک سے ہو ایک کو طلال
باہم نہیں ہو رشکِ حسد کا کوئی خیال فی مَرَدُہ وصال نہ نظارہ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہو

کم کر دیا ہوش نے ساقی کا اجتناب سرکا ہو آج رخ سے ذرا گوشہ نقاب
وہاں سے ہو دیدہ مشتاق کامیاب مرنے کیا ہو حُسنِ خود آرا کو بے حجاب
ای شوق ہاں اجازتِ تسلیم ہوش ہو

اس کے گلے کا بار جو دِشیں ہوا گویا صدف کا اختِ قسمت چمک گیا
اک شک و رہی ہو صدف کا تو ذکر کیا گوہر کو عقد گردنِ خواہاں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارہ گوہر فروش ہو

ہو شکر کی جگہ کہ نہیں ہم وہی پرست ڈاگھوٹ میں جن میں نہ ہے ہوش پاؤ دست

اچھا کیا تمھارے تصور نے بند و بست دیدار بادہ حوصلہ ساقی نگاہ مست
بزم خیال میکدہ بے خروش ہو

ن

کرتی تھی مجھ کو قلت می یا تو مضحل یا اب خیال بادہ کشی بھی ہو جاں گسل
کردار سے ہوں اپنی پشیمان منفصل اے تازہ واردان بساطِ ہوائے دل
ز نہار اگر تھیں ہوس ناؤ و توش ہو

مجھ کو کچھ آپ اپنے اگر خمیر خواہ ہو سنبھلو ذرا جو طالب امن و پناہ ہو
تم بھی کہیں نہ میری طرح سے تباہ ہو دکھیوں مجھے جو دیدِ عبسرت نگاہ ہو
میری سُنو جو گوشِ حقیقت نبوش ہو

اس بزم میں نہ پاؤ گے کچھ غیر گری جاتی رہے گی عقل سراسر رہی سہی
مجھ پر گزر چکی ہو جو میں نے تھیں کہی ساقی بجلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطرب نہ نہ رہن تمکین و ہوش ہو

کہتے ہیں جس کو اہل جہاں محفل نشاط اک خواب خوش سے بڑھکے نہیں میں بل نشاط
روشن کو اس کی لفظ بہ لفظ ہو انحطاط یاشب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط
دامان باغبان و کف گل فروش ہو

چاروں طرف لفظ چائے پئے ہو رنگ
بجنا ہی شور قفل میں سا سے جل ترنگ
اودل میں اہل بزم کے اک بوش ارا رنگ
لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ
یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوشتش ہی

ای انساط ویش کا منظر تو بزم میں
پیدا ہی لطف گردش ساغر تو بزم میں
کچھ نیست کا مزہ ہی میسر تو بزم میں
یا صبح و دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
ذوہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہی

حالت ہی اور کچھ نظر آتی ہی بزم کی
روقت ہی اس جگہ بھی گویا ہوئی نہ تھی
نخل جو تھی بھری ہوئی سنسان ہو گئی
داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہی سو وہ بھی تموش ہی

تہنرانے کی نہ کوئی کمی عرض خالی ہیں
تا ہو نہ ہستا کوئی مے کے وبال میں
اک در دہی بکھرا ہوا اس کے تعال میں
آئے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

غالب صریح خامہ نوائے سروش ہی

(۹۵)

انہیں ان کو نقیب چاہ کا میری نہ ہی
جان لیکر بھی اگر قدر نہ کچھ کی نہ ہی
وہ جو کہتے ہیں ہمیں جان نہیں ہی نہ ہی
نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ ہی

امتحان اور بھی باقی ہی تو یہ بھی نہ سہی

میرے حصے میں نہیں گل نہ سہی خار تو ہو
دل میں اک صورت یاوگل و گلزار تو ہو
گو مسرت سے ہوں محروم غم یا تو ہو
خار خار الم حسرت دیدار تو ہو
شوق گلچین گلستان تسلی نہ سہی

کیا کوئی فرض ہی ہر روز آئے ہی بنے
اپنے ہاتھوں سے ہمیں جام پلائے ہی بنے
وہ نہیں ہونے ہو مگر آج اڑائے ہی بنے
میرے ہرستاں غم کو منہ سے لگائے ہی بنے
ایک نگر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

اپنے دیوانے کی گو اس نے نہ کی قدر تو کیا
جوش و خروش دیا اس کا ستارہ چمکا
اپنی آنکھوں کا بیاباں نے بنایا تارا
نفس قیس کہ ہے چشم و چراغ صحرا
گر نہیں شمع سیہ خانہ لیلی نہ سہی

روکتے ہیں مجھے احباب فدا و نجات
ہر گھڑی جب مجھے گھوٹیل تو نہ کیونکر ہر گھڑی
سازِ عشرت ہی نہیں باعثِ رونقِ مطلق
ایک ہنگامہ پہ موقوف ہو گھر کی رونق
نوحہ غم ہی سہی نغمہ شادی نہ سہی

دیدہ عقل پہ حاسد کے پڑا ہی پروا
کر دیا ہی مرضِ رشک و حسد نے اندھا
مطلب پنا آئے سمجھاؤں بھی تو حاصل کیا
نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

کہ نہیں ہیں مرے اشعار میں مستی نہ ہستی

تم سے مرزا جو کہیں اس کو نصیحت سمجھو
ہیں جو ہمدرد تو یہ ان کی عنایت سمجھو

پیش جو آئی ہی بہتر یہی حالت سمجھو
فصحت صحبتِ خواہاں ہی غنیمت سمجھو

نہ ہوئی غالب اگر عسرِ طبیعی نہ ہستی



(۹۶)

کبھی کیا تھا نہ ظالم نے اس طرح کرم آگے
ہمارے سائے سے پہلے تو کرتا تھا وہ دم آگے

نہ کی تھی تیغِ سیر قل گاہ یوں علم آگے
عجب نشاط سے جلا دے چلے ہیں ہم آگے

کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے دو قدم آگے

مرے ہی جھلے ہیں آئے زمانے کے غم و کلفت
مرے ہی اسطے پیدا ہوئے ہیں ماتم و حسرت

خراہوں سے زمانے کی ہی کہاں مجھے فرصت
دُھانے تھا مجھے چاہا خراب بادہ الفت

فقط خراب کھا بس نہ چل سکا تم آگے

ہمارے دل کی شادی غمِ فراق نے ہستی
بسی بسائی ہوئی حسرتوں کی اجڑی ہو بستی

کچھ اب تو ہمت و طاقت میں تھری تھی بستی
غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عیش کی مستی

وگر نہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

بتائیں کیا کہ تنہا ہمارے دل کی ہو کیا
لگی ہو دھن کہ شیں خود جواب کچھ نہ کچھ اس کا

دیباہی نامہ مگر دل کو ہر کچھ اوہی سہوا خدا کے واسطے داد اس جنون شوق کی دینا

کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ برسے ہم آگے
 تمہارے چھونے سے ترغے میں آگے ہیں بلا کے
 تمہارے پھنسنے میں آگے نہ جیتے جی کبھی چھوٹے
 ہمارا دل ہی کچھ ابجھا ہوا تھا کیا کہیں تم سے
 یہ عمر بھر جو پریشنا نبیائے ٹھائی ہیں ہم نے
 تمہارے آئینہ ای طرح ہائے خم بہ خم آگے

بہت دنوں تو ہم اس امر کے بہت سے دیو ہم اشکوں پہ بہا ہیں کہ قصہ ہی کہیں ٹو
 ابلہ ہی ہستی کا عقدہ کھلا کہ یہ ہر کسب اشو دل و جگر ہیں افشاں جو ایک شجہ غوں ہر

ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے
 وہ اشک تم مژدرا میں کب بہاتے ہیں غالب غصیب ہونے کی میرے خوشی نہاتے ہیں غالب
 ملائے خاک میں ٹھک کہاں وہ آتے ہیں غالب قسم جبارہ پر آنے کی میرے کھاتے ہیں غالب
 ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

(۹۶)

آہ کرنے سے غصیب اس کا سوا ہوتا ہر انا کہ کرتا ہوں تو سرگرم جھٹا ہوتا ہر
 لب ہلا نا سبب ترک و فنا ہوتا ہر شکوے کے نام سے بے مہر خطا ہوتا ہر
 یہ بھی منت کہہ کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہر

تنگ ہوں کب تک ٹھاکروں میں جو رہا
کو نسا ظلم ہی جو آپ نے مجھ پر نہ کیا
بے سبب تو نہیں اشکوں کا مے تار بنھا
پڑ ہوں میں شکوے سے یوں آگ سے جیسے باجا

اک ذرا چھپیر پیسے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

دل غم دوست کی ہو چین تمنا یہ تو
ہم جو شاکی ہوں تو وہ اور ستائے ہم کو
کاش آگاہ وہ اسرار شکایت سے نہ ہو
گو سمجھتا نہیں پر حسن "تلافی" دیکھو

شکوہ جو رستے سرگرم جھٹا ہوتا ہے

کر دیا روز کی گردش نے اسے خستہ حال
پاؤں بھی اب تو اٹھانا ہو اسے سخت محال
ہو گیا خلون کو اندازہ رفتار محال
عشق کی راہ میں ہی چنچ مکو کب کی وہ چال

خستہ و جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

ہم یہاں تک کہ ہوئے خواہ گریہ اور وستم
دیر ہوتی ہی جفاؤں میں تو ہوتا ہی الم
دل کو تو تازہ جراحات کی خواہش پیہم
کیوں نہ ٹھہریں ہر تِناؤ کب بیدار کہ ہم

آپ اٹھالاستے ہیں گریہ خطا ہوتا ہے

بخت برگشتہ نے لینے ہی نہ دی ہم کو پناہ
رکھتے اور کاش نہ ہم اپنی بھلائی پہ نگاہ
کام سب نئے تدبیر سے ہوئے اپنے تباہ
خوب تھا پہلے ہی سے ہوتے ہم اپنے بدخواہ

کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

ڈر سے شکوہ نہیں کرتے ہیں کہ ہو ترکِ ادب نا توانی کی ہی آخر کوئی حد بھی یارب

نارِ نالی بھی ہے دشوار دمِ رنج و تعب مالہ جاتا تھا پرے عیشِ بریں سے اور اب

لب تک آنا ہی جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

طبعِ قدرت نے مجھے دی ہے عجب جاوِ فن میں جو چاہوں سرقطاس کھلا دوں گلشن

راگ لاسکتا ہے کیا چھ سے کوئی مرغِ چین خامہ میرا کہ وہ ہے بارِ بدِ بزمِ سخن

شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

ذات کو تیری کیا حق نے پناہِ عالم تیرا سا پسِ مخلوق پہ ہے ابروِ کرم

اہلِ دنیا کو ترے فیض سے ہے عیشِ بہم او شہنشاہ کو اکب سپہ و مہرِ علم

تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

معضِ افسانہ ہیں شاہانِ سلف کے قصے بیچ ہیں شوکتِ اقبال میں تیرے آگے

کچھ ٹھکانا ہی بھلا جاہ و چشم کا تیرے ساتِ اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے

تو وہ لشکر کا ترے فصل بہا ہوتا ہے

اگر دیکھتا ہے ترے دیکے فلکِ ہی یہ حال ذرہ ذرہ ترے دروازے کا خورشیدِ مثال

ماہِ کمال کو جیسے سائی میں حاصلِ ہیکال ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال

استاں پر سے مہِ ناصیب ہوتا ہے

بند ہیں مرغِ چین مجھ سے خوش الحانی میں کچھ نہ کچھ نغمہ سرا ہوں جو پریشانی میں
ہو ترا لطف مدِ طبع کی جولانی میں میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزلِ خوانی میں

یہ بھی تیرا ہی کرمِ ذوقِ منزا ہوتا ہو

کہیے کیا چرخِ تنگوار کو ہی نا انصاف ذکر کیا غیر کا اپنے بھی ہیں مہترا کے خلاف
کوئی ہمدرد نہیں قاف سے لیکر تا قاف رکھو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف

آج کچھ دردِ مرے دل میں سوا ہوتا ہو

*

(۹۸)

ہلائے دہراؤ بے باکیوں کی خو کیا ہو ٹھکرائے سامنے انسان کی آبرو کیا ہو
کلامِ ہشک یہ دشمن کے روبرو کیا ہو ہر ایک بات پہ کہتے ہو غم کہ تو کیا ہو
تجھیں کہو کہ یہ اندازِ گفت گو کیا ہو

نگاہِ گرم سے ظالم نے جس کو دیکھ لیا جلا کر اس کو کیا خاکِ دم میں سرتاپا
کمال یہ ہے کہ کرتا ہو آگ سے ٹھنڈا نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا

کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہو

برائیوں کے ہماری سبق ہزار وہ دے یقین ہو کہ نہ فقروں میں آؤ گے اس کے
خیال اس کا نہیں ہی کہے وہ جو چاہے یہ رشک ہو کہ وہ ہوتا ہی ہم سخنِ تم سے

وگر نہ خوفِ بد آموزی عدو کیا ہی

نہ دے گا کامِ رفوگر یہاں ترا کچھ فن
اٹھا کے طاق میں رکھ اپنے رشتہ و سوزن
سرسبک چشم کے تاروں سے جل چکا دامن
چپک رہا ہی بدن پر لہو سے پیرا ہن

ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہی

رہا نہ تن ہی تو دل کا کہاں پتا ہوگا
یقین ہی جسم سے پہلے ہی مٹ چکا ہوگا
سوائے خاک یہاں دستیاب کیا ہوگا
جلا ہی جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کر دیتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہی

غلط کہ رہتا ہی جو پائے فخرِ قاتل
کہیں گے ہم تو کہ ہی اس کی دھڑلا حائل
ہمیں ہن شک میں گل گل کے کیا جگر کیا دل
رگوں میں دھڑلتے پھرنے کے ہم نہیں قائل

جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہی

جو ہی تو فرقہ زہاد کو ہی اس کی تمیز
کہ کس کو کہتے ہیں غلمانِ عو رہی کیا چیز
ہمیں غرض نہیں کوئی عنادِ مہو کہ کنیز
وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشتِ عزیز

سوائے بادۂ گلفام و مشکبو کیا ہی

چڑھا کے ساغر و مینائے مرنہ ہوں سرشار
سبو بھی منہ سے نکا کر نہ سیر ہوں زہن ہار
یقین کیجئے میں نام کا نہیں مریخوار
پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دوجار

پیشینہٴ وقتِ دُکوزہ و سبوحیا ہے

ہمارے حال پران کو کہیں نظر ہو بھی اور التفاتِ مریضِ فراق پر ہو بھی
نیچہ خاک نہ ہو گا اگر خسبر ہو بھی رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی

تو کس اُمید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

عروجِ طالعِ غالب اگر اسے بھاتا حسد کی آگ میں حاسد نہ یوں ٹھیکتا جاتا
نہ پھر یہ شعر وہ صرصر از زبانِ پیر لاتا ہوا ہے شہ کا مصاحب پھر سے ہی اترتا

وگر نہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

(۹۹)

تابِ الم اب مجھے زہنا نہیں ہے قابو میں مرے دل افکار نہیں ہے

آہِ فدا دل پر اختیار نہیں ہے آگہ مری جان کو تر نہیں ہے

طاقتِ بیدارِ انتظار نہیں ہے

دل کو تو قابو میں اپنے لیے لیا پہلے کہتے ہیں فرمائشِ جانِ جانِ کج ہم سے

لطفِ ملے گا بھلا کب عیشِ اس کے دیتے ہیں جنتِ حیاتِ ہر کے بدلے

نشہ بہ اندازہٴ نما نہیں ہے

چھائی ہے کچھ اس طرح کی یکسی اب تو روتا ہوں ہمرازی کوئی نہ ہو دل

شکوہِ قیہوں کا کیا کیا تیرا گلہ ہو مگر یہ نکالے ہو تری بزم سے مجھ کو

ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہو

وجہ بھی تو چاہیے کچھ رنج کی آخر کونسی شے میں ہو پایا عاجز و قاصر

چاہو جو تم جان بھی کر سکتے ہیں حاضر ہم سے عبت ہو گمانِ رنجشِ خاطر

خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہو

غفلتِ دل سے بھلا کیا پائے معافی اس میں ہی غنمی ہو سب دیاے معافی

اس کو سمجھ منزل و ماوائے معافی دل سے اٹھا لطیف جلوہ ہائے معافی

غیر گل آئینہ بہار نہیں ہو

اس پہ کیے میں نے برسوں تک تقاضے سن کے ہمیشہ مگر کچھ ٹالا ہی ہوتے

طالعِ خفہ مرے کچھ تو ہیں جاگے قتل کا میرے عہد تو کیا ہو بارے

وائے اگر عہد استوار نہیں ہو

تو نے یہ کیا زہد کی ٹھہرائی ہو غالب چال یہ موزن انے تری پائی ہو غالب

جام و سہو کا تو سودا ہی ہو غالب تو نے قسم میکشی کی کھائی ہو غالب

تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہو

زائے بھر کے رنج و غم ہیں اور تنہا مراد دل ہو (۱۰۰) گل مجھ سے اس کوہ گراں کا سخت مشکل ہو
 بڑھادی پوچھ اتنا سسے زانو سر بھی مائل ہو ہجوم خم سے یاں تک سرنگونی کچھ کو چال ہو
 کہ تار دہن و تار نظر میں فرق مشکل ہو

مجھے ای چارہ گرد نظر راحت نہیں تن کی منے لوں تو اگر کاٹے رگیں بھی میری گئی دن کی
 سینے جا زخم دل پر وہ نہ کچھ طعن دشمن کی رفوئے زخم سے مطلب ہو لذت خم سنون کی
 سمجھیو میت کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہو

گلستاں میں گروہ و فتن افزائی کرے غالب تو نور اس کا عطر گیس کو بیانی کرے غالب
 عجیب بوسے خوش ہوندا سودائی کسے غالب وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب
 چکنا غنچہ نگل کا صدائے خندہ دل ہو

جس روز کہ تو سیر کو گلزار میں آوے گل تازہ کھلے بہت گل خار میں آوے
 بالیدگی سوکھے ہوئے اشجار میں آوے جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
 جاں کا لید صورت دیوار میں آوے

گلشت میں پیدا ہو عجب لطف کا منظر لے بڑھکے بلائیں تری ہر شاخ گل تر
 گل تیرے قدم لینے کو ہو فرش زمیں پر سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر

تو اس قدر دلکش سے جو گلزار میں آوے

مانا کہ غم و ہنم سے دل زار کھلا ہو برسا دیئے خرگاہوں نے جو دریا بھی تو کیا ہو
آنکھیں بھی ہو روئیں تو کیا فخر ہو اور تب ناز گراں گئی اشک بجا ہو

جب نخت جگر دیدہ خونبار میں آوے

ہر چہز ہوا جوش فرو مجھ کو ستا کر کچھ دل کو ہوئی راحت و تسکین بھی دم بھر
وہ بات بھی کر جس سے ملے لطف مکر دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ سنگ مر

کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آئے

اعجاز کا رنگ اپنے جو دکھلائے اشارہ بیجان کو جاندار بنا جائے اشارہ
جادو سے غضب کھینے کیا ڈھلائے اشارہ اس چشم فسون گر کا اگر پائے اشارہ

طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آئے

مصرف و عاؤں میں ہیں کس سے یارب تاہر ہنہ پا گزرے کوئی پاس سے یارب
تکے ہیں پڑے راہ عجب پاس سے یارب کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب

اک آبلہ پا وادی پر خار میں آئے

آیا مرے آغوش میں کبہ تن نازک کس دن ہوا راحت کا سببہ تن نازک
پھندے میں ہو یوں غیر کے ابہ تن نازک مرجاؤں کیوں شکستہ جبہ تن نازک

آغوشِ خیمِ حلقہ زار میں آوے

پہنائے ہوئے دستِ طلب ہیں سرسبز

دیکھا ہو زمانے میں انھیں غمِ ابری اکثر

انساں کیلئے حرص ہی دشمن ہو قوی تر

خارت گردِ ناموس نہ ہو گردِ ہوس زر

کیوں شاہدِ گلِ بلغ سے بازار میں آوے

اما کہ جنوں کا ہو تجھے جوشِ فراواں

باقی ترے ہاتھوں سے ہی جینے دامان

یوں کر طے اڑانا تو نہیں ہو تجھے شایاں

تب چاکِ گریباں کا مزہ ہو دلِ ناواں

جب اک نفس ابچھا ہوا ہر تار میں آوے

کیا حالِ تپِ سوزِ دروں کہیے زباں سے

لگ جائے کہیں آگ نہ گرمی کے بیاں سے

بہتر نہ کہ نہیں ہی رہے اہلِ جہاں سے

اے دوائے اگر معرِضِ اطہار میں آوے

مقرر کی طرح سحر کی قسم اس کو سمجھیے

مضوں ہو اگر روح تو جسم اس کو سمجھیے

افسوں اسے ٹھہرائے اتم اس کو سمجھیے

گنجینہ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے

جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

(۱۰۲)

اندھو نجمِ سحر یا رسا خالِ اچھا ہو

اس کے ابرو سے نہ منجھرنہ ہلالِ اچھا ہو

مہر کچھ ہی تو ذرا قبل زوال اچھا ہی
حسن مہ گرچہ بہنگام کمال اچھا ہی

اُس سے میرا مہ خورشید جمال اچھا ہی

مفت کے مال کے اس درجہ ہیں خواہاں کپڑا
وہ ہی دانو اسی گھات میں ہیں شام و گچھا
چاہتے ہیں کہ رقم کوئی ملے خاطر خواہ
بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہی ہر وقت گچھا
جی میں کہتے ہیں کہ مفت اُسے تو مال اچھا ہی

کب سیر ہوا جمشید کو پہا نہ نیا
دور میں تادم آخر وہی اک جام ہا
دل سے اترا جو بہاں دُور کیا پھینکیا
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا

ساغر جم سے مرا جام سفال اچھا ہی

کر دیا ہی غم ہجراں نے مرا سینہ شوق
نام ہی نام ہی اب جان کا باقی ہی مرق
رنگ ہتا ہی مرا یوں تو غم و درد سے فاق
ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہو منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہی

ان کے ہاتھوں سے کسی کو بھی نہیں پہنچا فیض
دین و ایماں کے یہ ثمن ہیں تو پھر کیا فیض
ہنگامی کر کے بھی دیکھا تو نہ پایا یا با فیض
دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض

اک برہن تے کہا ہی کہ یہ سال اچھا ہی

فن ہو وہ چیز کہ فرہاد کی دی بات بنا
دور نہ شیریں سے کرے بات یہ ہیں کامنہ تھا

جس ہنر میں تھی اُسے مشق وہ کام آہی کیا ہم سخن پیشے نے فرما دو شیریں سے کیا
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہو

اصل محبوب سے ای کاش ہمارا ہو جائے دور جلدی کہیں یہ پرندہ دوئی کا ہو جائے
بزد ہو دامن کل ایک ہی لفتنا ہو جائے قطرہ دریا میں بول جائے تو دریا ہو جائے

کام اچھا ہو وہ جس کا کہ مال اچھا ہو

کل کے دروازے سے چوچا ہے گدا ملتا ہو اور جوتا ہو تو باچون و چرا ملتا ہو
در بدر بھیک اگر مانگیے کیا ملتا ہو بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہو

وہ گدا جس کو نہ ہو خوشی سوال اچھا ہو

اگر اس کو خدا رکھے سرا سرا سر سبز اس چین میں ہے یہ شک صنوبر سر سبز
اگر اس کا چین زار مقدس سر سبز خضر سلطان کو رکھے خالق اکبر سر سبز

شام کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہو

کٹ رہے ہیں اسی امید میں مرزا کے بھی دن صرف اسی آس رہے ہیں دل مضطرب ساکن
پتھر جو نہ ہو کب ہی تسلی ممکن! ہم کو معلوم ہی جنت کی حقیقت لیکن

دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہو

(۱۰۳)

ہم ہیں شاکِ ساقیِ گلجام کے اہلِ محفل ہوں مجتِ انعام کے
حوصلے پورے ہوں خاصِ عام کے غیرِ لیں محفل میں بوسے جام کے

ہم رہیں یوں تشنہ لبِ پیغام کے
ظلم سے خالی ہو کوئی کہ نہ مہ درپے ایذا ہیں اہلِ شہر و دہ
تم سے کیوں پڑتی مرے دل میں گڑ خشکی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
ہشکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے

دل میں اس ناوکِ فتن کے ہو گرہ یہ کمانِ اپنی کیے رہتا ہونہ
ناگ میں سب کی ہو کہ ہو یا کہ نہ خشکی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
ہشکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے

تم جوابِ خط ماہیں دو یا نہ دو ہم کو حاصل ہو غرض ہو دل کی جو
اس بہانے نام لکھا جائے تو خط لکھنے کے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

جوشِ مستی میں کیا طوفِ حرم خشتِ خم پر کی ادا رسمِ سلم
زہد میں رندی سے بھی چوکنے ہم راتِ پی زمرم پہ ڈاڑھِ صعدم

وہوئے دھبے جامہٴ احرام کے
 تھی بلا اپنے لیے اپنی نظر
 ہتکنڈوں کی اس کے تھی کس کو خبر
 اپنے ہاتھوں خود تھیں پہنچا ضرر
 دل کو آنکھوں نے پھنسا یا کیا مگر
 یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دم کے
 ہو چکا ظاہر دعاؤں کا اثر
 سب تھے مصر و فہ عا شام و بحر
 شاہد پھرتے ہیں طیبہٴ چارہ گر
 شاہ کے ہو غسلِ صحت کی خبر
 دیکھیے کب دن پھریں حمام کے
 پوچھ لو موزا سے اپنا مشغلا
 شغل ہو سکتا ہو کیا بے کار کا
 روگ ہی کچھ دل کو بیض بگیا
 عشق نے غالب نیچا کر دیا
 ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

✽

بہر شجر نے نئی قبا پائی (۱۰۴)
 بوسے گل کو صبا اڑا لائی
 گل نرگس نے پائی رعنائی
 پھر اس انداز سے بہا لائی
 کہ ہوئے ہر وہ تماثائی
 نظر آتے نہیں خس و خاشاک
 ہو صفائی سمکے تابہٴ خاک

ہر چین ہو غبار و گردے پاک دیکھو ایسا کٹان خطہ خاک

اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

اؤں کی ہی بہار سبزے پر گل چکے ہیں صورت اختر
 بکھیرے بے ساختہ نہ پھر کیونکر کہ زمیں ہو گئی ہی سرتاسر
 روکشِ سطحِ چرخِ مینائی

ابرِ باران نے آبپاری کی قوتِ نامیدہ کو حرکت دی
 نظر آتی ہو شاخِ شاخِ ہری سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی

ہو گیا روئے آب پر کائی

سبزِ محلِ بچائی سبزے نے کھل کھلاتے ہیں ہر طرف غنچے
 پھول بھی شاخِ شاخ پر پھولے سبزہ و گل کے دیکھنے کے لیے
 چشمِ نرگس ہوئی تماشا نئی

بزمِ عالم ہو مودے کی نظیر جھوم کر چھا گیا ہی ابرِ مطہر
 مست پھرتے ہیں سب صغیر و کبیر ہی ہوا میں شراب کی تاثیر

بانِ نوشی ہی بادِ پیائی

شاد مہر نہ ہی ہر گھڑی غالب کہ دُعا کا رگر ہوئی غالب

عام ہی عیش و خرمی غالب کیوں نہ دنیا کو ہونو عشی غالب
شاہ دیندار نے شفا پائی

۱۰۵

نہ چلی سحر بیا فی میری ہیچ نکلی ہمہ دانی میری
بھول کر بات نہ مانی میری کب وہ سنا ہی کہانی میری
اور پھر وہ بھی نہ مانی میری

دردِ دل ای ستم انگیز نہ پوچھ حالِ حشمِ غضب آئینہ نہ پوچھ
زخمِ نوکِ مرثہ تیز نہ پوچھ غلشِ غمزہ خونریز نہ پوچھ
دیکھ خوں نابہ فشتانی میری

مجھ کو اپنا ہی نہیں مائے خیال دوستوں تک کہاں جائے خیال
کس طرح ان کا مجھے آئے خیال ہوں زخود رفتہ بیدائے خیال
بھول جاتا ہی نشانی میری

تو حریت اپنا بھی کتنا بودا جھکو جس بزم میں پایا نہ جما
میری ہر بات میں ضد ہو گیا متقابل ہی مقابل میرا
رک گیا دیکھ روانی میری

جبکہ نظروں میں سبک ٹھہرا ہوں کیوں ترے ٹل پگڑاں اتنا ہوں
 کیا حقیقت ہی مری میں کیا ہوں قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں
 سخت ارزاں ہو کرانی میری

کیوں نہ بے ساختہ چکر کھاؤں گردشِ دہرے ہو حالِ زبوں
 غیر ممکن ہو کہ ٹھہروں دم لوں گردِ بادِ رہِ بے تابی ہوں
 مصرِ شوق ہی بانی میری

موشگافی کا مجھے دعویٰ تھا عقدہٴ موسےٰ کمر ہی نہ کھلا
 تھا غلطِ زعمِ ہمہ دانی کا دہنِ اس کا جو نہ معلوم ہوا
 کھل گئی پہچانی میری

خطِ جو لکھتا ہوں تو خاصہ طوفاً بات کرتا ہوں تو دیوانہ وار
 کیا مجھے یاد کریں گے غمِ خوار کیا بیاں کر کے مرادِ دینگے یار
 مگر آشفۃً بسیانی میری

مثلِ مہرِ راہونی طاقتِ غالب قلبِ بویں نہیں میں غالب
 خاکِ مریست کا اپنی طالب کردیا ضعف نے عاجزِ غالب
 ننگِ پیری ہی جوانی میری

(۱۰۶)

رگِ ہر می تشترِ فساد کی بھوکی ہو جلد رواں تیغ یہ حسرت ہی گلو کی
راحت ہی جراحِ است کو روانی سے اہو کی جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیرِ رفو کی

لکھ دیکھو یا رب اسے قسمت ہیں عدو کی

وہ دن گئے تھیں خون سے جب پنی گئیں پیر اور آنکھ سے تھا خون کے اشکوں کا تقطر
خونِ جگر و دل تو ہوا رزقِ نفسِ کر اچھا ہی سہرا نگشتِ منائی کا تصوّر

دل میں نظر آتی تو ہوا اک بوندِ اہو کی

ناعن ہی قیامت کا تھیں خوف ابھی سے کچھ ظلم بھی کرتے ہو تو سہمے ہوئے جی سے
کرنے دو اگر کرتے ہیں شکوہ یہ کسی سے کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے صوفی سے

یاں تو کوئی سُنا نہیں منہ ریا د کو کی

جب رخ نہ کیا ہو ترے تیروں نے ادھر کو کاٹا نہ ہو شمشیر نے سودا بھرے سر کو
کیا لطف ملے زبیت کا پھر ایسے بشر کو دشمن نے بھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو

خنجر نے بھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

مرزا غمِ دنیا سے رہا موت کا طالب چاہا کہ کرے ترک کہیں جان یہ قالب
ماہل ہوا مطلوب نہ برا سے مطالب صد جیت وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب

حسرت میں ہے ایک بتِ عربہ جو کی

(۱۰۶)

حسن ہی کا دل کو سودا چاہیے اشتیاقِ رشے زیبا چاہیے

رات دن شوقِ تمنا چاہیے چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے

یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

نشہ ہوتا ہو کب لکھن کو ہنر کچھ نہ ساقی کے سوا آئے نظر

لاکھ یہ پیتے رہیں آنکھوں پہر صحبتِ ندان سے جب ہو حد

جائے واپس کو کھینچا چاہیے

پاکے شمرہ چاہ کا دلِ خجل ہو گیا ہو درِ دو غم سے مضحل

اب تو یہ ہی اور درِ دو حال سل چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل

بائے باس سے بھی سمجھا چاہیے

مجرموں سے پردہ ہی دیدار نگہی یہ تنافر اور یہ ہم خانگی

ہم سے چھینا ہی کوئی فرزانگی دوستی کا پردہ ہی بگاڑی

منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

موت کا پاتا ہوں جو یا غیر کو رشک نے میرے ڈبویا غیر کو

رات دن کا غم ہو گویا غیر کو دشمنی نے میری گھو یا غیر کو
کس قدر دشمن ہو دیکھا چاہیے

پند میں ناصح نے بھی کر لی ہوسی قید سے یار دل کیا کم کی ہوسی
بارہا ہم نے بھی کر دیکھی ہوسی اپنی ہوا میں کیا چلتی ہوسی
یار ہی ہو گا مہ آرا چاہیے

کب ہی مایوسوں کو اُمید نہید گوش زد ہوان کے کیونکر نہید
کچھ نہ پوچھو سرتوں کا اپنی بھید منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
ما اُمیدی اس کی دیکھا چاہیے

پیرزن نادم تھی اپنے قصد سے منہ تھا کیا اُس کا کہ وہ یونکے
آہی تھی یہ صدائے غیب سے غافل ان مہ طاعتوں کے واسطے
چاہئے والا بھی اچھا چاہیے

یہ فیسی اور تلاش خال و خد جستجوئے نازنین سرود
اس جنوں کی بھی ہو ترا کوئی حد چاہتے ہیں غور دیوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

(۱۰۸)

کس طرح طوہورہ عالم امکان مجھ سے میں تھکا ماندہ ہوں اور دور ہی جاناں مجھ سے
 ذرہ ذرہ دم وحشت ہو گریزاں مجھ سے ہر قدم دوری منزل ہو نمایاں مجھ سے

میری رفتار سے بھاگے ہی بیاباں مجھ سے

جبکہ دیباچہ سے کھٹکتے ہیں مضامین یکسر پھر یہ فرصت ہی کسے پیٹھ کے دیکھے دفتر
 اور ہی دام میں ابھی ہوئی ہی اپنی نظر درس عنوان تماشا بہ تغافل خوشتر
 ہو نگہ رشتہ شیرازہ مرگھاں مجھ سے

کیا کہوں کیسے بسر ہوتی ہیں غم کی راتیں میرے احباب بیاں کی مجھے تکلیف نہ دیں
 بیکسی کامری اندازہ اسی سے کر لیں وحشت آتش دل سے شبِ تنہائی ہیں
 دود کی طرح رہا سا یہ گریزاں مجھ سے

میرے ماتم میں وہ جب آٹھ پہر ہو گریاں پھر خود آرائی و زینت کا وہ سامان کیاں
 مٹ گئی سرمہ کی تحریر کہ ہیں ہنکے واں غم عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں
 کس قدر خانہ آئینہ ہی ویراں مجھ سے

چونکہ ہی دشت مرے پاؤں سے آغشتہ بخوں ذرے ذرے کو یہ دعوے ہو کہ میں غمگین ہوں
 کیوں چمکتے ہوئے چھالوں کو جو اہر نہ کہوں اثرِ آبلہ سے جادہ صحرائے جنوں

صورتِ رشتہ گوہر ہی چراغاں مجھ سے

کاش ہر اک شب غم میں یہی بے ہوشی ہو تاکچہ آرام سے یہ ہوشِ باگز رے تو
اس نے تو خوب ہی پہچانی ہو راحتِ دل کو بے خودی بسترِ تہید فراغت ہو جو

پڑے سایہ کی طرح میرا شہستاں مجھ سے

منہ قفل پہ ہیں آنکھ کے ارماں سائے کلکے ستریزِ نظر ہو تو کروں نطائے
یتیمِ گلگیر سے کم تھکوا نہیں ہو پیارے شوقِ دیدار میں گر تو مجھے گردنِ مائے

ہو نگہِ مثلِ گلِ شمع پریشاں مجھ سے

کیا شبِ تار نے ڈھائی ہو قیامت ہو ہو چھوڑ دی سایہ نے بھی میری نفاقت ہو ہو
کتنی پر خوف ہو منزلِ گہِ فرقت ہو ہو بیکسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت ہو ہو

سایہِ نورِ شبیدِ قیامت میں ہو پنہاں مجھ سے

بادِ حسن سے غیروں کو تو یوں مست کرے تشنہ لبِ رہیں دیدار کے جو طالب تھے
خوب نصاف کیا ساتی ہوشِ تو نے گردِ دشنِ ساغرِ صدِ جلوہ رنگیں تجھ سے

آئینہ داری یکا دیدِ حیراں مجھ سے

اگِ وہ سینہ ہر زائیں بھڑکتی ہو اسد دیکھ کر برقِ جے دور سرکتی ہو اسد
دل میں بھی التمشِ جاں سوز دہکتی ہو اسد نگہِ گرم سے اک آگِ شپکتی ہو اسد

ہو چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

(۱۰۹)

دل میں وہ درد کہ جو اس کو دکھائے نہ بنے حال اپنا وہ زبوں جس کو چھپائے نہ بنے
بارغم میں وہ گرائی کہ اٹھائے نہ بنے نکتہ چیں ہی غم دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

گو بظاہر نہیں کچھ اس کا بلاناہ شکل ڈر مگر یہ ہو کہ ہٹ میں ہو وہ اپنی کامل
کہیں ہونا نہ پڑے اس کے نہ آنے سے فحل میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اوجہ نہ دل

اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
لذت جو رو جفا کو کہیں وہ شوخ نہ پائے ضد نہ چڑھ جائے کہیں ایسی کہ پھر دل دکھائے
ہاتھ دانستہ کہیں ظلم سے ظالم نہ اٹھائے کھیل سمجھا ہی کہیں چھوڑ نہ سے بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

خود تو رسوائے جہاں ہی یہ بد ذات مگر نیک نامی کو کہیں تیری نہ پہنچائے ضرر
راز داری کسے کہتے ہیں اسے کیا ہی خبر غیر پھرتا ہی یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہو تو چھپائے نہ بنے

شاخ ہی تک ہی گل تر کا شگفتہ رہنا ہاتھ گلچیں کا پڑا اور وہ پرمردہ ہوا

چشم بد و روہ نازک ہیں کہیں گل سے سوا اس نزاکت کا بُرا ہو وہ پھیلے ہیں تو کیا

ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

نور یہ مہر میں یہ مہ میں ضیا کیسی ہو کس کی بوہر گلِ نو خاستہ میں مخفی ہو

ہر طرف طرفہ تماشائے نظر بست ہی ہو کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہو

پروں چھوڑا ہوا وہ اس نے کٹھائے نہ بنے

غم سے گھل کر جگر و دل مرے اشکوں میں بہے میں نے اب تک تو سقم وعدہ خلافی کے سہمے

منتظر کیوں ہوں تمہارا کوئی اب کدھ کہے موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ بہے

تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

ہیں بُرے پیچ میں تقدیر سے ہم آئے ہوئے بات بنتی نظر آتی نہیں تدبیروں سے

کر دیا ہی ہیں مجبور بہت قسمت نے بوجھ وہ سر سے گرا ہی کہ اٹھائے نہ اُٹھے

کلام وہ آن پڑا ہی کہ بتائے نہ بنے

عشق کی خاک کے کوئی ستائش غالب الاماں قہر اس برق کی تابش غالب

بارہا کی ہو یہ ہرزانے گزارش غالب عشق پر زور نہیں ہو یہ وہ آتش غالب

کہ لگائے نہ لگے اور جھجائے نہ بنے

آیا ہرزا کو جسے دیکھتے ہی غش غالب تم نے دیکھا نہیں وہ شعلہ سرکش غالب

باب الفت میں عبث تم ہو مشغول غالب
عشق پر زور نہیں ہی یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

*

شبِ فراق میں راحت دے بے حساب تُو دے ④۰
لگی ہو آگ جو سینہ میں اس کو آب تُو دے
نجات غم سے وہ پر نہ نشیں شباب تُو دے
وہ آگے خواب میں تسکین اضطراب تُو دے
وے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تُو دے

جواب غیظ و غضب سے ہر ایک کو دینا
ہو ایک آن میں ونوں جہاں سے کھوینا
وہ بھر کے سانس جگر میں چھری چھو دینا
کرے ہو قتل لگاؤ میں تیرا رو دینا
تسری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تُو دے

لگا کے منہ سے عطا کوئی جامِ کراہم کو
اُمیدوار نہ یوں صبح و شام کراہم کو
جواب تیغ ہی سے شا دکام کراہم کو
دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کراہم کو
نہ دے جو پوسہ تو منہ سے کہیں جواب تُو دے

خیال چھوت سے بچنے کا ہو نہ عادت ہو
نہ اجتناب کسی سے نہ کچھ عداوت ہو
ہمیں سے اک تجھے پرہیز اور کراہت ہو
پلا دے ادک ساقی جو ہم سے نفرت ہو
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تُو دے

شب س کی بزم سے اغیار یوں لہلہ گئے کہ پاؤں اٹھ گئے اور چوڑھی وہ بھول گئے
 قبول خدمتِ مرزا ہوئی وہ غول گئے اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں بھول گئے
 کہا جو اس نے مرے ہاتھ پاؤں داب توئے

۱۱۱

اُدھر ناگفتہ بہ حالے بون و خوارِ بستر ہو ادھر ہونے تن خود میرے حق میں غارِ بستر ہو
 دل بے تاب مضطرب باعثِ آزارِ بستر ہو پیش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہو
 مراسرہ شجر بالش ہے مرا تن بارِ بستر ہو

حقیقت اشک کی اور دل کی تم سے کیا ہیں ہو مگر ماں مختصر سن لو کہ وہ کیا تھی یہ کیا تھی
 ہمارے ناز پروردوں میں ہیں تو نواں رہا پڑ سرتک سہرہ صحرا دادہ نور لبین دہن ہو

دل بے دست و پا افتادہ بر خورِ دایہ بستر ہو
 زہے قسمت کہ تم یوں بے بلائے مسیے گھر آؤ مرے بیت الحزن کے جاگ اٹھے میں نصیبِ بانو
 مرض کا اپنے بڑھ جانا مبارک ہو گیا مجھ کو خوشا اقبالِ بخوری عبادت کو تم آئے تو
 فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہو

ہوا اندھیر گھر میں کیا بلا فرقت کی ات آئی در و دیوار پر ہی کس غضب کی تیرگی چھائی
 گمراہ گھر نے بستر کی بدولت و بستی پائی بہ طوفاں گاہِ خوش اضطرابِ شامِ تنہائی

شعاعِ آفتابِ صبحِ عشرتِ تارِ بسترِ
 خدا کا شکر ہو تقدیر ہو جاگی ہوئی اپنی
 پھر اس کے خواب میں آنے کی حسرتیں ہیں ہوتی
 بنائیں کیا ابھی کل ہی تو وصلِ یار کی شب تھی
 ابھی آتی ہی بولش سس کی نفثِ مشکیں کی
 ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بسترِ
 ہوا ہو مبتلا مرزا عجب آزار میں غالب
 رہا کچھ بھی نہ باقی اس کی جانِ زار میں غالب
 نہیں اٹھنے کی بھی طاقت اب بن بچار میں غالب
 کہوں کیا دل کی کیا حالت ہو ہجرِ یار میں غالب
 کہ بیابانی سے ہر اک تارِ بسترِ غارِ بسترِ

۱۱۲

بنی ہی بارتاب ہوئے کہیں ان بن نہ ہو جائے
 محبت کی جگہ نفرت تجھے پُرفن نہ ہو جائے
 رہا غرہ تو میرا نفس ہی رہن نہ ہو جائے
 خطر ہو رشتہ الفتِ رگ گردن نہ ہو جائے
 غرور و دوستی آفت ہو تو دشمن نہ ہو جائے
 کمالِ فصلِ گل کہتے ہیں اس کو میرزا غالب
 کہ ہو ہر شجر پہنچے ہوئے گل کی قبا غالب
 سرگلیں کھلیں دو چار گل تو کیا مرزا غالب
 سمجھ اس فصل میں کوتاہی نشو و نما غالب
 اگر گل سرو کے قامت پہ پیرا ہن نہ ہو جائے

کیا جانے اصول ہو نہیں ہو
آہنگ بھی کوئی طی نہیں ہو
باقاعدہ کوئی شی نہیں ہو
فریاد کی کوئی لی نہیں ہو

نالہ پابند فی نہیں ہو

گلشن کو غرض نہیں جو مے
کیا معنی ہیں پھر کدے مے کے
کشکول کا کام کیا نہ لیں گے
کیوں بوتے ہیں باغبان تو بنے
گر بارغ گداے مے نہیں ہو

جلو تیرا ہی چار سو ہو
ہر ایک کو تیری جستجو ہو
تجھ سے ہی گلوں میں رنگ ہو
ہر چند ہر ایک شی میں تو ہو

پر تجھ سے تو کوئی شی نہیں ہو

بے جا ہو خودی و خود پرستی
اک ہم و خیال ہو یہ بستی
لاشی ہو یہ اوج اور پستی
ہاں کھایو مت فریب ہستی

ہر چند کہیں کہ ہو نہیں ہو

پروستہ ہر ایک شی ہو ضد سے
ہوتی ہو نشاط بعد غم کے
خواہاں ہو اگر الم سے چھوٹے
شادی سے گزر کہ غم نہ ہو دے

اردی چونہ ہو تو دی نہیں ہی

کچھ وہم مگر تجھے ہی زاہد اغار شراب سے ہی زاہد

ملتی یہ شے کسے ہی زاہد کیوں ردِ قبح کرے ہی زاہد

موی یہ مگس کی قوی نہیں ہی

مرزا ترا ہم قدم ہو غالب دھیان اس کو یہ ہمدم ہو غالب

دم کہتے ہیں جس کو دم ہو غالب ہستی ہو نہ کچھ عدم ہو غالب

آخر تو کیا ہو ای نہیں ہی

*

(۱۱۴)

کچھ رشک قیبوں ہی سے تنہا نہیں کرتے اپنی بھی نظر سے انھیں دیکھا نہیں کرتے

جان آئے جو لبّ بھی تو پردہ انہیں کرتے ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے

مرتے ہیں ولے اُن کی تمنا نہیں کرتے

وہ غیر جو کہتے ہیں یہ کہنا ہی زبانی لیکن ہی قیبوں سے لگاوٹ کی نشانی

ہم سے کوئی آسان ہیویں بات بنانی درپردہ انھیں غیر سے ہی ربط نہانی

ظاہر کا یہ پردہ ہی کہ پردہ انہیں کرتے

قابو نہ کسی شخص کا تم پر ہی نہ بس ہی مانو تو یہ مرزا کی نصیحت تھیں بس ہی

باز آؤ اگر مہر و وفا سے نکھیں من ہو یہ باعثِ فویدہی ار بابِ ہوس ہو
غالب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کہتے

۱۱۵

مرے سبب سے یہ خستہ جگر ہو کیا کہیے غریب کشتہ تیغِ نظر ہو کیا کہیے
فریبِ حسن سے یہ بے خبر ہو کیا کہیے دیا ہو دل اگر اس کو بشر ہو کیا کہیے
ہو ارقیب تو ہونا نہ ہو نہ ہو کیا کہیے

بدن سے جان کسی طرح جائے بن نہ ہے فراقِ جسم کا صدمہ اٹھائے بن نہ ہے
مگرہ میں تو یہ پھر بھی ستائے بن نہ ہے یہ عند کہ آج نہ آئے اور آئے بن نہ ہے
قضا سے شکوہ ہیں کس قدر ہو کیا کہیے

ضرور ہو کوئی موجودگی کا اس کی سبب اسی کو گشت میں پایا وہاں گئے ہم جب
کچھ اور شعل ہی اس کو نہیں ہو رُز و شب رہے اسیوں گہر و بیکہ کہ کوئے دوتک اب
اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہو کیا کہیے

ہمارے سر پہ تھا جب تکِ شباب کا آسیب نہ راہِ عشق کا سدِ چھا کبھی فرزندِ فشیب
اس اک گمان سے حامل ہو دل کو شکریہ زہے کشتہ کہ یوں سے رکھا ہو ہم کو فریب
کہ بن کہے ہی انھیں نب خبر ہو کیا کہیے

ہمارے درد و الم کا ہوا کسبِ ن کو خیال بلا کے گھر بھی پونجی نہ وجہ رنج و ملال
وہ بے سمجھ نہیں یہ بھی ہو ایکساں کی چال سمجھ کے کرتے ہیں باز میں ہر سرشِ حال
کہ یہ کہے کہ سیر رہ گزر ہو کیا کہیئے

تمہارے افس و محبت کا ہو عجبِ حوال کہ بات بات میں ہو دوستوں سے رنج و ملال
تمہیں سے ہم بھی گروں تو ہو نباہِ محال تمہیں نہیں ہو سیرِ رشتہ وفا کا خیال
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہو مگر ہو کیا کہیئے

کبھی کیا بھی جو کچھ عرض حال دل ہم نے تو مسکرائے کہا کیوں ہوئے ہو دیوانے
فضول ہو جیئے ہر وقت دو بد و اُن سے اُنہیں سوال پڑے عم جنوں ہو کیوں لڑیئے
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہو کیا کہیئے

کسی کو ہم سے اگر شکِ فن ہو کیا کیجے حسد کی آگ گزشتہ زن ہو کیا کیجے
جہان کی یہی رسم کہن ہو کیا کیجے حسدِ سزائے کمالِ سخن ہو کیا کیجے
ستم بہائے متلع ہنر ہو کیا کہیئے

کئے جہان میں ہر زمانہ شکل اُس کے دن ہزار عیب لگاتے ہیں اُس کو بد باطن
بُرا بُرا اُسے کہتے ہیں سب جوان و مُسن کہا ہو کس نے کہ غالب بُرا نہیں لیکن
سوائے اس کے کہ آشفۃ سر ہو کیا کہیئے

جب تک زاد تھا کب تھی پریشانی مجھے
کھینچ کر زنداں میں لائی میری جولانی مجھے
مٹی عدم میں ہر طرح حاصل تن آسانی مجھے
دیکھ کر دہریہ پر گرم دامن افشانی مجھے

کر گئی وابستہ تن میری عربانی مجھے
یوں مرا سینہ دباے وہ مری قسمت کہاں
اور گلے پر اس کے ہاتھوں ہو یوں خجروں
اور کیا اس کے سوا ہی خوش نصیبی کا نشان
بن گیا تیغِ گدا و یار کا سنگِ فساں
مر جا میں کیا مبارک ہو گراں جانی مری

رات دن آتا ہو جب بس کا تصور پڑی پڑی
ہوں اسی دھن میں یہی مجھ کو لگی رہتی ہو
مجھ کو عرضِ حال میں مانع نہیں ہوئی تھو
کیوں نہ ہو بے التفاتی اس کی خاطر جمع ہو

جاننا ہو مجھ پر سستہ بے پہنابی مجھے
میری بربادی تو قدرتی تقدیر کی ہی تھی
اس پتھر پہ ہوا گھر کی بلا سر پڑ گئی
یہ ہونی اچھی عنایت کا تب تقدیر کی
میرے غم خانے کی قسمت جب تم ہونے لگی
لکھ دیا منجملہ اسبابِ ویرانی مجھے

مٹی جلتی ہو فناں اس کی مری فریاد سے
ڈال رکھا ہو پریشانی میں اس کے ہم نے
شوق سے سنتا ہوں اپنا ہم نوا پا کر اسے
بدگماں ہوتا ہو وہ کافر نہ ہوتا کا مشکے

اس قدر ذوقِ نواسے مرغِ بستانی مجھے

چرخ کے ہاتھوں نہ پایا چین میں جب تک جیا داؤں جب اس کا چلا کچھ ظلم ہی مجھ پر کیا

تنگ آکر زیست سے جامِ اجل آخر پہنچا واسے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا

لے گیا تھا گوریںِ وقِ تن آسانی مجھے

یہ قریبِ روسیہ یوں ہی اگر دساؤ جھوٹ پر رغبت دلائے گا کہ خود مبار ہو

منتظر رکھنا کسی کو یہ بھی کوئی ناز ہو وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہو

تم نے کیوں سوچی ہو میرے گھر کی بھائی مجھے

چاہیے بھائی سے یوں بھائی کو مرزا دوستی ہو جو اس کو خرمی تو خرمی ہو اس کو بھی

جس طرح غالب نے کی اس شعر میں ظاہر خوشی دی مے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی

میرزا یوسف ہو غالب یوسفِ ثانی مجھے

*

(۱۱۵)

خود فراموشی ہوئی وقتِ مسرت کب مجھے دل ہی جبٹا لاں ہو چہ فرحت کیا مطلب مجھے

لب پر اس کا نام تھا کچھ دردِ پنچا جب مجھے یاد ہو شادی میں بھی ہنسا مہ یار ب مجھے

سچہ زابہ ہو اہی خندہ زیر لب مجھے

کہہ گیا دل رفد دل سے ہو گیا رنج و عن کر رہا ہی پریش احوال ہر غنچہ ہن

باتیں جاتی ہی ہوتا ہوں کوئی حرف نہ سن
ہو کشادہ خاطر وابستہ در رہن سخن

تھا طلسمِ قفلِ ایجب خانہ مکتب مجھے

اک طرف چپکا پڑا تھا کینے زنداں میں تھے
کیوں نہ آئیں یاد دہانہ کردہ دن آرام کے
مہلت اب م بھر نہیں آوارگی دشت سے
یارب اس اشتعلی کی داد کس سے چاہیے

رشتہ سائیش یہ ہر زندانیوں کی اب مجھے

رات دن رہتی ہو آنکھوں سے رول ان کے خون
حال دل بھی ہو گیا ہو کثرتِ غم سے زبوں
عمر گزری ہو کہ میں اس فن کا غور کردہ ہوں
طبع ہو مشاق لذتہائے حسرت کیا کروں

آرزو سے ہو شکستِ آرزو مطلب مجھے

مجھ سے فرماتے تھے طنز اکیوں تم ایسے ہو گئے
کیا ہوا مرزا بھیس دیوانے کس کے ہو گئے
اب تو حضرت کیلئے نمونوں یہ تھرے ہو گئے
دل لگا کر آپ بھی غالب بھئی سے ہو گئے
عشق سے آئے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

(۱۱۸)

نکال عظیم ال انجمن کی آزمائش ہو
ہر اک نوشق و مشاق کہن کی آزمائش ہو
ہر اک امتحان ہوا ال فن کی آزمائش ہو
حضور شاہ میں ال سخن کی آزمائش ہو
چمن میں خوشنویان چمن کی آزمائش ہو

محن میں ہر گرفتار محن کی آزمائش ہو گداز و سوز میں شمعِ لگن کی آزمائش ہو
 نفس کی قید میں مرغِ چین کی آزمائش ہو قد و گیسو میں قیس کوہن کی آزمائش ہو
 جہاں ہم ہیں وہاں اور سن کی آزمائش ہو

کہیں ریسانہ ہو محنت ہو اس کی رائیگاہِ آخر نہ جئے خوں ہو جئے شیر کے بدلے واں آخر
 غم شیریں سہے گا کس طرح وہ نیم جاں آخر کریں گے کوہن کے وصلے کا امتحاں آخر
 ہنوز اس خستہ کے نیرِ تن کی آزمائش ہو

سُنی ہو اس نے کب یعقوب کی آہِ سحر گاہی گنگھا کر پوئے یوسف اس نے کب بس کی غشی چاہی
 ہوئی ہو اور ہی مطلبِ کنناں کی طرف راہی نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی
 اسے یوسف کی پوئے پیرین کی آزمائش ہو

یہ کیا کرتے ہوں ضبط و تحمل کے غلطِ دعوے یقیں جاؤ کہ ہوش اڑ جائیگے جب اس کو بھوکے
 جسے دعوئے ہوا ہلِ بزم میں اب دہنبل بیٹھے وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے
 شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہو

نشانی دو ہیں جس کو بھی اڑائے اس کا تیرا کر تو پھر شکافِ راندازی میں اس کی کچھ کیکر
 کہاں کو کھینچنا ہی اس کا اکِ صانِ آدم ہے ہے دل ہی میں تیرا چھا جگر کے پار ہو بہتر
 غرض شستِ بٹناؤں لگن کی آزمائش ہو

بظاہر تو یہ دونوں ایک ہی سبت ہیں سودائی مگر ریم پرستش مختلف دونوں نے ٹھیرائی
 عبت گردن ہر اکے رشتہ الفت میں بندھوائی نہیں کچھ سجدہ و نماز کے پھندے میں گیرائی
 وفا داری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہو

نیچہ ناشکیبائی کا آخر کیا ہوا غافل تر پنے سے کہیں آسان ہو سکتی ہو بہ مشکل
 نہ ہو جائے کہیں تجھ پر کوئی تازہ بلاناازل پڑا رہا دل وابستہ بیانی سے کیا حاصل
 مگر پھر تاب زلف پر شکن کی آزمائش ہو

ہمارا قصہ تھا چکھیں کسی دن ہم بھی اس سم کو مرہ لینے نہ پائے خود بخود گھٹنے لگے ہم تو
 نباں کا ذکر کیا اس کا اثر آگے تو پڑھنے دو رگ پڑی میں جب تیرے ہر غم تب بکھیے کیا ہو
 ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہو

سنا تو ہوا انھوں نے یہ ارادہ کر لیا غالب کہ وہ مرزا سے باندھیں عہد و پیمان غالب
 گلاب کھینچے یہ چرخ لائے رنگ کیا غالب وہ آئیں گے مے گھر وعدہ کیسا دیکھنا غالب

نئے فتنوں میں اب چرخ کہن کی آزمائش ہو

۱۱۹

اگر وہ روٹھتا ہو کب منایا جائے ہو مجھ سے سر رہا بھی جاتا ہو تو کنیا جائے ہو مجھ سے
 غرض جتنا ہوتا ہوں یگڑتا جائے ہو مجھ سے کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر جائے ہو مجھ سے

بھائیں کر کے اپنی یاد شرملائے ہو مجھ سے

نظر آتا ہو خوابِ وصل تو قبیر الٹی ہو بگڑ جاتا ہو بن کر کام کیا تقدیر الٹی ہو

مرے سب کام اٹے ہیں مری تدبیر الٹی ہو خدا یا جذبہ دل کی مرے تاثیر الٹی ہو

کہ جتنا کھینچتا ہوں او کھینچتا جائے ہو مجھ سے

اُسے کیونکر سناؤں حالِ دل ہو سخت حیرانی پریشانی کا مضمون اور بیاں میں ہو پریشانی

کھلائے دیکھئے کیا گل میرے قاصد کی دانی وہ بدخوا اور میری داستانِ عشق طولانی

عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہو مجھ سے

یہ میری سرگزشت ان کے لیے جھوٹی کہانی ہو انھیں سننے سے نفرت ہو یہاں طیلسانی ہو

مجھے دشوار اپنے دل کی کیفیت سنانی ہو ادھر وہ بدگمانی ہو ادھر یہ ناتوانی ہو

نہ پوچھا جائے ہو ان سے نہ بولا جائے ہو مجھ سے

ہمارے بہت اُمید و تصدیر کی بدولت ہو قضا کا سامنا ہو کیا بلا ضعفِ نفاہت ہو

خیالی زندگی ہو ورنہ کیا جینے کی صورت ہو سنبھلنے دے مجھے ایسا اُمید ہی کیا قیامت ہو

کہ دامنِ خیال یا رچھوٹا جائے ہو مجھ سے

گوارا دل کو یہ کب ہو کہ نکھیں اس کو اس دینِ تقاضا رشک کا یہ ہو وہ آنکھوں میں ہے ساکن

وہ جب جلوہ نما ہوگا تو ہوگا عشر کا وہ دن تکلفِ برطرفِ نظارگی میں بھی ہو ہیسیکن

وہ دیکھا جائے کب ظلم دیکھا جائے ہو مجھ سے

سوچ رکھا تھا میں نے عشق کو کٹ ل لگی دل کی کہاں کٹ ل لگی یہ تو مصیبت پر گئی مٹی

نہ کیا مجھ کو اس کی معرکہ آرائیوں کی بھٹی ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نہر عشق میں نہی

نہ بھاگا جائے ہو مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہو مجھ سے

مجھے آتا ہے یہ خوابے یاشاں کیا نظر غالب بنے گی دیکھئے کیسی دل بے تاب پر غالب

یہ کیوں اس شاکست ہو خون مرزا کا جگر غالب قیامت ہو کہ ہوئے مدعی کا ہم سفر غالب

وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہو مجھ سے

❖

۱۲۰) رشتہ میں جو ہو گنبدِ خضر امرے آگے فانوسِ خیالی کا ہو نقشِ امرے آگے

وارض کو اک گیند کا رہتا امرے آگے بازیچہ اطفال ہو دنیا امرے آگے

ہوتا ہی شیبِ روزِ تاشا امرے آگے

بابلہ ہو گنبدِ گرداں مرے نزدیک فدے سے بھی کمتر ہو بیاباں مرے نزدیک

شعبہ نیرنگی و دوران مرے نزدیک اک کھیل ہو اورنگِ سلیمان مرے نزدیک

اک بات ہو اعجازِ مسیحا مرے آگے

ارض ہیں او نام تو اجسام ہیں مستو ہو نام ہی نام ان کا حقیقت ہیں سب دور

ہر رنگ میں موجود ہی صرف نایک وہی نور جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور

جز وہم نہیں ہستی اشیاء مرے آگے

اُڑتا ہی بیابان کا خاکا مرے ہوتے اٹھتا ہی بگولے پہ بگولا مرے ہوتے

اشکوں سے ہی سیلاب کا نقشبنا مے بہتے ہوتا ہی نہاں گردیں صحر ا مرے ہوتے

گھسٹتا ہی جہیں خاک پہ دریا مرے آگے

دیکھتے تو کوئی دل کا ٹپنا ترے پیچھے کیا کہنے گزر جاتی ہی کیا کیا ترے پیچھے

جینا مجھے دُشوار ہی گویا ترے پیچھے مت پوچھ کہ کیا حال ہی میرا ترے پیچھے

تو دیکھ کہ کیا رنگ ہی تیرا مرے آگے

ہوتا ہوں میں جس وقت میرا بسے سرشار اُٹھتے ہیں حجابات عیاں ہوتے ہیں سرشار

ہی نشہ سے وابستہ گہر ریزی افکار پھر دیکھیے اندازِ گل افشانی گفتار

رکھ دے کوئی پیانہ و صہبامرے آگے

رہتا تھا شنب و روز اسی بات پہ جھگڑا ذکر اُس کا کرے کوئی مجھے کب تھا گوارا

اب لاکھ کوئی ذکر کرے کچھ نہ کہوں گا نفرت کا گماں گزرے ہی بین شک سے گزرا

کیونکر کہوں لو نام نہ اس کا مرے آگے

اسلام ہو مانع جو مجھے دُور کے لے کفر ہر خندِ عقیدت سے جگہ آنکھوں میں نے کفر

حاضر ہے خدمت کو کمر باندھ لئے کفر
ایساں مجھے روکے ہو جو کھینچے ہو مجھے کفر
کبہ مرے پیچھے ہو کیسا مرے آگے

یہ وہ ہوں کہ جس کام کو چاہا نہ کر کا کام
اس شوخ کے آگے نہ چلا پر نہ چپ لا کام
حیرت ہو کہ کیوں اپنی تمنا میں ہوں نا کام
عاشق ہوں معشوق فریبی ہو مرا کام
مجھوں کو بُرا کہتی ہو لیسی مرے آگے

وقت میں گزرتے تھے جو سوطح کے صدمے
کرتا تھا دماغ روح کہیں جسم سے نکلے
اب ان سے جو ملتا ہوا دی جان خوشی سے
خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شبِ ہجرال کی تمنا مرے آگے

موجود ہو جو سوزِ دروں کا ش یہی ہو
ہو جس قدر رنجِ جنوں کا ش یہی ہو
اب تک ہو جو کچھ حالِ نبوں کا ش یہی ہو
ہو موجزن اک قلزمِ غل کا ش یہی ہو
آتا ہو ابھی دیکھیے کیا مرے آگے

ظاہر ہو نزاع میں بھی دافعِ غم ہو
اٹھواتے ہو کیوں پاس سے کیا یہ کوئی تم ہو
عہد کہ یہ ہر تاؤ و دم مرگِ ستم ہو
گو ہاتھ کو جنبش نہیں نکھوں میں تو دم ہو
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

وابستہ ہو اس ذات سے جو ناز ہو میرا
اس امر میں مہر زابھی ہم آواز ہو میرا

ہم کار ہی اور جہنم و دمساز ہی میرا ہم پیشہ وہم مشرب و ہمارا ہی میر
غالب کی برائیوں کہو اچھا مرے آگے

(۲۲۱)

امید کیا ہی جو کچھ اپنا ماجرا کہیے ہماری بات کو کب آپنے سنا کہیے
کروں جو شکوہ تو پھر کیا مری خطا کہیے کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے
تمہیں کہو کہ جو غم یوں کہو تو کیا کہیے

اگرچہ حسن کے جو رجحان ہی یورہیں حسین انھیں سے تو آراستہ سر سہیں
خدا نخواستہ کب یہ تمھارے جو ہریں نہ کہیوں سے پھر تم کہ ہم ستم گویں
مجھے تو غم ہی کہ جو کچھ کہو حجب کہیے

جو آشنا ہو وہی آشنا کے گھر جائے نہ بڑھ سکے گا قدم کوئی غیر اگر جائے
جھے ہو جس سے تعلق وہ بے خطر جائے وہ نیش تر سہی پر دل میں جبکہ تر جائے
نگاہ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

ہزار سینے کو چھلنی بنائے زخم سناں کشا و دل میں مگر تیر کو جو دخل کہاں
کھلا ہوا ہو جو راحت ہے وہ راحت جاں نہیں فریہ راحت جو راحت پیکان
وہ زخم تیغ ہی جس کو کہ دل کشا کہیے

بشر کو چاہیے جو صاف سینہ کیلئے سے
 بُرا ہی ظلم و ستم کو ہو ظلم کے بدلے
 مزا تو یہ کہ بن جاؤ دوست دشمن کے
 جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیے
 جو ناسزا کہے اس کو نہ ناسزا کہیے

کبھی جو بیٹھ بھی جاتے ہیں ہم غزل لکھنے
 تو بار بار تقاضے یہ ہوتے ہیں دل کے
 کہ آج خوب ہی جی بھر کے ویسے دکھڑے
 کہیں حقیقتِ جاں کا ہی مرض لکھیے
 کہیں مصیبتِ ناسازی دوا کہیے

کبھی میانِ لالِ دلِ سزیں کیجئے
 کبھی فغانِ جہاں سوز و آتشیں کیجئے
 کبھی روایتِ ہجرِ بستِ سب کیجئے
 کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجئے
 کبھی حکایتِ صبرِ گریزِ پا کہیے

نجاتِ غم ہے جو ہے اس کو اور کیا دیجئے
 نثار کیجئے دل کو یہی صلا دیجئے
 جو سزا اُسے تو جلا دے کو دُعا دیجئے
 رہے نہ جان تو قاتل کو خونِ بہا دیجئے

کئے زبان تو خنجر کو مر حبا کہیے

جو یار پاس نہیں ہو خیالِ یار تو ہو
 تصور اس کا شبِ غم میں غمگسار تو ہو
 یہ اک فریقہ تسکینِ جانِ زار تو ہو
 نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہو

روانیِ روش و مستی ادا کہیے

جو فرش گل نہیں چاہی تو سبزہ زار تو ہوا
چمن نہیں تو مرا سینہ داغدار تو ہوا
جگل نصیب میں پئے نہیں ہو خار تو ہوا
نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہوا
طراوت چمن و خوبی ہوا کہیے

نجات غم سے نہ ہوگی یقین تھا غالب
مقامِ شکر ہو میرے ٹلی بلا غالب
بہی ہو مسک منزل بھی میرا غالب
سینہ جبکہ کنارے پہ آگیا غالب
خدا سے کیا ستم و جور نا خدا کہیے

(۱۲۱)

با آبرو تو خلق میں کیا خاک ہو گئے
تھے غرقِ بحرِ شرم کہ پیر اک ہو گئے
مشہور اک زمانہ کے چالاک ہو گئے
رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے
دسوئے گئے ہم تنے کہ بس پاک ہو گئے

تھی خوشی کی چاٹ بیڑب لگی ہوئی
پینے میں ہم نے آٹھ پہر کچھ کسی نہ کی
آخر کو رنگ لاکے رہی اپنی مفیسی
صرف بہائے ہوئے آلاتِ خوشی
تھے یہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

لچھے نہیں ہو اب تو ذرا بھی کسی سے تم
ہر اک سے پیش آنے لگے دل لگی سے تم
جا جا کے اب تو تھے ہو ہر آدمی سے تم
سوائے دہر کو ہوئے آوارگی سے تم

بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

جن کو نہیں ہو عاشقی و عشق کی نیر
ہوتے ہیں متعرض وہی تاثیر آہ پر
گلشن میں دیکھئے اثر آہ الحذر
کہتا ہوں کون نالہ لبیل کو بے اثر

ہر دے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

دل میں وہ آگ کتنی کہ سراپا جلا دیا
ہستی کو عاشقوں نے دیا خاک میں ملا
پایا انھوں نے زندگی شمع کا مزا
پوچھے ہو کیا وجود و عدم اہل شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

کرتے تھے جی ہی میں دردِ سنج و غم گلہ
تھا عالم خیال ہی میں دم بدم گلہ
جرات جو پھر بڑھی تو ہوا ہم کو سم گلہ
کرتے گئے تھے اس کے تغافل کا ہم گلہ

کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

مرزا جو دل تھا اس کے لیے جیسے بود و باش
کرتے ہی قتل اس کو کیا پہلے پاش پاش
ظالم نے خود ہی کرو دیا پردہ ستم کا فاش
اس رنگے اٹھائی کل اس نے ہنسی لاش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غم ناک ہو گئے

مجھ کو غم سے رہا کرے کوئی غم گساری ذرا کرے کوئی

لاکھ دعوے کیا کرے کوئی ابن مریم ہوا کرے کوئی

میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

حلقہ زلف چلتی زنجیر دونوں ابرو ہیں خنجر و شمشیر

جلوہ حسن وہ کہ برق نظیر چال جیسی کڑی کمان کا تیر

دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

میرا قاتل وہی نگار سہی دو جہاں میں قصور وار سہی

خوں بہا اس کے سر ہزار سہی شرع و آئین پر مدار سہی

ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

اس کی محفل تمام گونگی ہو کچھ کہے کس کو تاب اتنی ہو

لب ہلائے مجال کس کی ہو بات پرواں زبان کشتی ہو

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

ذکر ہوتا ہے جا بجا کیا کچھ غور کرتے ہیں آشنا کیا کچھ

کہہ گیا دل کا مدعا کیا کچھ بسا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

جو لڑے اس سے تم لڑو نہ کبھی رکھو آزاد زندگی اپنی

کیا ضرورت جواب دینے کی نہ سو گرا کہے کوئی

نہ کہو گرا کرے کوئی

کوئی تم کو جو دے اذیت بھی درپڑا انتقام ہو نہ بھی

رہنمائیِ خلق ہو اچھی روک لو گرا غلط چلے کوئی

بخش دو گرا خطا کرے کوئی

جو بظاہر ہیں خرم و خورند وہ ہیں ناشاد تم سے بھی نہ چند

ہو دیر احتیاج کس پر بند کون ہو جو نہیں ہو حاجتمند

کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیوں نہ شکوہ کریں قدر سے کھینچ لایا ہو دشت میں گھر سے

رہکے امیر خاک رہیں سے کیا کیا خضر نے سکندر سے

اب کسے رہنا کرے کوئی

ان سے جب تک میتھی غالب شکوہ سنجی کی تو رہی غالب

عش ہو ہرزا کی خامشی غالب جب تو قہ ہی اٹھ گئی غالب

کیا کسی سے گلہ کرے کوئی

(۱۷۳)

فلک کے جوڑے غم کیا ہی اور ہم کیا ہی یہ میری تاک میں اور رہی ستم کیا ہی
جو مویں کے ہو سلامت تو پھر الم کیا ہی بہت سی غم گیتی شراب کم کیا ہی
غلام ساقی کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہی

تھارے قول ہیں کیا چیز اور قسم کیا ہی آل اس کا ستم ہی تو یہ کرم کیا ہی
ذلیل ہو گا کسی دن اُسے بھرم کیا ہی تمھاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہی
رقیب پر ہی اگر لطف تو ستم کیا ہی

بچو پیوں کے خیالات خام ہیں بے سود نہ سعد و نحس نہ ان کے شکنجے کا وجود
کسی پہ کھل نہیں سکتی مشیتِ مسبود لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود
کسے خبر ہی کہ واں جنبشِ ستم کیا ہی

کرے حلف سے بھی وہ بت جو ترکِ عروجِ خدا مجھے یقین نہ آیا نہ آئے گا اصلا
خدا سے منحرف اور منکر جزا و سزا نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا
خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہی

ہوئی ہو ہر سیماں کی عدل سے محکم دکھائی دیتا تھا عالم یہ جام پر تھا بھرم
انہیں صفات سے دونوں کا ہو جو وجود ہم وہ داد و دید گر انما یہ شرط ہی ہم دم

وگرنہ مہر سلیمان و جام جم کیا ہی

ہلکسی نے کہا ہر کسی نے دام اُسے
کھلے نہ جب تو مہما اُسے نہ کیوں کہیے

کسی نے دی اُسے تشبیہ نیشِ عقرب سے
کٹے تو رات بچ کاٹے تو سانپ کہلائے

کوئی بتائے کہ وہ زلفِ خمِ بزم کیا ہو

وہ فانی کہ جیسے سن کے دنگ ایرانی
سخن وروں میں ہی مرزا دہ فرد لاشانی

یقین ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دُم کیا ہے

۱۲۵
 ہوں کیونکہ خوشی نکلی نہ دل سے بچ و غم نکلی
 یہ سب نکلی مگر افسوس کیونکہ یہ الم نکلی
 ہوا کی حسرتیں نکلیں نہ ارمان ایک قلم نکلی
 ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پیہم نکلی

بہت نکلے مرے ارمان لیکن کھپ چکی کم نکلے

ہوا جلا د کو کیا وہم رو سا کس لیے خنجر
 پہنل تھا ہوا بتائی کہ خنجر لب ہی کرے تر

بہے جب تکٹنوں قاتل کے سر ہوں ہا کیونکر
 ڈسے کیوں میرا قاتل کیا ہے گاں گی دن پر

وہ نول جو پیر سے عمر بھر لیں وہ ہم نکلے

نوٹ اس غور سے لے کر کہ شرفیاب احمد صاحب کے ہاتھ کے بنیادوں کے پہلے حصہ اول میں انھوں نے جو سیریز ناظرین کے غور سے لکھی ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

کبھی ہم بھی تھے تیرے سایہ دیو میں ساکن
رسائی پر ہماری شک تے تھے سب اس جن
ہمیں جب نے اٹھوایا دے سے یاد ہو وہ دن
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

ترے گیسوے پیچاکے مقابل کہتے اقد تھا
زمانہ نے مگر اک فتنہ محشر اُسے سمجھا
غنیمت ہو کہ اس پیچیدگی نے رکھ لیا پردا
بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی ورازی کا
اگر اس طرہ پر ہیچ و خم کا ہیچ و خم نکلے

عجیب کیا ہو ہمارا خط اگر اُس کو پسند آئے
پھڑک جائے عبارت کچھ کر اور قدر فرمائے
نہ پہونچیں ہم تو کیا تحریر ہی اپنی پہنچ جائے
مگر لکھوائے کوئی اُس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر ظم نکلے

ہوئی ہر رنگ میں جب پیر میخانہ کو ناکامی
نہ دور جام سے حاصل ہوا کچھ غیر بدنامی
نظر جھپٹائی و کشوں کے طرف میں غامی
ہوئی اس ور میں منسوب مجھ سے یادہ آشنائی
پھرا یادہ زمانہ جو جہاں میں جام جم نکلے

کریں کیا خاک جرات حالِ رد و غم سنانے کی
کہاں بہت کسی کو اپنے زخم دل دکھانے کی
کریں کیا شکوہ کچھ حالت ہی ابتر اوزمانے کی
ہوئی جن سے توقع خشکی کی داو پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستہ تیغ الم نکلے

اگر ہم شمع سوزاں ہیں تو وہ آتش کا پر کالہ جلانا خاصہ اس کا ہماری زندگی جلنا
اسی کا پر توہ ہے اپنا سامان بقا گویا محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا

اسی کو دیکھ کر جینے ہیں جس کا فر پہ دم نکلے

ہر منبر کیا کرتا تو ہی میری کا بسیار واعظ بیانِ حرمت میں ہی مشہور جہاں واعظ
ہی حیرت ہو مرزا کو بھی کیوں پہنچا وہاں اعظ کہاں میخانہ کا دروازہ غالب و کہاں اعظ

پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

(۱۲۶)

ساقی سیاہ مست ہی تو لطف خاک ہے قصہ ہی پھر تو پینے پلانے کا پاک ہے
ساقی کی آنکھ پر لبط صہبا کی تاک ہے مستی بہ ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے

موجِ شراب یک مرزہ خوابناک ہے

رہتی ہے اس کو خنجر و پیکاں کی جستجو آنکھوں پہر ہو ذوقِ جراحات کی گفتگو
ہر دم سنان و تیر کا نقشہ ہے روبرو جز زخمِ تیغِ تار نہیں دل میں آرزو

جیسا خیال بھی ترے اکتوں سے چاک ہے

وادیِ تنگ بے ہیں بھاتا نہیں اسد نظروں میں اپنی دشتِ سہانا نہیں اسد
مرزا بھی ماہِ چارہ بتاتا نہیں اسد جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسد

صحرا ہماری آنکھ میں اک مشتِ خاک رہی

*

(۱۲۷)

اُس کی ہوا میں ہر گلِ ترِ دلِ نگار رہی رخ کا پسینہ روکشِ عطر بہا رہی
بوسے بدن سے باوصبا مشکبار رہی جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار رہی
نافہ دماغ آہوئے مشکِ تارا رہی

دلِ جلیتے جی اُٹھائے گیا سر پہ باؤق ہم خاک میں ملے تو ہوا انتشارِ شوق
کیونکر ضائع دشتِ نہ ہو اب تک کارِ شوق ہر ذرہ ذرہ تنگی جاسے غبارِ شوق

گردِ ام یہ ہی وسعتِ صحرا نکا رہی
آنکھوں سے کون پرورشِ ہی چھپا ہوا کس کے خیالِ دید میں سکتہ سا ہو گیا
کیوں اس طرح کیا ہی تہیہ تلاکش کا کس کا سراغِ جلوہ ہی جہت کو یا خدا
آئینہ فرشِ شش جہتِ انتظار رہی

ہی بس کہ شوخ چشمِ بڑا مدعا علیہ تسلیم کیوں کرے گا خطا مدعا علیہ
دے گا جواب دیکھیے کیا مدعا علیہ دلِ مدعی و دینِ بنا مدعا علیہ
نظارہ کا مقدمہ پھر رو بکا رہی

تیارِ سفر میں ہی غنچوں کو بیچ و تاب پاور کا بپ ہیں یہ گلوں کو ہوا اضطراب

پتے اتر کے شلخ سے کرتے ہیں پاتر اب چتر کے ہر شبنم آئینہ برگ گل پر آب

ای عند لیب وقت و دایع بہار ہو

ہو کیوں نہ انتظار سے دل بنگلی مجھے تسکین اس خیال ہی سے ہو پڑی مجھے

ایفا کی گونہیں ہو کچھ امید بھی مجھے بیچ آپڑی ہو وعدہ دلدار کی مجھے

وہ آئے یا نہ آئے چہ یاں انتظار ہو

اب تک تو ہر کی بھی نہ تجھ پر پڑی نظر ذروں کی آنکھیں دیکھ کہیں ہوں نہ پردہ ہو

لیلیٰ نہ پھرنا چاہیے بیباک اس قدر بے پردہ سوئے اوری جنوں گزرنہ کر

ہر روزہ کے نقاب میں دل بے قرار ہو

بے کار ہو مرقع دل واہ کیا کہی آنکھیں کھلی ہوئی ہوں تو ہوا سے آگئی

ہو پاس ایسا آئینہ اور پھر یہ گھر ہی دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی

ای بیدار غ آئینہ تمثال دار ہو

اٹھنے کو ہی چہن سے عملداری نیناں سنا بھی پھر نہ آئے گا تجھ کو نظر بہاں

غافل یہ کثرتِ خس و خاشاک پھر کہاں ای عند لیب یک کفِ خس بہرِ آشیان

لموت ان آمد آفصل بہار ہو

مردار کی طرح کچھ بھی نہیں س کو حنیاط یہ تگدہ اور اس میں یہ فرحت یہ انبساط

یہ جوشِ حرص اور قوی میں یہ انحطاط غفلتِ کفیلِ عمر و آسہِ ضامنِ نشاط

ای مرگِ ناگہاں تجھے کیسا انتظار ہو

❖

(۱۲۸)

تو وہ حسین ہو کہ خود آرا کہیں جسے شاہانِ حسن تاجِ سرا پہنا کہیں جسے
ہو اور کون حسن میں یکتا کہیں جسے آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

حیران ہو جو الفتِ حسن و جمال میں اک انقلاب ہو دلِ خستہ کے حال میں
سکتہ ہوا تصویرِ ذوقِ وصال میں حسرت نے لارِ کھانری بزمِ خیال میں
گلدستہ نگاہِ سویدا کہیں جسے

دل کو کیا ہو عشق نے کس غم میں مبتلا کرتے ہیں اس کو بہم ورجا رات دن فنا
آنکھوں کو کس نے شوقِ نظر کا لگا دیا پھونکا ہو کس نے گوشِ محبت میں و خدا
افسونِ انتظارِ تمنا کہیں جسے

کیونکر جنون و جوشِ وحشت کو ٹاپیے وحشی کو کس طرح دمِ غربت بٹھالیے
دل کا غبار اور تو کیونکر بٹھالیے سریرِ ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرایں کہیں جسے

آنکھوں میں ہو سمایا ہوا بحر ہیکراں اس زور کا ہی مد و تلاطم کہ الاماں
 دنیا کا حال کیا ہو اگر اشک ہوں واں ہر چشم تر میں حسرت دیدار سے نہاں
 شوقِ عنان گسینستہ دریا کہیں جسے

بھلی ہوئی ہو چاندنی یا تیرہ ابر ہو دونوں ہیں بے طرح متقاضی کہ محی پیو
 ہوتی نہیں بسرِ جو شبِ غم شراب دو در کا رہی شگفتن گلہائے عیش کو
 صبح بہارِ پنبہ مینا کہیں جسے

میں کے بُرائی دل میں ہوا چھا وہ کیا کہے کچھ بھی گلہ نہیں ہی اگر ناسزا کہے
 مرزا سے صبر سیکھ کہ دنیا بھلا کہے غالب بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے
 ایسا بھی کوئی ہی کہ سب چھا کہیں جسے

(۱۲۹)

سامانِ مرگ پہلے مہیا کسے کوئی پھر تجھ سے گفتگو کی تمنا کرے کوئی
 بیٹھا خاموش یوں تجھے دیکھا کسے کوئی جب تکت ہانِ خم نہ پیدا کرے کوئی
 مسئلہ کہ تجھ سے راہِ سخن اکرے کوئی

کیونکر ہو خاکِ شوقِ جانبار سے مفر اس کو ہوا لیے ہوئے پھرتی ہو دوش پر
 وادیِ نجد پر ہی نہیں صرف منحصر عالمِ غبارِ وحشتِ مجنوں ہی سرسبز

کب تک خیال طرہ لیلیٰ کرے کوئی

پڑ مر دہ دل میں تھی جو تنائے التفات
آخر وہ آج کہتے ہوئے آئے التفات
لیکن یہ جان لیں ہی دعوائے التفات
افسردگی نہیں بلکہ فرائے التفات

ہاں دردِ بن کے دل میں مگر جاگے کوئی

کتنے ہیں صبر و ضبط میں آٹھوں پہر مجھے
دل کھول کر نہا پے دے اب شکستے مجھے
چھوڑاں نصیحتوں کو نہ ٹھونٹاں قہر مجھے
رونے سے ای ندیم ملامت نہ کر مجھے

آخر کبھی تو عقدہ دل واکرے کوئی

دخستگی ہزار طرح رونما ہوئی
با اینہما بغض نہ توجہ ذرا ہوئی
میں نے قبا جو چاکت کی کیا خطا ہوئی
چاکر جگر سے جبے پریشاں وا ہوئی

کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

واوی کے سامنے ہی چین کا چرخ گل
بادِ بہار کا نفسِ سرود سے ہی غل
کیونکہ نہ رشکِ گلشنِ جنت ہو دست گل
نخست جگر سے ہی رگ ہر خار شل گل

تا چند باغبانی صحر اکرے کوئی

تیری شعلِ حسن ہواک تیر حشیم دوز
مطلق نہیں ہی آنکھ کو تابِ نظرِ منور
ہم دیکھیں کس طرح تجھے اسی مہرِ نیم روز
ناکامی نگاہ ہی برقِ نظارہ سوز

تو وہ نہیں کہ تجھ کو متا شکرے کوئی

وحشتِ دوں کو کیا خیرِ فرقِ پاؤ دست اطفالِ گم و سرہین ہیں اپنی منہست

سر پہ پٹنے کا مفت میں ہوتا ہی بند و بست ہر سنگِ خوشت ہی صدفِ گوہرِ شکست

نقصانِ نہین جن سے جو سودا کرے کوئی

ہم چاہتے ضرور کچھ اپنے خدا سے عمر بڑھ جاتی شاید اور دعا و دولتِ عمر

تنگ آگئی مگر ترے عہد و فاسے عمر سر بر ہوئی نہ وعدہ صبرِ آواز سے عمر

فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

آوارگی دشت ہی وحشت دے کا شغل حسرت کشی ہو ضمت کے مارے ہوئے کا شغل

دامانِ جیب بھڑانا بھی ہو مرنے کا شغل بیکاری جنوں کو ہی سر پہٹنے کا شغل

جب تک ٹوٹ جائیں پھر کیا کرے کوئی

بیکار ہی سخن سے طبیعت کا خیز و میز انشاؤا اختراع سے بے جا نہیں گمیز

بے سود ہو نتیجہ افکارِ طبعِ تیز ہو وحشتِ طبیعت ایجادِ داس خیز

یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

روشن کلامِ دہر سے کافر ہی آسہ گویا چراغِ مرنے و بے نور ہی آسہ

مردا بھی اب یہ کہنے پہ مجبور ہی آسہ حسنِ فروغِ شمعِ سخنِ دودہر ہی آسہ

پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

*

(۱۳۰)

یہ داغ دکھا کر جو گلستاں میں ہنسا ہو عشاقِ دل افکار کے نزدیک خطا ہو
 نادم ہو کہ غرقِ عرقِ شرم ہوا ہو شبنم بہ گل لالہ نہ خالی ز ادا ہو
 داغِ دل پُر در و نظر گاہِ حیا ہو

ہو بوسےِ حنا سے یہ اٹھیں مستی بسیار مطلق نہیں حالِ دلِ غمگیں سے خبردار
 فرصت ہی نہیں لکھوں کے نظار سے زہار دلِ خون شدہ کشمکشِ حسرتِ دیدار
 آنسو بدستِ بت بدستِ حنا ہو

کم آتشِ سوناں سے نہیں حسرتِ دل بھی جلتا ہی اپنا ہو تو مٹ جائے گی ہستی
 سینے میں تمنا نے عجب آگ لگا دی شعلے سے نہ ہوتی ہوسِ شعلہ نے جو کی
 جی کس قدر افسردگیِ دل پہ چلا ہو

تصویر کی کیا قدر کریں غیر ہیں بد ذوق ہم محو ہیں اس درجہ کہ رکھتا نہیں جہِ ذوق
 جاسکتا نہیں آنسو سے تابہِ ابدِ ذوق مثال میں تیری ہو وہ شوخی کہ بصدِ ذوق
 آئینہ یہ اندازِ گلِ آغوشِ کشا ہو

قری کی صداؤں سے ہو ہر سروِ سہی دنگ ببل کے اس انداز سے ہر غنچہ ہو دلِ تنگ

دونوں میں نہ راسخ و نہ پنهان نہیں ہو سکتا
فری کین خاکسترو ببل قفس رنگ

ای نالہ نشانِ جگر سوختہ کب ہو

عادت نے تری ہست کیا ہست دل کو
مجبور بدلتا ہی پڑا حالتِ دل کو
بڑھنے نہ دیا دلولہ و جراتِ دل کو
خونے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو
معشوقی و بے وصلگی طُرفِ بلا ہو

وہ لاکھ جفا میں کرے دے لاکھ اذیت
دُستوار ہو آسان نہیں ترکِ محبت
کچھ پاسِ باں ہو ہمیں کچھ پاسِ مرگ
مجبوری و دعوائے گرفتاری اُلفت
دستِ تہہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہو

ہی قاتلِ عشاق پریشانِ گزشتہ
باقی ہو ابھی اس میں وہی شانِ گزشتہ
کہتی ہو عیاں قتل کے سامانِ گزشتہ
معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ
تینِ ستم آئینہ تصویرِ نما ہو

نظروں میں شبِ تار سے بدتر ہو چکی
شائقِ ترے انوار کا دل بھی ہو جگر بھی
روشن ہیں ترے نور سے دیوار بھی ویر بھی
ای پر تو خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی
سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہو

تقدیر ہی قدرت نے یہیں ہی ہو کچھ ایسی
ہم پر نہ پڑی ہو نہ پڑے تیری تجلی

محروم بجز میرے نہیں جلوے سے کوئی اڑی پر تو غور شبید جہاں تاب ادھر بھی
 سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہو
 جاتا تو ہوں دنیا سے مگر بادلِ ناشاد کیا کیجیے بے وقت پڑی موت کی افاد
 ارمان بھرے دل کی بھی ہو تجھ سے ہی فواد ناکر گناہوں کی بھی حسرت کی طے داد
 یارب اگر ان کروں گناہوں کی سزا ہو
 تو اہل زمانہ پہ جو مایل نہ ہو غالب یہ حسرت و حراماں کبھی حاصل نہ ہو غالب
 ہر زا کے سوا غیر کا تامل نہ ہو غالب بیگانگی خلق سے بیدل نہ ہو غالب
 کوئی نہیں تیرا تو مری جان حسدا ہو

(۱۳۱)

غلمان کی نیکل نہ صورت ہو عور کی سمجھے گا اس کو کیا کوئی ہو بات دور کی
 اک بہر امتحاں تھی ضیا کوہِ طور کی منظور تھی یہ نیکل تجلی کو نور کی
 قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی
 بہر نظارہ اہل جہاں کے جماؤ ہیں اندازِ ہوا دہی کرشمے ہیں چاؤ ہیں
 پھولوں کی بھیاں ہیں بدن پر جو گھاؤ ہیں اکٹوں چکاں کفن میں ہزاروں بھاؤ ہیں
 پڑتی ہو آنکھ تیرے شہیدوں پہ عور کی

وہ مہکباں کی جس سے نہ لذت اٹھا سکو دیکھو نہ جس کو خود نہ کسی کو دکھا سکو

خود جاسکو جہاں میں نہ گھر بیٹھے پاسکو واعظ نہ تم دیو نہ کسی کو پلا سکو

کیا بات ہو تمھاری شراب طور کی

پھر ہو رہا ہو مجھ کو قیامت کا سامنا ہو دغذغہ وہی جو کبھی زندگی میں تھا

یہ جان کر کہ آج ہو دن عدل و داد کا لڑتا ہو مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا

گویا ابھی سنی نہیں آواز صور کی

پھرتی ہو باغ باغ نہ غم ہو نہ کوئی سنج گانے کی ترانہ نوبے رباب و صنج

گویا ملے گا اس کو زبرگل سے کوئی گنج آمد بہار کی ہو چاہیل ہو نغمہ سنج

اڑتی سی اک خبر ہو زبانی طہور کی

مانا کہ یہ نگاہ سے ڈلے ہوئے تو ہیں عزت کو لیکن اپنی سنبھالے ہوئے تو ہیں

اُم القریٰ کی گود کے پالے ہوئے تو ہیں گویا نہیں چواں کے نکالے ہوئے تو ہیں

کب سے ان بتوں کو بھی نسبت ہو دوسری

مڑے ہی تھے ملا ہو جنہیں یوں کھلا جواب دیکھیں تو دیتے ہیں میں پرے سے کیا جواب

خطرہ نہیں کسی کو اگر مل گیا جواب کیا فرض ہو کہ سب کو ملے ایک سا جواب

آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

مِثْلِ زَبَانِ شمعِ زباں میں ہو وہ اثر پھونکا اُسے کسی سے ہوئے ہم سخن اگر
پر کالہ آگ کا تھیں کست ہو ہر بشر گرمی اسی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

مَرزا یہ شوقِ حج کا ہو جس طرح اب ہیں اُس وقت تھیں نہیں لے غالب جس پر ہیں
آخر یہ بات کہہ گیا وہ آکے جوش میں غالب گرا اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی



(۱۳۲)

اس کو جو غم گردشِ ایام بہت ہو اس واسطے جو یا بے ہو و جام بہت ہو
مُوخواری و زندگی میں یہ بدنام بہت ہو غم کھانے میں بودا دلِ کام بہت ہو
یہ رنج کہ کم ہو مئےِ گلِ فام بہت ہو

مجھ رنڈ بلا نوش کو چسکا ہو یہ مو کا ہو بانِ سرِ جوش ہی اس کی نہیں پروا
میں شوق سے لے لو گنا جو تلچٹ بھی وہ بے گنا کہتے ہوئے ساقی سے جیا آتی ہو ورنہ
ہو یوں کہ مجھے دُرِ دتہبِ جام بہت ہو

پنہاں نہیں لبِ دِامِ گلستاں کی نہیں میں خطرہ ہی نہیں کوئی دلِ گوشہ گزیں میں
پچھتے نہیں اب خارِ المِ قلبِ حزن میں فی تیر کماں میں ہو نہ صیا و کیس میں

گوشہ میں نفس کے مجھے آرام بہت ہی

لاہج سے جو تکلیف عبادت کی اُٹھائی اس عابد ناداں نے عبرت عمر گنوائی

کیا فائدہ اعمال میں جب ہو نہ صفائی کیا نہ ہد کو مانوں وہ نہ ہو گرچہ ربائی

پاداشِ عمل کی طبعِ خام بہت ہی

آزادہ روی شیوہ بتائے ہیں انسان سلوم نہیں سمجھے ہیں کیا جی میں وہ ناداں

آزاد تو ہو ہی نہیں سکتے کسی عنوان میں اہلِ خرد کس روشِ خاص پٹاڑاں

پابستگی رسم و رہِ عام بہت ہی

پینے میں لگے باغِ گلِ عام کے دھبے ان سے غلِ آجائے نہ ارکانِ مرجع کے

فرصت میں نہ راہِ چھ کے دھولان نہیں پہلے زفرم ہی پہ چھوٹو مجھے کیا طوفِ حرم سے

آلودہ یہ موحی جامہ احرام بہت ہی

تردید نہ کی اس کی کبھی میں نے کہا جو مجھ پر وہ عنایت کی نظر رکھتے ہیں اسب تو

حیرت ہو یہ برتاؤ ہوا درِ وصل نہ پھر ہو ای قہر گرا بھی نہ بنے بات کہ ان کو

انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہی

میں یہ نہیں کہتا مجھے مرنا نہیں اور مرگ بیج جاؤں تو کچھ حرج بھی تیرا نہیں اور مرگ

حاشا کہ مجھے جان کی پروا نہیں اور مرگ غل ہو کے جگر آکھ سے ٹپکا نہیں اور مرگ

رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہی
 کیا دل کش و دھپسپ ہیں مزا کے ترانے بخشی ہی عجب طبع رسا اُس کو خدا نے
 مانا ہی اسے راہنما سب شعرا نے ہو گا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے
 شاعر تو وہ اچھا ہی پہ بدنام بہت ہی

(۱۳۳)

کیا کیجیے کہ دل ہی پریشاں کیے ہوئے آئینہ دار ہی مجھے حیراں کیے ہوئے
 ہو انتظار آمد جاناں کیے ہوئے مدت ہوئی ہی بار کو کہاں کیے ہوئے
 بوش قبح سے بزم چھا غاں کیے ہوئے
 دل کو تو چشمِ تر نے دیا اشکِ بخوں میں کھو کیا خاک مجھ سے کوئی نیا انتظام ہو
 کردوں گا پیش کش ہی حاضر ہو گھر میں جو کرتا ہوں جمع پھر بگر نخت نخت کو
 عرصہ ہوا ہی دعوتِ مرگاں کیے ہوئے
 مدت کے بعد جوشِ جنوں نے کیا کرم تاب سکون و صبر گئی دل سے یک قلم
 وحشت کی دک تھام نہ اب کر سکیں گے ہم پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہی دم
 برسوں ہوئے ہیں چپک گریباں کیے ہوئے
 سینے میں پھر وہ آگ بھڑکنے لگی کہ بس پھر جل کے خاک ہو گا تن زار مثلِ خس

پھر ضبط آہ پر نہ رہا دل کو دسترس پھر گرم نا لہائے مشر بہا رہی نفس
مذت ہوئی ناو سیر چراغاں کیے ہوئے

کیا پوچھتے ہو کیا ہی غضب ہو بلا ہے عشق سر سے ملے گا نہ اب تاں ٹلا ہو عشق
دل کیا کہ اب تو در پئے جاں بر ملا ہو عشق پھر پریش جراحِ دل کو چلا ہو عشق
سامانِ صد ہزار نکداں کیے ہوئے

پھر دل میں شوقِ دید سے ہو دردِ جاگل پھر شکِ غم بجاؤں گا آنکھوں میں
دکھلاؤں گا وہ رنگ کہ مانی ہو منقل پھر بھر رہا ہوں خامہِ مژگاں بخونِ دل
سازِ چین طرازیِ داماں کیے ہوئے

پیش آ رہا ہو عشق میں اک واقعہ عجیب بیٹھے بٹھائے پنپنے گئے آفت میں و غریب
کیا دور ہو کہ دونوں میں پھر جائے عنقریب باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر قریب
نظارہ و خیال کا ساں کیے ہوئے

وحشت میں بڑھ رہی ہو سواریوں کی ڈالت کے محلے کو کیا چاہتا ہو طو
کھل کھیلنے کے بتو تھامنے ہیں پڑ بہ پڑ پھر دل طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہو

پندار کا صنم کچھ دیراں کیے ہوئے

پھر ہو مرین عشق کو تیار کی طلب پھر اس دل غمیں کو ہو غمخوار کی طلب

الفت کو پھر نہ گری بازار کی طلب پھر شوق کر رہا ہوں سریدار کی طلب
 عرض متاع عقل و دل و جاں کیے ہوئے
 ہو رنگِ یوسے گل کا جو پیش نظر خیال گاشن میں جا کے مست ہو پھر سرسبز خیال
 گلگشت میں جما ہوا ہو پھر ادھر خیال دوڑے ہو پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
 صد گلستاں نگاہ کا سا ماں کیے ہوئے
 سمرنامہ اس کے خط کا ہو اس رجب دلِ بابا جس کے ہر ایک حرف پہ ہیں جانِ دلِ فدا
 مضمونِ شوق دیکھئے لاتا ہو رنگ کیا پھر چاہتا ہوں نامہ دلدار کھولنا
 جان نذرِ دلِ فریبی عنوان کیے ہوئے
 تسکینِ سیرِ باغ سے کیا ہوگی ہم نفس بے یار ہیں نظر میں گل تر بھی خارِ خوش
 بے چین ہو رہا ہوں کہ دل پر نہیں ہوں مانگے ہو پھر کسی کو لبِ بام پر ہوں
 زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے
 بے وجہ تو نہیں ہوں میں آوارہ کو کب پھر تا ہوں تیغِ زن کے تحس میں چارو
 تیغِ نگاہ کی ہو ان آنکھوں کو جستجو چاہے ہو پھر کسی کو مقابل میں آرزو
 سمر سے تیز دشنہ مڑگاں کیے ہوئے
 مرغوبِ چشمِ شوق نہیں روئے ہر ماہ اس گل کی بزمِ پیش کی دل ڈھونڈتا ہوا

کب سامنے ہو دیکھیے سانی کی جلوہ گاہ اک نو بہارِ ناز کوتاہ کے ہر پھر نگاہ

چہرہ فروغِ موسے گلستاں کیے ہوئے

تا چند انتظار کا دُکھ جھیلے رہیں کب تک رہیں چارہ احباب کے رہیں

تا چند یوں جدا درِ ولد از سے رہیں پھر جی میں ہو کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں

سرمزیدِ بارِ منت و رباں کیے ہوئے

طاقت نہ وہ خیال میں باقی نہ اب رہن وہ دن گئے کہ چین نہ پڑتا تھا یا رہن !

رہتے تھے اس کی یاد میں و دل مٹھن جی ڈھونڈتا ہوا پھر وہی موصفے اٹھن

بیٹھے رہیں تصویرِ جاناں کیے ہوئے

کیا سہل بات تھی کہ یہ سیلاب رک سکے روکا یہ جوش جس نے وہ حرزا ہیں تو تھے

اب بھی ہیں اپنی آنکھوں میں رہا بھرے ہوئے غالب اب ہیں نہ چھڑے پھر جوش انک سے

بیٹھے ہیں ہم تہیہ طوفاں کیے ہوئے

*

(۱۲۴)

جھاسے یا رتسلی ہو اک جہاں کے لیے خبر خوشی کی ہو آزادی و اماں کے لیے

ہوئی ہو وجہ تسلی دلِ تپاں کے لیے نوید امن ہو بیدار دوست جاں کے لیے

رہے نہ طرزِ ستم کوئی اسماں کے لیے

غدا سے غم تو دل بے قرار و محزون ہو جگر کی تاک میں وہ دیدہ پرافسوں ہو
پڑی وہ لوٹ کہ حالت مری دگرگوں ہو بلا سے گر مژدہ یا رشتہ خوں ہو
رکھوں کچھ اپنی بھی مرگاہِ خونچکاں کے لیے

خطا معاف یہ ہو التماسِ خلق اورِ خضر تمہیں نہیں ہو ذرا بھی تو پاسِ خلق اورِ خضر
چھپے ہو تم تمہیں ہی ہر اسِ خلق اورِ خضر وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اورِ خضر
نہ تم کہ چورہٹے غیر جا وداں کے لیے

یہاں تاک سے دل میں تپتی ہو کثرتِ رشک کہ بات بات کا ہر اواب علامتِ رشک
کسی کو غیر کی راحت پہ ہوگی عادتِ رشک رہا بلا میں بھی میں مبتلا سے آفتِ رشک
بلا سے جاں ہو ادا تیری اک جہاں کیلئے

وہ شہنی کہ جو قاتل سے اتنا نہ ہیں قریں انہیں کو اس سے جدا کر کہ ہو مجھے تسکین
کبھی تو دُور سے ہو آزمائش ان کی کہیں فلکست دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
درازدستی قاتل کے امتحاں کے لیے

پڑا ہوا تو ہوں زنداں میں بستہ زنجیر قرینہ یہ تھا کہ کرتا نجات کی تدبیر
مگر مجھے تو یہ دُھن ہو کہ گھر کو دل تعمیر مثال یہ مری کوشش کی ہو کہ مرغِ اسیر
کرتے نفس میں فراہمِ حسِ اشیاء کے لیے

پڑا ہوا تھا میں ہونی اس آستان پہ رمائے اس آرزو میں کہ دربان کو ترس آجائے
اسے بھی کوئی خصومت نہ تھی کہ مجھ کو اٹھائے گدا سمجھ کے وہ چپ تھامری جوشامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کیلئے

سخن میں چاہیے کوئی جدید طرزِ عمل کہ طبع تیز کا کچھ حوصلہ تو جائے غل
نہ کیوں ہو جدِ تغزل میں ہ کے جی بے گل بقدر شوق نہیں ظرفِ تنگ سے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کیلئے

ملا ہی جو طرب و عیش اس کو قسمت سے بھلا وہ اس کے سوا ہی نصیب اور کسے
شا دیا حسد و رشک کو بھی قدرت نے دیا ہی خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہی عیشِ تھلِ حسینِ خاں کے لیئے

یہ ذکرِ غیر مرے لب پر آگیا کس کا بھرا سرور سے دل اور جگر ہوا ٹھنڈا
مجھے بیان پر اپنے ہی وجد کیوں اتنا نباں پہ بار خدا یا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری نباں کیلئے

ای کی شان کے شایاں ہو شانِ شوکتِ ملک اسی کے واسطے موزوں ہی جاہ و شہمتِ ملک
رہے ہمیشہ ہیں ہی برقرارِ ثروت و ملک نصیرِ دولتِ فردیں اور معینِ ملت و ملک
بنا ہی چرخِ بریں جس کے آستان کے لیئے

ہر اک بشیر کے لیے عیش کی ہو افزائش خدا کے فضل سے آیا ہو دور آسائش
 نئے طریق سے ہر شو کی ہوگی زیبائش زمانہ عہد میں اس کے ہو محو آسائش
 بنیں گے اور ستارے اب سماں کیلئے

بھی تو مہج کی تہید و استراہی ہو نہ مہج لکھی گئی ہو نہ میں نے لکھی ہو
 ابھی کہاں مری طبع رسا نے بس کی ہو ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہو
 سفینہ چاہیئے اس بحر بے کراں کے لیے

عجیب ڈھنگ نکالا ہو مدح گوئی کا غزل سی شو میں دکھایا ہو اس نے رنگ نیا
 طبیعت اس کی ہو جذبات پسند از مرزا اداسے خاص سے غالب ہوا ہو نکتہ سرا
 صلائے عام ہو یا ران نکتہ واں کے لیے

(۱۳۵)

کم ہو غیروں سے اگر مہر و وفا اور سہی کوئی برتاؤ مروت کا نیا اور سہی
 میری ایذا سے جو دل خوش نہ ہو اور سہی میں ہوں مشتاق جھانجھ پہ جفا اور سہی
 تم ہو بیاد سے خوش اس سے سوا اور سہی

رات دن گم ہو اور آٹھ پہر نالہ و آہ سوگ تم نے تو کچھ اس درجہ منایا کہ پناہ
 مری جانے دو اگر مری گیا ہو گمراہ غیر کی مرگ کا غم کس لیے ای غیرت ماہ

ہیں ہوس پیشہ بہت وہ نہ ہوا اور سہی

کبر و نخوت کی مانے میں دہائی کیوں ہو
دل میں ناحق ہوس خام پکائی کیوں ہو
خود نما کیوں ہو غودی سر میں سمائی کیوں ہو
تم ہو بہت پتھر ہیں پندارِ خدائی کیوں ہو

تم خداوند ہی کہہ لاؤ خدا اور سہی

یہ تو مانا کہ حسینوں کی نہیں کوئی کمی
آن بان ایسی کسی میں کبھی دیکھی نہ مٹنی
منہ حسینانِ ارم آکے ملائیں تو سہی
حُسن میں آپ بڑھ کر نہیں ہونے کی کبھی

حور کا شیوہ انا زو ادا اور سہی

کیا قیام اور قعود اور ہی سجدہ کیسا
سر مرا جھک نہیں سکتا ہی ترے در کے سوا
ٹھا جو بے چین تو بہر پھر کے ادھر ہی پہونچا
تیرے کوچے کا ہو مالِ دل مضطر میرا

کعبہ اک اور سہی قبل نما اور سہی

کیا انوکھا چمن حسلہ بریں ہو واعظ
باغ دیکھے ہی نہیں تو نے یقین ہو واعظ
تیری باتوں کا ٹھکانا بھی کہیں ہو واعظ
کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہو واعظ

خلد بھی باغ ہو خیر آب دہوا اور سہی

یاں تو دل کھول کے ارمان نکالیں یارب
تنگی دہر کی کچھ داد تو پالیں یارب
سیر کا لطف تو جی بھر کے اٹھالیں یارب
کیوں نہ فردوس میں دوزخ بھی ملا لیں یارب

سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

کر دیا ہو غم ہجراں نے مرا حال زبوں بڑھتے بڑھتے خفان پہنچی ہو نوبت بہ جنوں
دیر مرنے میں لگے گی جو کھلائی انبیوں مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں

زہر کچھ اور سہی آبِ بہتا اور سہی

طبع دیوان سے جو غالب نے فراغت پائی یار و احباب نے قرنائی آفت ڈھائی
کی غزل نظم تو یوں لب پہ شکایت آئی مجھ سے غالب یہ علای نے غزل لکھوائی
ایک بیدار اگر رنجِ فرا اور سہی

(۱۳۷)

شکوہ درد بھی اک گونہ خطا ہو تو سہی نالہ و آہ سے اظہارِ جفا ہو تو سہی
صبر میں اُفت بھی منافی رضا ہو تو سہی آپ نے مسکنی الضحیٰ کہا ہو تو سہی
یہ بھی یا حضرت ایوب گلا ہو تو سہی

ہمنشیوں کو ہو کیا میری مصیبت کی خبر کرتے ہیں صبر کی تقلید مجھے آٹھ پہر
دل ہی تو ہومرے سینے میں نہ کوئی پتھر بچ طاقت سے سوا ہو تو نہ پیٹوں کیونکہ

لے غزل نمبر ۱۲۰۔ دیوانِ مطبوعہ میں نہیں ہوا؛ دوسرے مسئلے احمد اول تو موسومہ نواب بن الدین احمد صاحب ہیں برج ہی ۱۲

ذہن میں خوبی تسلیم درضا ہو تو سہی

آس باقی ہو تو برسوں ہمیں بہلائے گی عمر
سبز باغ آٹھ پہن کر میں دکھلائے گی عمر
داد ملنے کے لیے گو پونہنی تڑپائے گی عمر
ہو غنیمت کہ یہ اُمید گزر جائے گی عمر

نہ ملے داد مگر دوزخ بنا ہو تو سہی

کس کا چارہ فقط الزام سے ہتے ہیں بری
کون اٹھاتا ہو رضیوں کے لیے دوسری
منہ نہ کھلواؤ کہ احباب کی ہو ہر وہ درسی
دوست ہی کوئی نہیں ہو کرے چارہ گری

نہ سہی ایک مٹنا سے دوا ہو تو سہی

ہم سے برتاؤ ہو جو کچھ اسی قابل ہم تھے
کہئے بد عہد و جفا کا رُسے کس منہ سے
بے مروت ہو وہ کیونکر کوئی انصاف کرے
غیر سے دیکھیے کیا خوب نبا ہو اس نے

نہ سہی ہم سے پر اس بت میں وفا ہو تو سہی

گو کہ واقف نہیں تقدیر کے احوال سے ہیں
خطِ قسمت نہیں پڑھ سکتا کسی حال سے ہیں
یوں لگاتا ہوں پتہ اپنے ہی افعال سے ہیں
نقل کرتا ہوں اُسے نامہ اعمال سے ہیں

کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہو تو سہی

جس طرح صبر سے مَر ڈانے گزاری غالب
زندگی کا ٹوا سی طرح سے تم بھی غالب
جان دیتے ہی کسی روز بنے گی غالب
کبھی چل جائے گی کیوں کرتے ہو جلدی غالب

شہرہ تیزی شمشیر قصا ہو تو سہی

نوٹ: یہ غزل^{۱۳۶} نواب احمد سعید خاں صاحب طالب رئیس دہلی کا عطیہ ہو فرماتے تھے کہ میں ہر وقت پھوپھا جان (غالب) کی خدمت میں حاضر باش تھا نیا کلام اپنی یادداشت میں لکھتا تھا اور مجلس یہ غزل ہو۔

قطعہ تاریخ تکمیل وراق ہذا

ظاہر ہوئے معانی حل ہو گئے مطالب
بولاسروش غیبی روح کلام غالب

۱۳

کی شرح نظم غالب تصنیف میں جو مرزا
جی میں خیال آیا تاریخ اس کی لکھیے

تمام شد
مطبوعہ نظامی پریس ہاپون
(محمد اجدالدین پرنٹر)

LIBRARY

UNIVERSITY

روح کلام غالب

غزلیات غالب
ہم کی شعری تشریح

مصنف

مرتب و اشاعی

سید افتخار حسین زریں غالب ثانی مرا عزیز بیگ ہما مرا مہر و موم

شائع کنندہ: نشریات ادب ایکڈمی

بازار نمنا سہارن پور یو پی

تعارف

غزّ غالب کی تصانیف میں ان کے دیوان اردو کو ہر زمانہ میں ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے اور آج بھی مرزا کا درجہ سخنوری ہر طرح کی توصیف و تعارف سے بے نیاز ہے، یہی وجہ ہے کہ ۱۸۴۱ء سے ایک مرزا کے دیوان کے لاتعداد اچھے اور برے، سادہ و دیگر کارنستے شائع ہوتے رہے ہیں، اور یہ سلسلہ یہیں پر بس نہیں ہو جاتا بلکہ شاعرین و اہل قلم نے غالبیات کو ایک مخصوص ادبی موضوع بنالیا ہے۔ مختلف ادوار اور محققین نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق کلام غالب کو نئے نئے انداز سے پیش کیا ہے اور آج کلام غالب پر گرانمایہ کتابیں وجود میں آگئی ہیں!

روز روشن کی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ کلام غالب پر جو کتابیں اب تک منظر عام پر آچکی ہیں ان میں مولانا حالی کی ”مادگار غالب“ اور مولانا محمد حسین آزاد کی ”ابحیات“ کلام غالب کی قدر و منزلت کے عالیشان قہر کی سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں اسی سلسلہ کی ایک کڑی جناب مرزا عزیز بیگ صاحب مرزا سہا پنپوری کی شاہکار کتاب ”روح کلام غالب“ بھی ہے۔

”روح کلام غالب“ کے فاضل مصنف نے اس کتاب میں غالب کی تمام غزلوں کی تفہیم کچھ اس انداز سے کی ہے جیسے غالب کے کلام کی روح کھینچ کر صغہ قرطاس پر منتشر کر دی ہو۔ یہ کتاب غالب کے کلام کی زبان شعری مکمل شرح ہے جس سے غالب کے اشعار کا مفہوم غالب کے ذہن میں کیا تھا بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

مرزا عزیز بیگ صاحب مرزا نے ۱۹۲۳ء میں یہ کتاب مکمل کر دی تھی لیکن جس طرح

مرزا غالب اپنی حیات میں خود اپنا دیوان شائع نہ کر سکے بالکل اسی طرح مرزا سہارن پوری بھی مروح کلام غالب اپنی حیات میں زیور طبع سے آراستہ نہیں کر سکے بہر حال کتاب شائع ہونی تھی اور ہوئی مگر مرزا صاحب کی وفات کے بعد ۱۹۲۵ء میں مروح کلام غالب زیور طبع سے آراستہ ہو کر کچھ ہی دنوں میں نایاب ہو گئی اور شائقین اس کے مطالعہ کیلئے ترپتے رہے۔

اب جناب مرزا عزیز بیگ صاحب مرزا مرحوم کے وارثان کی کرم فرمائی سے نشریات ادب اکیڈمی سہا پور کو اس نادر و نایاب شاہکار کو دوبارہ شائع کرنیکی سعادت نصیب ہوئی۔ ارباب اکیڈمی جناب مرزا حمید بیگ صاحب اور جناب مرزا سلطان بیگ صاحب وارثان مرزا سہا پور کے انتہائی شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کے شائع کرنیکی اجازت مرحمت فرمائی۔

”روح کلام غالب“ میں کچھ دلچسپ اور ضروری حاشیوں کا بھی اضافہ کیا گیا ہے وہ یہ کہ جن اشعار کی مرزا غالب نے خود تشریح کی ہے دج کر دی گئی ہے اور اکثر مشکل اشعار کے مطالب بھی تحریر کر دیئے گئے اسکے علاوہ ایک ضمیمہ بھی شامل کیا گیا ہے جس میں مرزا عزیز بیگ صاحب مرزا مرحوم کی وہ تفسیریں جو انھوں نے مولانا جامی، میر وحید گلشنوی اور مفتی حبیب الدین سوزاں کے کلام پر کی ہیں اور غیر مطبوعہ بھی ہیں شائع کر دی گئی ہیں۔

میں ان ارباب ادب کا نہایت ممنون ہوں جن کی ادبی کاوشوں کے نتیجے ترتیب خواشی میں میرے زیر مطالعہ رہے ہیں ان میں جناب پرتھوی چند رمولف، مرقع غالب، کا نام نامی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

سید افتخار حسین زیدی

۱۵ جنوری ۱۹۶۸ء

مقدمہ طبع دوم

(حکیم مشرف مظاہری سہارنپوری)

غالب کا یہ اپنا خیال نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ بے آدمی بجائے خود اک محض خیال۔
اور اسی بنا پر وہ غلوت کو بھی انجمن سمجھتا اور بنا لیتا ہے لیکن کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنی
پہلو وار خصوصیات اور صبر طراز فطرت کی بدولت بجائے خود ایک انجمن ہوتی ہیں۔ انھیں
لوگوں میں غالب بھی ہیں جن کی نظم نما مشورا اور گونا گوں کمالات میں محصور شخصیت فرد واحد
کی نہیں بلکہ ایک وسیع ادارے اور قابضہ اکیڈمی کی حیثیت رکھتی ہے۔

اسد اللہ خاں غالب کے اشعار الہامی قسم کے ہوں یا اہمالی۔ طرز بیان ہو یا
تشبیہات و استعارات۔ فصائد ہوں یا خطوط۔ فلسفہ ہو یا تصوف۔ مذہبی مسائل
ہوں یا اخلاقی قدریں سب میں انفرادی شانِ صحت مند صبریت۔ دل کش آن بان اور
آزاد روی ہے اور بلاشبہ اردو شاعری و نثر نگاری کے طویل و عریض میدان میں ان کا
کوئی حریف نہیں۔ ————— عرفان غالب کے سلسلے میں مولانا حالی اور
ان کے بعد اکثر قدما و اصحابِ علم نے بہت کچھ لکھا ہے مگر گزشتہ نصف صدی کے
دوران جس تسلسل۔ قریبے۔ محنت۔ علوم اور لگن کے ساتھ کام ہوا ہے وہ کافی حوصلہ
افزا اور لائقِ مدحِ تحسین ہے۔ اور یہ اہم سلسلہ قاضی عبدالودود۔ مولانا اقبال علی
حقی۔ مولانا غلام رسول جہرآل احمد سرور۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی۔ خواجہ احمد فاروقی۔

مالک رام ایم اے۔ پروفیسر حمید احمد خاں۔ مولوی ہمیش پرشار، عبادت بریلوی۔
 رشید احمد صدیقی۔ شوکت بزرگاری۔ ظان نصاریٰ۔ پرتھوی چندر اور کوثر جہان پوری
 وغیرہ حضرات کے طفیل جاری و ساری ہے۔ اس کا نتیجہ نہ صرف یہ کہ غالب غالبیات
 سے متعلق نہایت اہم سرمایہ معلومات جمع ہو گیا ہے بلکہ ممتاز شاعری۔ فلسفہ حیات
 نفسیات انسانی اور فن تنقید کے تحت اردو ادب میں معتد بہ افادی مواد کا اضافہ
 ہوا ہے اور ان دونوں امور کا ثمرہ تازہ اور مسرت آگے پہلو یہ ہے کہ اب دوسری
 زبانوں اور دوسرے ممالک کے محققین و اہل قلم بھی مطالعہ غالب اور اردو ادب و
 شاعری میں دل چسپی و انہماک سے حصہ لے رہے ہیں۔

تضمین کلام غالب۔ رباعی کی طرح تضمین بھی اپنے تقاضوں کے
 لحاظ سے مشکل ترین صنف ہے خصوصاً کسی دوسرے شاعر کے کلام کو تضمین کرنا۔
 کیوں کہ اس میں اصلی شعر کے اقدار کو برقرار ہی نہیں رکھنا پڑتا بلکہ کہیں ردیف اور
 کہیں ردیف و قافیہ دونوں کا پابندی کرنا پڑتا ہے۔ اس کی توفیح کے ساتھ
 مقصود کلام کو نئے انداز سے نکھارا جاتا اور بیان کو زیادہ موثر بنانے کے لئے مزید
 دلائل و تشبیہات سے وسعت دی جاتی ہے۔ یہ صنف کتنی مشکل ہے اس کا محکم
 جواب اور قاطع ثبوت میر مہدی قزوینی ایسے قادر الکلام و باصلاحیت شاعر اور
 غالب کو تضمین کرنے کا بیڑا اٹھایا لیکن چند گام چلنے کے بعد ہی انھوں نے محسوس
 کر لیا کہ اس کوہ کئی میں بے قدم قدم پر مڑنے نفس نفس پر امتحان ہیں۔ نیز اس

تضمین کلام غالب کے لئے یہ موضوعات کام

عرصے میں انھوں نے جو کوشش کی تھی اس کے نتیجے پر جب ناقدانہ نظر ڈالی تو اس کو کسی درجے میں بھی اہم قرار نہ دے سکے اور خیال کیا کہ اگر فکر و تئیسہ فرما دے کلام کے یہ جوئے شیر مکمل بھی کر لی تب بھی وہ شیریں کے حصول کا حامن کامیابی ذریعہ ثابت نہ ہو سکے گی۔ لہذا یہ سوچ کر کہ چار مردے از غیب بروں آید و کارے بکندہ“

اس معرکہ عظیم کو برسرِ کئے کا خیال ترک کر دیا۔ اس نا کافی عزم اور شکستِ بہت کو ہم میر جبروع کی باصلاحیت شخصیت کی نقیص پر دال نہیں سمجھے کیونکہ بلاشبہ وہ اس کلام کے اہل بھی تھے۔ ان کا ارادہ نیک بھی تھا اور کلام غالب کی شرح کے لئے ان کی نگاہ انتخاب نے موزوں ترین راہ بھی اختیار کی تھی مگر قدرت اس کارنامے کا سہرا کسی اور ہی کیلئے مقدر کر چکی تھی اس لئے میر جبروع کا خواب شرمندہ تعمیر نہ ہو سکا۔

روح کلام غالب :- میر جبروع کے بعد غالب کے وسیع حلقہ شاگردان میں نہ جانے کتنے اصحاب کے دلوں میں اس آرزو نے طوفان بپا کیا ہو گا مگر یہ قرۂ فال غالب کے پوتا شاگرد مرزا عزیز میگ صاحب مرزا سہارنپوری (تمیذ حضرت سوزاں) کے نام نکل چکا تھا اور حق یہ ہے کہ انھوں نے بصورتِ احسن یہ حق ادا کیا۔ کلام غالب کی تشریح و توضیح میں غالب کے توانا طرزِ فکر اور حسن ادا کو ایک چابکدست مصور اور دقیقہ رس فنکار کی حیثیت سے مزید دلاؤ و نیری و نگینی عطا کی اور ایک ایسا کارنامہ انجام دیا جس کی اردو، فارسی اور ہندی شاعری کی طویل تاریخ اب تک نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے اور جس پر اردو شاعری اور غالب نواز حلقہ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

رکھیں غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف جس وسیع پیمانے پر اور بالغ نظری سے غالب و غالبیات پر اہل قلم حق تنقید و تحقیق ادا کر رہے ہیں اور غالب سے متعلق معمولی سے معمولی واقعے کو منظر عام پر لا رہے ہیں اس اعتبار سے یہ امر انتہائی حیرت زا اور باعث افسوس ہے کہ مرزا عزیز بیگ مرحوم کی ”روح کلام غالب“ کو بجائے اسکے کہ اسکی کا حق قدر افزائی ہوتی اس کے ساتھ بے اعتنائی و بے نیازی کا وہ مظاہرہ کیا گیا ہے کہ غالبیات کا مطالعہ کرنے والے طبقے میں چند فیصد بھی اس سے واقف نہیں اور اس بے رحمانہ عدم التفات کے طفیل یہ پیکر خوبی ج

آفتاب لیکن اثر سحر نازد

حرف آخر وہ نظامی صاحب کے مقدمے میں آپ میر محمد روح اور رضا ”روح کلام غالب“ کی تفصیلات کا موازنہ ملاحظہ فرمائیں گے اسلئے میں اس سے صرف نظر کر کے اس سلسلے کی سب اہم کڑی اور تفصیل کا ایک نایاب نمونہ پیش کرتا ہوں یہ تفصیل مرزا غالب نے شاہ ظفر کی غزل پر کی ہے جو ۱۷ اپریل ۱۸۵۷ء کے ”اردو انبار دہلی“ میں شائع ہوئی تھی اس تفصیل سے بخوبی واضح ہو جائیگا کہ مرزا عزیز بیگ مرحوم کی تمام تفصیلات کا معیار و وزن کیا ہے؟ اور کیا ”روح کلام غالب“ اردو ادب میں مقام رفیع پانے کی مستحق نہیں؟ اور کیا یہ تصنیف نادرہ ماضی کی طرح اب بھی گمنامی و بے اعتنائی کی نذر ہو جائے گی۔

غزلِ ظفرِ تضمینِ غالبؔ

گھستے گھستے پاؤں میں زنجیرِ آدمی رہ گئی مرگئے پر قبر کی تعمیرِ آدمی رہ گئی
 سب ہی پڑھتا کاش کیوں پھر لکھی گئی کھینچے قاتل جب تری شیرِ آدمی رہ گئی
 غم سے جانِ عاشق دگرِ آدمی رہ گئی

بیٹھ رہتا ایسے چشمِ پرِ غم اس کے روبرو کہوں کہا تو نے کہ کہہ دے کا غم اس کے روبرو
 بات کرنے میں لگتا ہے دم اس کے روبرو کہہ سکے ساری حقیقت ہم نہ اس کے روبرو
 ہم نشیں آدمی ہوئی تقریرِ آدمی رہ گئی

تو نے کیا مچھڑکیسی بن گئی اے رازدار خوابِ بیلاری پر کب ہو آدمی کو اختیار
 مثلِ زخمِ آنکھوں کو سی دیا جو ہوتا ہوشیار کھینچتا تھا رات کو بس خواب میں تصویرِ یار
 جاگ اٹھا جو کھینچنی تصویرِ آدمی رہ گئی

غمنے جب گھیرا تو چاہنے یوں دلنواز مستی چشم سیرِ چل کے ہوئیں چارہ ساز
تو صلائے پاس جاگتا تھا جو خواب ناز دیکھتے ہی اے سنگتِ تیری چشم نیم باز
کی تھی پوری ہم نے جو بندیرِ ادھی رہ گئی

اس بت مغرور کو کیا ہو کسی پر التفات جسکے حسنِ روزِ افزوں کی لکڑی دے ہر بات
ماہِ نوکلے پر گزری ہو نگلی راتیں پان سات اس رخِ روشن کے آگے ماہِ یکِ سفہ کی رات
تابشِ خورشید پر تنویرِ ادھی رہ گئی

تا چھپ چائے کاشِ بخت بے ہنگامات میں ہاں فراوانی اگر کچھ ہو تو بے آفات میں
جرمِ وِج وِلم کھائے ہر اک بات میں کم نصیبی اسکو کہتے ہیں کہ میسے ہات میں
آتے ہی خاصیتِ اکسیرِ ادھی رہ گئی

سب بیگوشہ کنائے ہر گلے لگ جاوے آدمی کو کیوں پکائے ہر گلے لگ جاوے
کسے گر چادرِ آتائے ہر گلے لگ جاوے مانگ کیا بیٹھا سنوئے ہر گلے لگ جاوے
وصل کی شب لے بت بے پیرِ ادھی رہ گئی

میں یہ کیا جانوں کہ وہ کس واسطے ہوں پھر گئے پڑھیں پانا نہیں جاتا سنا جوں پھر گئے
 دیکھنا قسمت وہ آئے اور پھر یوں پھر گئے آگے آدمی دور میرے گھر سے وہ کیوں پھر گئے
 کیا کشش میں دلی اب تصویرِ آدمی رہ گئی

ناگہاں یاد آگئی مجھ کو یارب کب کی بات کچھ نہیں کہتا کسی دین ہا ہوں سبکی بات
 کسلے تجھ کو چھپاؤں ہا وہ پریشانی کی بات نامہ بر جلدی میں تیری وہ جوتی مطلب کی بات
 خط میں آدمی ہو کی تحریرِ آدمی رہ گئی

ہو تجلی برق کی صورت میں ہر سببی غضب ہاں کچھ گھنٹے کی ہوتی فرصتِ عیش و طرب
 شام سوائے تو کیا اچھی گزرتی رات سب پاس میسے وہ جو آئے بھی تو بعد از نصف شب
 نکلی آدمی حسرت لے تقدیرِ آدمی رہ گئی

تم جو فوٹے ہو دیکھ لے غالباً شفتہ سر ہم نہ تجھ کو منع کرتے تھے گی کیوں اسکے گھر؟
 جان کی پاؤں ماں باتیں سپہ ہیں مگر دل نے کی ساری خرابی لیگیامجد کو ظفر
 واں کے جانے میں مری تو قیرِ آدمی رہ گئی

محبِ مکرم جناب سید افتخار حسین صاحب زیدی ناظم نشریات
 ادب اکیڈمی اور سید عزیز حسن نسیم مدیر دیر و حرم سہارنپور لائقِ صد
 مبارکباد ہیں کہ اس دورِ ابتلا و گمراہی میں روحِ کلام غالب کو حیاتِ
 نو سے بہرور کرنے اور علمِ دوست اصحاب تک پہنچانے کے نیک
 جذبے سے اس کی طبعِ دوم کے لئے کمرِ ہمت باندھی۔ ع
 ”خدا فیض کرے انکو عشرتِ منزل“
 آمین

مقدمہ

(از مولوی نظام الدین حسین صاحب نظامی بدایونی)

میرے دوست مرزا محمد ظفر بیگ صاحب جی کے حسن سعی سے ”روح کلام غالب“ طبع ہو کر آج شائقین کے پیش نظر ہے۔ مجھ سے مہر ہوئے کہ میں اس کا مقدمہ لکھوں غالباً ان کا یہ اصرار اس بنا پر تھا کہ مجھے کلام غالب سے دلی لگاؤ رہا ہے اور اس کے فدائی ہونے کا فخر حاصل ہے۔ میری گونا گوں مصروفیتیں کچھ عرصہ تک مرزا صاحب کی تعمیل ارشاد میں مانع رہیں۔ جب تقاضا صبر سے بڑھا تو کچھ وقت اس کے لئے بھی نکالا۔ میں نے اس مقدمہ میں اختصار کو مد نظر رکھا ہے تاکہ ناظرین آسانی سے اس کے مطالعہ کے لئے وقت دے سکیں ورنہ کلام غالب کا موضوع اسی قدر دل چسپ اور وسیع ہے کہ اس پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ غالب غزل کا بادشاہ تھا اس نے اس صنف سخن کی ماہیت کو خوب سمجھا ہے۔ غزل کی تعریف مختصراً یہ ہے کہ اس میں جتنے مضامین ہوں وہ داخل ہوں اور ان کا درجہ اس قدر بلند ہو کہ ان سے انسان کی فطرت اور اس کی عظمت ہو پیدا ہو سکے اور اس کی وسعت ادراک کا پتہ چل سکے۔ یہ حقیقت ہے کہ جہلاً صناف سخن میں غزل گوئی جتنی آسان ہے اتنی ہی دشوار ہے اگر غزل غزل ہو تو اس کو بوستان نظم کا ایسا قطعہ کہنا چاہیے جسکی روشیں صواب معبود جنگ مرزا صاحب جی۔ اے آکس کی تحریک سے سب سے پہلے ۱۹۱۵ء میں میں نے اردو دیوان غالب معری اشارات اطلالی کے ساتھ نظامی پریس بدایوں سے (باقی آئندہ)

غیر مسلسل اور نامرغوب ہونے کے باوجود بے حد دل کش اور روح افزا ہیں۔ جس طرح آسمان پر چمکنے والے تاروں کی پلے تیلی ان کی خزاں فریبوں کو جلا دے دیتی ہے اسی طرح ایک بہترین غزل کے منتشر استعار اس کے حسن کو دو بالا کر دیتے ہیں اور یا ایں ہمہ نامرغوبی طے لگتی ہے۔ ”گل جلد پیدا لڈ دینا“ کا مصداق بن جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سر شعر نئی تخیل کا حامل ہوتا ہے اور ہر تخیل میں نئی نئی نکتہ آفرینیاں ہوتی ہیں۔ کہیں فلسفہ اخلاف و تصوف کے گوناگوں رموز عالم حیرت استعجاب طاری کر دے ہیں تو کہیں جذبات حسن و محبت کی بولہ بولہ فانی مسخو روئے خود بنادیتی ہے۔ غالب کے دیوان کو شروع سے آخر تک بڑھ جائے اس کا ایک ایک شعر اس معیار پر پورا اترے گا۔ یہ ہی وجہ ہے کہ غالب کا کلام جب پڑھئے سیا لطف آتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب کے کام میں اکثر استعار نثری طلب ہیں۔ اسی لئے اس کی متعدد و شہرہ لکھی گئیں جن میں طرح طرح کی مونسگافیاں کی گئی ہیں یہ بحث ہمارے موضوع سخن سے خارج ہے کہ یہ نثر و روح و جوانمندی اپنے مقاصد میں کہاں تک کامیاب ثابت ہوئے لیکن یہ امر مسلم ہے کہ غالب کے سوا زبان اردو کے کسی اور شاعر کے کلام کو یہ شہرت اور اہمیت اب تک نصیب نہیں ہوئی۔ اور نہ صرف اس لحاظ سے بلکہ دیگر خصوصیات شعری کی بنا پر آج ہمیں یہ فخر حاصل ہے کہ ہم دنیا کی دیگر مشہور زبانوں کے نامور اور عالمگیر شہرت رکھنے والے شعراء کے مد مقابل غالب کو پیش کر سکتے ہیں چنانچہ گزشتہ ستر سال زمانہ میں اس کے کلام کی خوبیوں کو جس بلند آہستگی کے ساتھ سراہا گیا ہے اور اس کی مدحت طرازی کی گئی ہے اس کے ثبوت کے لئے

گزشتہ سے پچھترہ سال قبل اس کے بعد ۱۹۱۸ء میں سلسلہ آصفیہ کی پہلی کڑی کے طور پر شروع ایڈیشن شائع ہوا۔ میری یہ شرح تعلیم یافتہ طبقہ میں اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کے پانچ ایڈیشن اس وقت تک نکل چکے ہیں۔ (نظامی)

ان ضخیم خروں کے علاوہ ملک کے نامور مصور جیتائی کا دیدہ زیب "مرقع" اور دیگر قسم قسم کے خوبصورت اور نظر فریب ایڈیشن موجود ہیں۔

کلام غالب کی قدر و منزلت کی یہ عالی شان عمارت جس کا سنگ بنیاد مولانا حالی مرحوم نے انیسویں صدی کے آخر میں "یادگار غالب" لکھ کر رکھا تھا آج "روح کلام غالب" کی اشاعت سے پایہ تکمیل کو پہنچ رہی ہے کسی شاعر کے ۱۰۰ بات کچھ کم قابل فخر نہیں کہ دیگر شعراء اس کی دوچار چیدہ ہزاروں کے اشعار پر مصرعہ نہیں اور ان کی تصنیف کر کے اپنے کلام میں شامل کر لیں لیکن اردو کیا فارسی میں بھی کوئی شہرہ نامہ شاعر غالباً ایسا نہیں ہوا جس کے پورے دیوان کی تصنیف کی گئی ہو۔ کلام غالب کی قدرا فرائی میں یہ ہی ایک کمی تھی جس کو "روح کلام غالب" (جو غالب کی تمام غزلوں کی تصنیف ہے) بدرجہ اتم پورا کرے گی اور اس لحاظ سے غالب کے توصیفی لٹریچر میں اس کو ایک قابل قدر اور شاندار ادبی اضافہ شمار کیا جانا چاہیے۔

اردو ادب میں تصنیف کا رواج دراصل فارسی کا اتباع ہے اردو میں فارسی غزلوں کی بھی تصنیف کی جاتی ہے اکثر شعراء خود اپنی غزل کی بھی تصنیف کرتے ہیں۔ یہ تصنیف دو قسم کی ہوتی ہے مثلث اور مخمس۔ مثلث میں اول مصرعہ تصنیف کا ہوتا ہے اور دو مصرعہ اصل نزل کے جس کی تصنیف کی جائے مخمس پانچ مصرعوں سے مراد ہے جس میں تین مصرعہ تصنیف کے ہوتے ہیں اور دو اصل نزل کے۔ اب زیادہ تر مخمس کا رواج ہے۔ مرزا عزیز بیگ مرحوم مصنف (روح کلام غالب) نے بھی مخمس ہی کو پسند کیا ہے یعنی غالب کے قصائد وغیرہ چھوڑ کر ہر غزل کے اشعار پر تین مصرعہ اپنے چسپاں کئے ہیں۔

تصنیف کی صرف یہ ہی خوبی نہیں کہ اس کے مصرعے اصل مصرعوں سے درست

مگر یہاں ہو جائیں بلکہ ان سے اصل شعر کے معانی اور مطالب کو خواہ وہ کتنے ہی دقیق اور
 لائیل ہوں اس لطافت کے ساتھ نمایاں کر دیا جائے کہ پوری تفہیمیں ایک ہی دل و دماغ
 کی شاعرانہ کاوشوں کا نتیجہ معلوم ہو۔ روح کلام غالب میں یہ تمام محاسن پوری طور پر نظر
 آتے ہیں لیکن چونکہ اول سے آخر تک ہر غزل کی تفہیمیں کی گئی ہے اس لئے اگر کہیں کہیں
 یکساں زور و قلم نسبتاً نہ پایا جائے تو انشاؤ کا معدوم کی بنا پر نظر انداز کرنے کے قابل ہے۔
 واقعہ یہ ہے کہ مصنف نے پورے دیوان کی تفہیمیں کرنے میں اپنی پوری قوت شاعر
 صرف کر کے کلام غالب کی حزاب کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ اس کی ادنیٰ خصوصیت یہ ہے کہ
 مشکل ترین اشعار کے معانی اور مطالب اس درجہ واضح ہو جاتے ہیں کہ کسی شرح کو رد کیجئے
 کی ضرورت باقی نہیں رہتی اس لحاظ سے روح کلام غالب کو دیوان غالب کی تمام شرحوں
 پر فوقیت حاصل ہے اور اس کا اندازہ صرف اتنی بات سے ہو سکتا ہے کہ غالب کے جن
 مشکل اشعار کی شرح میں دیگر شارحین نے نثر میں صفحے کے صفحے سیاہ کر دیئے ہیں ان کو
 مصنف روح کلام غالب نے نظم کے صرف تین مصرعوں میں اس فصاحت و بلاغت
 کے ساتھ لکھا ہے کہ ہم اس کے شاعرانہ کمال کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور
 بے ساختہ زبان سے نکل جاتا ہے۔ ع

آفتاب آمد دلیل آفتاب

غالب اس کی تہ جیہ یہ ہو سکتی ہے کہ غالب اور مرزا صاحب مرحوم دونوں فطری
 شاعر تھے۔ مرزا مرحوم خوب بھی ایک درد مند دل رکھتے تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے
 غالب کی سیرت اور ماحول کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ مختصر یہ ہے کہ جو درد غالب کے کلام میں
 ہے اسی کی کسک مرزا کی طبیعت میں بھی موجود تھی خواہ حافظ نے خوب فرمایا ہے کہ

نال بلبل اگر بامنت سیریا ریست کہ مادو عاشق زاریم و کاہنا زار لیست
جب دو در در سیدہ چوٹ کھائے ہوئے دل ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور ایک
دوسرے کو اپنی داستانِ غم سناتے تو سننے والوں پر ایک کیفیت کا عالم طاری ہوتا ہے
یہی حالت اس تضمین کے مطالعہ سے ناظرین کے دلوں پیدا ہوتی ہے فرماتے ہیں :-

ذرا اس بے زباں دل کی صدا سن کچھ اپنی قدر دانی کا گلشن
یہ لعلِ بے بہا کہتا ہے کیا سن سن اے غارت گر جنس و فائن
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

اس ای اُرزو پر مرثا ہوں کہ نصب العینِ چشمِ سرمہ سا ہوں
ہم تن شوقِ نظارہ ہوا ہوں لگا رہے محابا چاہتا ہوں
تعا فلہائے تمکیں آزما کیا

ترا خیال و تصورِ ہر دل کو ہے محبوب اسی سے نامہ نویسی کا شغل ہے مرغوب
مجھے امیدِ کرم اور تجھ سے ہو کیا خوب رہ جاتا ہوں کہ تو اور یا سخی مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ عامِ فرس کا

کیا خوب شرح کی ہے ۵

جنوں مانع ہوا استاد کا احسانِ ٹھانے سے فراغت پا چکا روزِ ازل پڑھنے پڑھانے سے
رہا انکارِ عقل کل کو غیر لا بتانے سے فنا تعلیمِ درسِ بنی خودی ہوں اس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف کھتا تھا دیو اور بستان پر

ایک مقطع کی تضمین ملاحظہ ہو جس میں قالب نے بوڑھاپے کا رونا روایا ہے ۵

کچے مرزا کا حال کیا غائب بے طرح ضعت ہو گیا غائب
ہے یہ پیری بھی کیا بلا غائب مضمحل ہو گئے قوی غائب

وہ عناصر میں اقتدار کہاں

غائب کے ایک شعر کی جس میں نوحید کا فلسفہ کوٹ کوٹ کر بھر ہے نصیبین کے
تین مصرعوں میں ایسی شرح کی گئی ہے جس سے شاعر کا مافی الصمیم صاف سمجھ میں آ جاتا ہے
لکھتے ہیں ۱۔

ہیں موصوفہ بخدا شریک ہر دل سے مفقود ہم معبود ہیں نہ کعبے کے نہ کعبہ معبود
رو بہ قبلہ میں تو صرف ایک جہبہ مقصود ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبہ مہمسا کہتے ہیں

غالب نے ایک شعر میں معشوق کے وصال کا ذکر کر کے عاشق کی خوش نصیبی
انوکھے طرز سے ثابت کی ہے جس میں زلفوں کی پریشانی کو شب وصال میں لطف
کا سبب ظاہر کیا ہے اور اسی طرح رات کی اور زلفوں کی سیاہی کی مناسبت فروغ
گئی ہے نصیبین نگار نے اس میں چار یا نہ گنا دیئے ہیں کہتے ہیں۔

ہم میں جو ہمیشیں تیرا کرتاں اسکی ہیں صبح نظارہ میں کر دیتا ہے راتیں اسکی ہیں
اس کو بھی وہ خوش نصیب ہے ہر راتیں اسکی ہیں نیند اسکی ہے دماغ اسکا ہر راتیں اسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

ایک شرح طلب شعر کی منقولہ ترجہ ذیل کی نصیبین میں ملاحظہ ہو۔

ہنسی یاروں نے کیا کی اک نصیحت مجھ کو فرمائی نہ اب ہوش و حشرت پر نہ فرط ناشکیبائی
سکوں سا ہو گیا دل کو گیا سامان رسوائی نکو ہوش مانع بے ربطی شور جنوں آئی

ہوا سے خندہ اجباب بخیریب و دامن میں

جب غالب دہلی سے کھنؤ کے سفر کے لئے اس امید پر نکلے کہ نواب اودھ کی بارگاہ سے کچھ امداد لے کر بخت اشرف اور حرم محترم کی زیارت سے بہرہ اندوز ہوں گے تو راستہ میں ایک غزل لکھ کر ان جذبات کا اظہار کیا اس غزل کے دو شعروں کی تضمین قابل ملاحظہ ہے کس ثوبی سے واقعات کی تصویر کھینچی ہے۔

سقل حیران ہے کس وجہ سے چوڑی دہلی کچھ تو ہے جس لئے طے کی ہے مسافت اتنی
یک بیک چوڑی کیوں لغت راحت کھر کی کھنؤ آئے کا باعث نہیں کھلا یعنی

ہو بس بیرو تمانتا سودہ کم ہے ہم کو

جب چلے گھر سے تو تھی دلی میں بہاؤ کی لہر بیٹھ رہنا یہیں اور ترک سفر ہے اک قہر
قصد ہے دور کا مانع بحر نہ ہو گردش دہر مقطع سناہ شوق نہیں ہے ہر شہر

عزم سیر بخت و طوف حرم ہے ہم کو

غالب نے اکثر موقعوں پر اپنے دقیق مطالب کی طرف اشارہ کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں عوام اس کو نہیں سمجھتے اور یہ ان کی فہم کا تصور ہے۔ اس منسوب کے ایک شعری تضمین ملاحظہ ہو۔ کیا خوب کہا ہے۔

میری غمنواری پر عبث قیل وقال ہے مطلب کو میرے پائے کوئی کیا مجال ہے
کہتا ہوں سب کچھ اوزباں میری لال ہے گر خامشی سے فائدہ اٹھائے حال ہے

خوش ہوں کہ میری بات سمجھی مجال ہے

غالب کے دیوان میں جہاں مشکل اشعار ہیں وہاں ایسے بھی شعر ہیں جو سہل متنوع کا حکم رکھتے ہیں ایسی غزل کے ایک شعری نظمیں نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہو جس میں

تفصیل کی زبان بھی مرزا غالب کی زبان سے مل گئی ہے۔

ملاو آہ میں دھرا کیا ہے حاصلِ گریہ و بکا کیا ہے
اس ترپنے سے مدعا کیا ہے دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

آخر اس درو کی دوا کیا ہے

سطور بالا میں تقریباً غالب کے ہر قسم کے اشعار کی تفصیل کے نمونے پیش کر دیئے
ہیں تاکہ ناظرین ”روحِ کلامِ غالب“ کی خوبوں کا صحیح طور پر اندازہ کر سکیں اور ان کو معلوم
ہو سکے کہ مرزا عزیز بیگ مرحوم نے غزل کے تنگ میدان کو مخمس بنا کر وسعت دینے میں
کہاں تک کامیابی حاصل کی ہے اور غالب کی اس آرزو کو کہ ان کے بیاں کی وسعت
کے لئے تنگنائے غزل سے زیادہ وسیع میدان درکار ہے کس حد تک پورا کیا غالب کے
اسی مضمون کے شعر کی تفصیل میں نہایت موزوں اسلوب اختیار کیا ہے فرماتے ہیں :-
سخن میں چاہیئے کوئی جدید طرزِ عمل کہ طبع تیز کا کچھ حوصلہ تو طبعِ نکل
نہ کیوں ہو قدرِ غزل میں رہے گی بیکل بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

مرزا مرحوم کی تفصیل کے متعلق اس قدر لکھنے کے بعد ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ دوسرے
شاعروں نے جو غالب کی بعض غزلوں کے حصے کئے ہیں ان کے مقابلہ میں مرزا مرحوم کی
تفصیل کا کیا درجہ ہے مثال کے طور پر میر جہدی مجروح دہلوی کے خمسوں کو جو غالب
کے ارشد تلامذہ میں سے تھے مرزا مرحوم کے خمسوں کے بالمقابل درج کرتے ہیں مبصر اور
ناقدان کو پڑھ کر خود رائے قائم کریں :-

مرزا

یوں تو میرا علاج کیا نہ ہوا
 کم مرض ہی مگر ذرا نہ ہوا
 مجھ پر احساں طیب کا نہ ہوا
 درد منت کشش دوا نہ ہوا
 میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
 ہو گے رسوا تمھیں کہا مانو
 بات بڑھ جائے گی بہت یوں تو
 چل کے سن لو الگ جو سنتے ہو
 جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
 اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا
 اور تجھ ساحیں کہاں سے لائیں
 حسرت دل کی داد کس سے پائیں
 کس کے ہاتھوں کو نرم دل پر رکھائیں
 ہم کہاں قسمت آزمائے جائیں
 تو ہی جب خیر آزمائے نہ ہوا
 سخن تلخ کب ہے ان کے قریب
 ان سے باتیں سننے یہ کس نصیب
 ہے خلاوت ہی کچھ سخن میں غیب

بحرِ جوح

کام نخوت سے کچھ روانہ ہوا
 در حاجت کسی پہ وا نہ ہوا
 کیا حقیقت کہوں کہ کیا نہ ہوا
 درد منت کشش دوا نہ ہوا
 میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہو
 دے نہ راحہ ان حبیبوں کو
 کہ جلائیں نہ بد نصیبوں کو
 رنج دیتے ہو ہم غریبوں کو
 جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
 اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا
 کیوں عبت جا کے ایسا سر ٹکرائیں
 ناسحق احسان کیوں کسی کا اٹھائیں
 اس سے جب آرزوئے دل ہی نہ پائیں
 ہم کہاں قسمت آزمائے جائیں
 تو ہی جب خیر آزمائے نہ ہوا
 رکھنا لذت جو ہے دہان جیب
 شہر مہری کو وہ کہاں ہے نصیب
 کیا کہوں بات ہے غیب غریب

بحرِ حُج

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزاد ہوا
فکر کی قسمت آزمائے کی
یعنی اس شوخ کو بلائے کی
یہ سنو بات دل حلائے کی
ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
جب سے عقل و تمیز آئی تھی
تیرے ہی در پہ جب سائی تھی
دم بدم عاجزی فستائی تھی
کیا وہ نمرود کی ضدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
اس کی بخشش نے کی ذرا نہ کی
کچھ تلافی پہ ہم سے ہونہ سکی
کیا بڑی بات ہم نے کی ابھی
جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
ان کے جب بحرِ فکر بہتے ہیں

مزرا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزاد ہوا
جب ہیں دم تھی ان کے لائے کی
استطاعت تھی گھر سب لائے کی
اب جو بدلی ہوا زمانے کی
ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
جان طاعت ہی میں کھپائی تھی
کچھ خودی تھی نہ خود نمائی تھی
سرتعاجدہ تھا جب سائی تھی
کیا وہ نمرود کی ضدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
قابلِ فخر کیا ہے بات اپنی
عین احساں ہے اس کی خوشنودی
ہم نے اس پر نثار کیا شنے کی
جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
مثلِ مزرا مصر وہ رہتے ہیں

مَجْرُوح

ہم تو مجروح غرق رہتے ہیں
آپ کیوں طعن خیز رہتے ہیں
کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج عتاب غزل سرا نہ ہوا

ایضاً

لا تقنطو نوید ہے ام اکتاب میں
تراہد گماہ خلق ہیں وہاں کس حساب میں
ہے عرض یہ جناب تقدس مآب میں
کل کے لئے کہ آج رخت خراب میں
یہ سودن ہے ساقی کوثر کے باب میں
گوارہ فئے دید میں بے قرار ہوں
ہرگز وہاں نہ آئیں گے میں کو طلب کرو
پر کچھ تو شغل چاہئے میرا کہیں رہوں
قامد کے آئے آتے خط اک اور لکیر کچھ
میں جانتا ہوں جو وہ کہیں گے جواب میں
شادی و غم کو عشق میں اک ارضیات ہے

مرزا

جی میں گھٹ گھٹ کے پھوٹ پھوٹتے ہیں
سب غم انتظار سہتے ہیں
کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج عتاب غزل سرا نہ ہوا

ایضاً

جام سو کو رکھ نہ بجا کر حساب میں
شامل نہ کر مصوٰجی کو شرب کے حساب میں
وہاں کچھ کی نہیں کہ تو توفہ طراب میں
کل کے لئے کہ آج رخت خراب میں
یہ سودن ہے ساقی کوثر کے باب میں
لکھ تو دیا اہیں کہ مرا حال ہے زبوں
ہے ان سے آرزوئے تسلی نرا جنوں
آگاہ انہی عادت و خصلت کو خوب ہوں
قصد کے لئے آتے خط اک اور لکیر کچھ
میں جانتا ہوں جو وہ کہیں گے جواب میں
وہ آج میرے گھر چلے آئے مست ہے

اے ارباب کی طوالت سے بدل کر اس کو مست و واردات اوصیات کا نام قافیہ کرنا مزاحی صلی ہے
معلوم نہیں یہ غلطی کہاں سے ضرور نہ ہوئی ہے۔

مخروج

اس میں کبھی حیات ہے گا ہے ممات ہے
 ہے طرفہ حال اور نئی واردات ہے
 میں اور حقا وصل خدا ساز بات ہے
 جان ندردینی بھول گیا اضطراب
 حکم خدا میں گو لب و جون و چرا ہے بند
 مالک ہے وہ حقیر کرے نواہ سر بلند
 پردہ دل تو اس خیال سے رہنہ ہو فکر مند
 ہیں آج کیوں ذلیل کو کل تک نہ تھی پسند
 گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں
 ہمدرد! قہر لے بیتِ خاند خراب کے
 اوسان کھو دیئے دل بے مبرو تاب کے
 آثار ہم سمجھ گئے ان کے عتاب کے
 ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
 ہے اک شکن بڑی ہوئی طرفِ نقاب میں
 اہل نظر سمجھتے ہیں عالم کا کیا وجود
 ہے اس کی ذات پاک سے ہر چیز کی نمود
 ہو یک کو نہیں خبر نیستی و ہود
 ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود

مرا

شکر خدا کہ ہو گئے قصے تمام طے
 جاتے ہوئے وصال کا وعدہ بھی کر گئے
 میں اور حقا وصل خدا ساز بات ہے
 جان ندردینی بھول گیا اضطراب
 یا تو ملائکہ سے بھی تھا مرتبہ بلند
 ہم سنا نہیں ہے یا کوئی اب خواہ مستمند
 پہونچا رہا ہے ہر متنفس ہمیں گزند
 ہیں آج کیوں ذلیل کو کل تک نہ تھی پسند
 گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں
 بے پردہ کچھ اثر ہیں نمایاں عتاب کے
 لیکن ہیں چپ خیال سے شرم و حجاب کے
 آثار بات بات میں ہیں بیچ و تاب کے
 ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
 ہے اک شکن بڑی ہوئی طرفِ نقاب میں
 اشیاء کی ہے تصویر انبیاء سے سب نمود
 دیکھا جو غور سے تو خیالی میں رب وجود
 ہستی کے واہنے کی بدولت ہر دست و پد
 ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود

مجرع

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگتیں غلب ہیں
میں دکھ جاں سے اپنی خدا اس پہ ہوں مگر
میری کاذبیتوں سے خوشی ہے وہ فتنہ گر
ہے بار میرا دشمن آرام کس قدر
تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آئے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں
رکھتے ہیں گونہاں وہ جمال نظارہ سوز
سالم زب رہتا فراہم مگر ہے روز
نکھ سکھ سے تادوست رہے روئے دلفروز
آرایش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں
تا ہوں نہ اس کو میرے اٹھانے میں اہتمام
منغل میں اس کی ہم نے نہ رکھا کسی کو کام
یاں تو صیف نعال میں رکھا سدا مقام
مجھ تک کب انکی بزم میں آتا تھا درجام
ساقی نے کچھ ملانہ دیا سو خراب میں
گر شوخیاں جتا کے ملانا نگاہ کا
گر خرمناک ہو کے پھر نا نگاہ کا

مزنا

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
کیا کہئے، موتی تھی شب غم کس طرح بھر
اختر شمار یوں ہی میں ہو پاتی تھی سحر
توڑا ستم یہ اور نیا چشم شوق پر
تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آئے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں
گو خود نما نہیں ہے وہ پر نقش ہنوز
نظارگی نہیں کوئی اس کا کہیں ہنوز
ہے محو ناز خود بھی وہ نازنا فر ہنوز
آرایش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں
رہتے تھے ہم پیار جہاں سے خالص غلام
انتھا تھا ایسی بزم سے میں روز نشہ کام
پینے میں آج مجھ کو نہ ہو کس طرح کلام
مجھ تک کب انکی بزم میں آتا تھا درخام
ساقی نے کچھ ملانہ دیا ہو شراب میں
آتا ہے یوں تو ان کو لڑانا نگاہ کا
نظریں بجا کے سب کی ملانا نگاہ کا

مجرع

انداز دلبری سے جھکانا نگاہ کا

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا

لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

جب تک کہ پھر خاص مقدر ہی کا نہ جائے

بنتا نہیں ہے کام کوئی لاکھ گر بنائے

اس بات کا یقین کوئی کس طرح سے لائے

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے

جس سحر سے سفینہ رواں ہوا راب میں

مقدر رنگ تو سہی میں یاں دست لپا ہلائے

پر کیا کریں ملا دی جب کوئی برز آئے

یہ حال ہو تو خاکِ جنت کا لطف آئے

وہ ناکہ دل میں جس کے برابر جگہ نہ پائے

جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

ملکِ عدم کے دیکھئے عازم یہ کیا بنے

اس رو میں ڈوبت ہیں سنب و فواز کے

یرخس میں بس ہی اپنا دھواں ہی کیا کرے

رو میں ہے رخسِ عمر کہاں دیکھئے تھمے

لے ہاتھ باگ پر ہے نہ پاپے رکھیں

مزا

آفت ہے ان مگر نہ اٹھانا نگاہ کا

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا

لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

جادو وہ چیز ہے کہ جو اسکو عمل میں لائے

مشکل سے مشکل امر کو آسان کر دکھائے

لیکن مجھے ہی تو ہے افسوس ہائے ہائے

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے

جس سحر سے سفینہ رواں ہوا راب میں

وہ نالہ جو کہ عریض معنے کو بھی ہلائے

وہ نالہ جو کہ میں کو بھی رز زلے میں لائے

وہ نالہ اور کان نکلاں منورج کے بنائے

وہ نالہ دل میں جس کے برابر جگہ نہ پائے

جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

کہتے ہیں صاف صاف یہ انداز چال کے

بسا نہیں عدم سے ادھر دم کہیں اسے

بے اختیار ہوں کہیں مجھ کو گرا نہ دے

رو میں ہے رخسِ عمر کہاں دیکھئے تھمے

لے ہاتھ باگ پر ہے نہ پاپے رکھیں

مخروج

مخروج کو اس امر سے ہے خوب اگہی
اب وہ نہیں ہے بادہ پرستی جو پہلے تھی
بالکل ہی ترک کرے ہو بہ ممکن نہیں ابھی
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی

پیتا ہوں روزِ ابرو شبِ ہفتاب میں

مرزا

تھے یار ہم پیالہ ہمارے سبھی کبھی
دیکھا نہ ہم نے ہوش میں مرزا کو بھی کبھی
وہ دن کہاں کہ شغل سے فرصت تھی کبھی
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی

پیتا ہوں روزِ ابرو شبِ ہفتاب میں

نوٹ: جس مصنف کے کلام کا مطالعہ کیا جائے اس کے حالات زندگی کا جاننا بھی

خالی از دل چسپی نہیں ہوتا۔ مرزا محمد ظفر بیگ نے جو مصنف مرحوم کے عم زاد برادر ہیں مرزا
کے ذاتی اور خاندانی صحیح حالات ہم پہنچائے ہیں۔ حالات بطور مہیمہ آمدہ صفحات
میں پڑھیں۔

خاکسار نظامی بدایونی

۴ مارچ ۱۹۳۵ء

حالات مصنف

(از مرزا ظفر بیگ صاحب سہا پوری)

خاندانی حالات | آپ کے جدا جدا مرزا اختیار مرحوم جیشانی مقام تیمو علاقہ روسی ترکستان کے قدیم زمانہ سے تھے جیسی پشت میں آپ کا سلسلہ نسب مرزا فریدوں بختانی سے جو عرب امیر تیمور صاحب قرآن گورگانی کے زانو جلیس تھے ملا ہے۔ مرزا اختیار مرحوم اٹھارہویں صدی کے آخری میں اپنے چند خاندانی تنگروں سے پرست۔ سرکردہ فیاضی اشراف الہی اس زمانہ میں شاہ عالم بادشاہ کی حکومت قائم تھی۔ ملک میں سرطرفہ قریب۔ مرنٹوں کے زور تھا اور حکومت بھی ہر ملک پرانے کے زیر اثر تھی۔ مرزا اختیار مرحوم شاہ عالم کے منور میں بین ہوئے شاہ عالم نے مرزا مرحوم کے خاندانی حالات کی بنا پر بہت قدر دانی فرمائی اور ان کو اپنی خدمت میں معتمد خاص کے عہدہ پر مرفوع فرمایا۔ لیکن مرزا چونکہ فن سپاہ گروں میں کمال دستگاہ رکھے۔ تھے اس وجہ سے کچھ دنوں کے بعد مرزا مرحوم کو فوجی ننگ میں کسی معزز عہدہ پر تقرر کر دیا گیا۔ مرزا مرحوم نے اپنی سن لیاقت سے تھوڑے ہی عرصہ میں سپہ سالاری کا درجہ حاصل کر لیا۔ مرزا مرحوم کی اس ترقی کے باعث ایک مرتبہ فوجی افسر کو رشک پیدا ہو گیا اور دونوں کے باہم جیشمک ہو گئی۔

اتفاقاً ایک روز مرزا مرحوم اور مرہٹہ سردار میں کچھ لفظی تکرار ہو گئی جس کی وجہ سے مرزا مرحوم کو اس قدر طیش آیا کہ فوراً تلوار نکال کر مرہٹہ سردار کا کام تمام کر دیا۔ مرہٹہ سردار کے قتل ہونے سے تمام مرہٹی فوج میں بیجان پیدا ہو گیا اور وہ سب کے سب مرزا مرحوم کے قتل کے دریغ ہو گئے۔ تندہ شدہ یہ معاملہ شاہ عالم بادشاہ کے روبرو پیش ہوا۔ مرہٹی فوج کے سرداروں نے مرزا کی شکایت کے دفتر کھول دیئے شاہ عالم بادشاہ نے مرہٹوں کے غم کو فرو کرنے کی غرض سے دفع الوقتی کے لئے مرزا مرحوم کو نظر بند کرنے کا حکم دیا اور اصل معاملہ کا فیصلہ کسی دوسرے وقت پر ملتوی فرمایا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ بادشاہ سلامت کی نیت یہ تھی کہ مرزا مرحوم کو کسی حیلہ سے ان کے وطن پہنچا دیا جائے۔ مگر مرزا مرحوم ایام نظر بندی میں تسبیح و تہلیل میں مشغول رہتے تھے اسی حالت میں تین ماہ کے بعد ایک روز علی الصبح نماز سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ دفعۃً گلیوں میں درویدہ آئے اور دو تین گھنٹہ کے بعد مرزا مرحوم نے شاہی قید ہی سے نہیں بلکہ قید حیات سے بھی نجات پائی **إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ**۔ مرزا مرحوم کی وفات پر ان کا تمام اثاثہ البیت ضبط کر لیا گیا۔ مرزا مرحوم کی اہلیہ و فرزند ابے دو صغیر سن بچوں کریم مرزا اور رحیم مرزا کو لیکر سہانپور رستہ بٹلے آئیں چونکہ مرزا مرحوم کی اہلیہ نہایت تعلیم یافتہ خاتون تھیں اس لئے اہالیان سہانپور نے ان کی نہایت عزت کی اور انھوں نے ایک زمانہ مدرسہ قائم کیا جس میں علاوہ قرآن پاک کی تعلیم کے دیگر اخلاقی کتب ہائے فارسی کی بھی عمدہ تعلیم دی جاتی تھی یہ مدرسہ بہت عرصہ تک سہانپور میں جاری رہا۔ کچھ عرصہ کے بعد کریم مرزا اور رحیم مرزا بھی اپنی قیمتی تعلیم سے فارغ ہو کر جوان ہوئے۔ کریم مرزا محکمہ پولیس میں اور رحیم مرزا تحصیل سہانپور میں نائب ناظر

مقرر ہوئے۔ رحیم مرزا بیس سال کی عمر میں پانچ سال ملازمت کرنے کے بعد دفعۃً بعارضہ
 بیضہ ۱۸۶۵ء میں لاوہ فوت ہوئے۔ گریم مرزا نے حکم پولیس میں خاطر خواہ ترقی کی
 اور بہت عرصہ تک ضلع سہارنپور فتحپور اور بلند شہر میں معزز عہدوں پر کام کیا۔ ۱۸۵۶ء
 میں بلند شہر سے چھ ماہ کی رخصت لیکر تشریف لائے اور اسی زمانہ میں آپ کا انتقال
 سہارنپور میں ہو گیا۔ آپ نے اپنی وفات کے بعد تین لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑی تھی
 سب سے بڑے صاحبزادے مرزا محمد شفیع بیگ تھے جو عرصہ دراز تک ضلع سہارنپور کے
 مختلف تعانوں میں کوتوال رہے ایام ملازمت میں تین جج کئے اور ۱۸۶۲ء میں ناواری
 کے عہدہ سے پنشن پائی اور چھ سال تک پنشن پا کر ۱۸۶۷ء میں انتقال فرمایا۔ مرزا
 حکیم بیگ صاحب منجھلے صاحبزادے تھے آپ نے ۱۸۶۳ء میں امتحان مختار کاری پاس
 کیا آپ کا کام نہایت اعلیٰ پیمانہ پر رہا اور بہت بڑے کامیاب مختار کار ثابت ہوئے
 حکام ضلع آپ کی خاص طور پر عزت کرتے تھے آپ کا انتقال ۱۸۹۱ء میں ہوا۔ آپ
 نے اپنی وفات کے بعد کافی جائیداد زرعی و سکنی چھوڑی جو اب تک آپ کے بیٹوں کے
 کے پاس موجود ہے۔ مرزا وزیر بیگ صاحب سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ آپ
 ۱۸۶۱ء میں حکم پولیس میں ملازم ہوئے اور بہت تھوڑے عرصہ میں ترقی پا کر تھانہ دار
 کے عہدہ پر پہنچے تھے۔ بہت عرصہ تک ضلع سہارنپور میں مختلف مقامات پر تھانہ دار
 رہے۔ آپ نہایت قوی اور جسم تھے اب تک ضلع سہارنپور میں آپ کی طاقت کے کرسٹے
 بیان کئے جاتے ہیں آپ نے ۱۹۱۳ء میں انتقال فرمایا۔

مرزا عزیز بیگ کی تاریخ پیدائش | مرزا عزیز بیگ صاحب مختص
 بہ مرزا سہانپوری مرزا وزیر بیگ

صاحب مرحوم کے خلف الرشید تھے۔ آپ ۱۸۶۹ء میں بمقام سہانپور پیدا ہوئے۔
تعلیم و تلمذ | قرآن پاک وغیرہ کی تعلیم ختم ہوئے پر آپ منشی مولوی حبیب الدین صاحب مرحوم المتخلص بسوزاں کے زیر تلامذہ میں داخل ہوئے منشی صاحب فن شاعری میں حضرت مرزا غالب مرحوم و مغفور کے خاص شاگرد تھے۔ ایک مدت دراز تک غالب مرحوم کی خدمت میں دہلی رہے۔ اور غالب مرحوم کے انتقال پر سہانپور تشریف لائے جیسا کہ سوزاں صاحب مرحوم نے ایک نعل کے مقطع میں فرمایا ہے ۔

غالب سے کام تھا سو وہ سوزاں گزر گئے

دہلی میں اب جناب کا کیا کام رہ گیا

مرزا عزیز بیگ صاحب کو اوائل عمری سے ہی شعر و سخن میں خاصی دل چسپی تھی اس پر قابل استاد کی توجہ ذہن کی رسائی تھوڑے ہی عرصہ میں فارسی اور اردو کی غزلیں تصنیف فرمانے لگے۔ منشی صاحب مرحوم اپنے ہونہار شاگرد کی تیری طبع دیکھ کر انکی تعلیم میں بے حد کوشش فرماتے تھے۔ چند ہی سال میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ آپ کو فارسی زبان میں کامل دستگاہ تھی۔ عربی میں بھی خاصی بیاقت پیدا کر لی۔

شاعری | مرزا مرحوم ایک اعلیٰ ادیب اور شاعر تھے آپ ایک ایسے مخصوص رنگ کے مالک تھے جو اکثر ان کے ہمعصر شعراء کی ابتدائی روش سے قطعاً جداگانہ

حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کی شاعری آپ کی استادانہ حیثیت کی عین دلیل ہے ضلع سہانپور اور دیگر اضلاع میں آپ کے بہت شاگرد موجود ہیں۔ آپ کا طریق اصلاح قابل تحسین تھا۔ اپنے ہر شاگرد کے کلام میں اس کے مذاق اور علم کے موافق ایسی اصلاح فرماتے تھے

کے جس کا جواب مشکل ہے۔ ۱۹۱۵ء میں چند احباب کے اصرار سے حضرت مرزا غالب مرحوم و مغفور کے دیوان کی تفہیم لکھنی شروع کی۔ ماہ اپریل ۱۹۲۲ء میں اس اہم کام کو سن و حودہ اتمام کو پہونچا یا اسی عرصہ میں آپ کو دردِ دل کا دورہ پڑنے لگا اور اسی مرض میں چھ ماہ بعد ماہ اکتوبر ۱۹۲۲ء کے اخیر ہفتہ میں ۵۵ سال چھ ماہ کی عمر میں رحلت فرمائی۔ تاریخ وصال ۱۰ رورج مرزا بہشت میں پہونچی انالشد وانا علیہ راجعون آپ نے اپنی وفات پر دولہ کیاں چھوڑیں۔

آپ نے ۱۸۸۵ء میں امتحانِ تمنا رکازی پاس کیا مگر شعرو سخن کا اسی درجہ

ذریعہ معاش و طرز معاشرت

شوقِ نقا کہ کچہری کے کاروبار کو خاص ضرورتاً انجام دیا کرتے تھے اور ہندو میں صرف ایک دو مرتبہ کچہری تشریف لے جاتے اور جو کچھ وہاں سے یافت ہوتی اس کو اپنے صرف میں لاتے۔ جب تک وہ رویہ صرف نہ ہو جاتا اس وقت تک کچہری تشریف نہ لے جاتے۔ آپ کی قانونی قابلیت بھی قابلِ تعریف تھی۔ اکثر طلباء آپ سے قانون بھی پڑھتے تھے۔

مرزا کی شادی ۱۸۵۲ء میں آپ کے عم اکبر مرزا عظیم بیگ صاحب مرحوم کی دختر نیک اختر سے ہوئی۔ آپ کی اہلیہ محترمہ بھی علما و

شادی

قرآنی تعلیم کے اردو اور فارسی میں کافی لیاقت رکھتی تھیں۔ امور فانداری اور حسن انتظام میں لائقِ تعریف تھیں اس وجہ سے شہر کے معزز رؤسا و غیوہ کی لڑکیاں بغرض حصولِ علم ان کے پاس آتیں۔ آپ کا انتقال ۱۹۰۹ء میں ہوا مرزا مرحوم اس حادثہ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جلسہ شعرو سخن اور دیگر دنیوی مشاغل کو ترک کر دیا۔ ہر چند

اعزاء و اقربائے مرزا مرحوم کی توجہ عقد ثانی کی طرف دلائی مگر مرزا مرحوم نے ایک نہ سنی اور آخر دم تک اپنی اہلیہ مرحومہ کی یاد لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے اس زمانہ میں ایک نہایت یرد و غزل لکھی تھی جس کے مطلع سے دلی حزن و ملال کا اندازہ ہو سکتا ہے شعر

یاد ہیں وہ دن کہ ہم تھے اور زمانے کے مزے
یاد آتے ہیں قفس میں آشیانے کے مزے

مذہب | مرزا مرحوم بہ اعتبار مذہب نہایت وسیع النہالی تھے۔ اعتقاداً مذہبِ حنفی کے پیرو اور صوم و صلوة کے پابند نہ تھے۔ اگرچہ آپ کے پاس با اوقات مختلف مذاہب کے اشخاص کا جمع رہتا تھا مگر آج تک کبھی ایسا دیکھنے میں نہیں آیا کہ کسی صاحب کے مذہبی معاملات پر بحث یا گفتگو مرزا مرحوم نے کی ہو یا دوسرے مذاہب پر کبھی نقیضانہ زبان طعن کھولی ہو۔ ابتداءً مرزا کو اپنے اور شوقین طبع دوستوں کے اصرار پر محض رقص و سرود میں شریک ہونے سے انحراف نہ تھا مگر یہ سلسلہ ۱۹۰۴ء میں بالکل ترک کر دیا تھا اور سلسلہ نقشبندیہ میں حضرت مولانا الحاج مولوی خلیل احمد صاحب جہا جی مدرس اول مدرسہ مظاہر علوم بہارن پور سے بیعت کی چنانچہ اس واقعہ کو مرزا مرحوم نے اپنی ایک نعتیہ غزل کے مطلع میں اس طرح پر واضح کیا ہے۔ شعر

بہت کچھ محبت زنداں میں کھویا وقت اے مرزا
بس اب تو کچھ دنوں حرمت کرو اللہ والو نکئی

اخلاق | آپ کا اخلاق نہایت وسیع تھا ہر خاص و عام سے نہایت خندہ

پیشانی اور تواضع سے پیش آتے تھے۔ آپ کی نشست گاہ میں احباب اور تلامذہ کا جلسہ رہتا تھا مگر ان کے جلسے میں کبھی کسی کی یہ مجال نہ ہونی تھی کہ کسی کی غیبت یا بدگوئی کرے۔ آپ نہایت کم سخن اور متین تھے بلا ضرورت کسی سے زیادہ شگلو نہیں کرتے تھے۔

فہرست غزلیات تضمین شدہ

نمبر غزل	ردیف	مصرع اوّل ہر غزل	صفحہ
۱	الف	لقت فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا	۱
۲	"	دل مرا سوزِ نہاں سے بے کما باہل گیا	۲
۳	"	شوق ہر رنگ رقیب سرو سامان نکلا	۳
۴	"	دھمکی میں مر گیا جو نہ باپ بردخا	۴
۵	"	دہر میں نقش وفا و حسرت کی نہ ہوا	۵
۶	"	مستکش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا	۶
۷	"	حرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا	۷
۸	"	جرم شاہنشاہ میں استعار کا دفتر کھلا	۸
۹	"	شب کہ برق سوزِ دل سے زہرہ ابر آہ تھا	۹
۱۰	"	نالہ دل میں شب انداز اثر نایاب تھا	۱۰
۱۱	"	بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آسان ہونا	۱۱
۱۲	"	دوست غمخواری میں میری سستی فراموش گئی کیا	۱۲
۱۳	"	یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا	۱۳
۱۴	"	ہوس کو ہے نشاط کا کیا کیا	۱۴

نمبر غزل	روایف	مصرع اولے ہر غزل	صفحہ
۱۵	الف	در خورِ قبر و غصب جب کوئی ہم سادہ ہوا	۲۳
۱۶	"	پئے نذرِ کرم تحفہ سے شرمِ نارسانی کا	۲۶
۱۷	"	گردِ اندوہ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا	۲۷
۱۸	"	دردِ منت کش دوانہ ہوا	۲۹
۱۹	"	گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا	۳۱
۲۰	"	جب بتقریب سفر یار نے محلِ باندہا	۳۲
۲۱	"	نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا	۳۳
۲۲	"	وہ مری ہیں جنہیں سے غم نہ ہاں سمجھا	۳۴
۲۳	"	پھر مجھے دیدہ تر یا د آیا	۳۶
۲۴	"	ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا	۳۸
۲۵	"	تو دوست کسی کا بھی ستم گرد ہوا تھا	۴۰
۲۶	"	عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا	۴۲
۲۷	"	ذکر اس پر یوش کا اور پھر بیاں اپنا	۴۳
۲۸	"	جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا	۴۵
۲۹	"	عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا	۴۷
۳۰	"	کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا	۴۹
۳۱	ب	پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب	۵۰
۳۲	ت	آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست	۵۳
۳۳	۰	غیر یوں کرتا ہے پرش مجھ سے ان کے بھر میں	۵۴
۳۴	د	حسنِ غمرے کی کشاکش سے چٹا میرے بعد	۵۶
۳۵	ر	بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر درو دیوار	۵۸

نمبر غزل	ردیف	مصرع اولے ہر غزل	صفحہ
۳۵	ر	گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر	۶۰
۳۶	"	کیوں مل گیا نہ تاب رنج یار دیکھو گھر	۶۲
۳۷	"	لوڑنا ہے مراد دل ز محبت جہر و رنشاں پر	۶۳
۳۸	"	ہے بس کہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور	۶۶
۳۹	"	مازم تھا کہ دیکھو میرا رستہ کوئی دن اور	۶۹
۴۰	ز	تحریف مطلب مشکل نہیں فسوں نیاز	۷۱
۴۱	.	کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز	۷۲
۴۲	.	نہ گل نغمہ ہوں نہ پیرہن ساز	۷۳
۴۳	ک	زخم پر چیر چیریں کہاں طفلان بے پروا، ملک	۷۵
۴۴	"	آد کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک	۷۶
۴۵	ا	ہے کس قدر بلا کہ فربہ وفا کے گل	۷۸
۴۶	ر	وہ فراق اور وہ وصال کہاں	۸۰
۴۷	.	ممکن نہیں کہ بھول کے کبھی آرمیرہ ہوں	۸۲
۴۸	.	کی وفا ہم نے تو نیر اس کو جفا کہتے ہیں	۸۴
۴۹	.	آبرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں	۸۶
۵۰	.	ہم سے کھل جاؤ بوقت سے پرستی ایک دن	۹۸
۵۱	"	ہم پر جفا سے ترک وفا کا گناہ نہیں	۸۹
۵۲	"	ہر چند جاں گدازئی قہر و ستاب ہے	۹۰
۵۳	"	مانع دشت نور دی کوئی تیرا میر نہیں	۹۱
۵۴	.	جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں	۹۳
۵۵	"	ملتی ہے خوشی یار سے نار انتہا تب میں	۹۴

نمبر غزل	ردیف	مصرع اول ہر غزل	صفحہ
۵۵	ن	کل کے لئے کرا آج نہ خست شراب میں	۹۷
۵۶	.	حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں مگر کو میں	۹۹
۵۷	"	ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں	۱۰۲
۵۸	"	مالہ جز حسن طلب اسے ستم ایجاد نہیں	۱۰۳
۵۹	.	نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتبار نہیں	۱۰۵
۶۰	.	تبرے تو سن کو صابا بندھے ہیں	۱۰۶
۶۱	.	دام پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں	۱۰۸
۶۲	"	سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں	۱۱۰
۶۳	"	دیوانگی سے دوش یزدار بھی نہیں	۱۱۳
۶۴	.	نہیں ہے رزم کوئی بحیہ کے درخور مرے تن میں	۱۱۶
۶۵	"	مرے جہاں کے اپنی نظر میں خاک نہیں	۱۱۷
۶۶	.	دل ہی توبے نہ سنگ و ست درو سے بکنہ آئے کیوں	۱۱۸
۶۷	.	غنیہ، ماسکفہ کو دور سے مت دیکھا کہ لیوں	۱۲۰
۶۸	و	وارستا اس سے چہا کہ محبت ہی کیوں نہ ہو	۱۲۲
۶۹	.	قفص میں ہوں گر اچھا بھی۔ جانیں میرے شیون کو	۱۲۳
۷۰	.	دی سادگی سے جان پڑوں کوہ کن کے پانوں	۱۲۶
۷۱	.	واں پہونچکر جو غش آتا ہے ہم ہے ہم کہ	۱۲۷
۷۲	"	نم جانو تم کو غیر سے جو رزم و راہ ہو	۱۲۹
۷۳	"	گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیوں کر ہو	۱۳۱
۷۴	"	کسی کو نے کے دل کوئی نوا سنچ فغاں کیوں ہو	۱۳۳
۷۵	ی	مسجد کے زیر سایہ خراباں چاہیے	۱۳۶

نمبر غزل	ردیف	مصرع اول ہر غزل	صفحہ
۷۶	ی	بساطِ بحر میں محاکم ایک دل ایک قطرہ غم وہ بھی	۱۳۸
۷۷		غم دیا سے گر پانی بھی فرصت مراٹھانے کی	۱۳۹
۷۸	.	کیا تنگ ہم تم زدگیاں کا جہان ہے	۱۴۱
۷۹	.	درد سے تم کو ہے میرے بے قراری ہائے ہائے	۱۴۲
۸۰	"	سرگشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے	۱۴۴
۸۱	"	گر فاستی سے فائدہ اخلائے حال ہے	۱۴۶
۸۲	"	عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی	۱۴۷
۸۳	.	اس جرم میں مجھے نہیں بنتی حیا کے	۱۴۹
۸۴	"	رفتارِ عمر قطع رہا اضطراب ہے	۱۵۱
۸۵	"	دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پر رشک آجائے ہے	۱۵۲
۸۶	"	سادگی پر اس کی مر جائے کی حسرت دل میں ہے	۱۵۵
۸۷	.	دل سے تری نگاہِ طرنگ اتار گئی	۱۵۶
۸۸	.	تسکین کو ہم نہ روئے جو ذوقِ نظر ہے	۱۵۸
۸۹	"	کوئی دن گر زندہ کافی اور ہے	۱۵۹
۹۰	"	کوئی امید پر نہیں آتی	۱۶۱
۹۱	"	دلِ ناداں مجھے ہوا کیا ہے	۱۶۳
۹۲	.	کہتے تو ہو تم سب کہ بیتِ فالیر ہو آئے	۱۶۵
۹۳	"	پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے	۱۶۷
۹۴	"	بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے	۱۶۹
۹۵	"	ظلمتِ کردہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے	۱۷۲
۹۶	"	نہ ہوئی گر مرے مرے سے تسلی نہ سہی	۱۷۳

نمبر غزل	روایف	مصرع او لے ہر غزل	صفحہ
۹۷	ی	عجب نشاط سے ملاؤ کے چلے ہیں ہم آگے	۱۷۶
۹۸	.	نگوہ کے نام سے بے مہر خا ہوتا ہے	۱۷۷
۹۹	"	ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے	۱۷۹
۱۰۰	"	اگر وہی جان کو قرار نہیں ہے	۱۸۲
۱۰۱	"	ہجومِ غم سے یاں تک نہ نگوں فی مجھ کو حاصل ہے	۱۸۳
۱۰۲	.	حسنِ بزم سے تو ناز سے گفتا رہیں آوے	۱۸۴
۱۰۳	"	حسنِ مدگر ہر ہنگامِ کمال اچھا ہے	۱۸۶
۱۰۴	"	غیر میں محفل میں بوسے جام کے	۱۸۸
۱۰۵	"	پھر اس انداز سے بہا سائی	۱۹
۱۰۶	.	کب وہ سنتا ہے کہانی میری	۱۹۳
۱۰۷	"	جس زخم کی ہو سکتی ہو نہ دیر رفتی	۱۹۴
۱۰۸	.	یہاں آجیوں کو جتنا چاہیے	۱۹۶
۱۰۹	"	ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے	۱۹۸
۱۱۰	"	نکندہ ہیں ہے غمِ دل اس کو سنا ہے نہ بے	۲۰۰
۱۱۱	"	وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے	۲۰۲
۱۱۲	"	تپش سے میری وقف کش کش ہر تارِ بستر ہے	۲۰۳
۱۱۳	.	خطر ہے رشتہ الفتِ رگ گردن نہ ہو جائے	۲۰۳
۱۱۴	"	فریاد کی کوئی لے نہیں ہے	۲۰۳
۱۱۵	"	ہم رشک کو اسے بھی گوارا نہیں کرتے	۲۰۵
۱۱۶	"	دیا ہے دل اگر اس کو شربے کیا کہیے	۲۰۵
۱۱۷	"	دیکھ کر درپردہ گرم دامنِ افشانی مجھے	

صفحہ	مصرع اوئے ہر غزل	ردیف	نمبر غزل
۲۰۹	یاد ہے شادی میں بھی ہنگامہ یارب مجھے	ی	۱۱۸
۲۱	حضور شاہیں اہل سخن کی انمائش ہے	"	۱۱۹
۲۱۲	کبھی ٹکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے	"	۱۲۰
۲۱۳	باز بچہ اطفال ہے دنیا میں آگے	"	۱۲۱
۲۱۶	کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کیے	"	۱۲۲
۲۱۸	روئے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے	"	۱۲۳
۲۲۰	ابن مریم ہوا کرے کوئی	"	۱۲۴
۲۲۲	بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے	"	۱۲۵
۲۲۳	ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نہ لے	"	۱۲۶
۲۲۵	مستی بذوق خلعت ساقی ہلاک ہے	"	۱۲۷
۲۲۵	حس جانیسم شانہ کش زلف بار ہے	"	۱۲۸
۲۲۷	آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے	"	۱۲۹
۲۲۹	چپ تنگ وہاں رحم نہ پیدا کرتے کوئی	"	۱۳۰
۲۳۱	بہنم پریشانی لارہ تمان زاد اسے	"	۱۳۱
۲۳۳	منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی	"	۱۳۲
۲۳۵	غم کھاتے میں بودا دلی ناکام بہت ہے	"	۱۳۳
۲۳۷	مدت ہوئی ہے یار کو کہاں کئے ہوئے	"	۱۳۴
۲۴۰	نوریا میں ہے پیر اور دوست جاں کے لئے	"	۱۳۵
۲۴۳	میں ہوں مشتاق جفا مجھ پہ جفا اور سہی	"	۱۳۶
۲۴۵	آپ نے مستی الہی کہا ہے تو سہی	"	۱۳۷
۲۴۶	کی شرح نظم غالب تعین میں جو مرزا	"	قطبہ تاریخ
۲۴۷	تعمین برکلام مولانا جامی، میر و حیدر اور تہذیب الدین سوزاں	"	ضمیمہ



کیا یہ منشا فضا از لہ میں کاتب تقدیر کا ذرہ ذرہ ہو فنا اک روز پس تعمیر کا
 رنگ جھلکایے کیوں ہر چینیں تعمیر کا نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
 کاغذی ہے پیرزن ہر پیکر تصویر کا

درد و غم کرتے ہیں جو کچھ روح فرسائی پوچھ حسرتیں کرتی ہیں جو ہنگامہ لڑائی پوچھ
 توڑتی ہے دل کو کیونکر ناشکیبائی پوچھ کاؤ کا وسخت جانی ہائے تنہائی پوچھ
 صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

آرزوئے قتل کو لب پر نہ لانا چاہیے ہاں مگر درد پر تدبیر و تقاضا چاہیے
 کھینچ کہ خود آئے اشرق اقل پر اتنا چاہیے جذبہ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے
 سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

کوئی کم مایہ اگر برسوں طبیعت کھائے غیر ممکن ہے کوئی نکتہ مے نکلتوں سے پائے

۱۵ بعض ستارہ میں نے اسی شعر کو جب مسمیٰ قرار دیا ہے حالانکہ ایسا کہنا سراسر بے الصافی ہے ہر زاغہ آلب سے
 عبدالمہزاق شاکر کو اس شعر کی تشریح یوں لکھ کر بھیجی ہے : کہ "ایران میں رکھ ہے کہ دادخواہ کاغذ
 کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے جیسے مشعل دن کو جھلایا یا خون آلودہ کپڑا لباس پر لٹکا کر
 لے جاتا ہے۔ بس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس شوخی تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورت تصویر ہے
 اور اس کا پیرزن کاغذی ہے جیسی ہستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبار محض ہے موجب رنج و ملال
 و آزار ہے"

لاکھ ساع کاں اپنے پیری باتوں جاکے آگہی دامِ تنہیدن جس قدر چاہے بجائے

معاذِ عقاب ہے اپنے عالمِ تفسیر کا

جوشِ وحشت جب مجھے تھمے نہیں تیا ذرا پھر ہے مزا سلسلہ بیکار قید و بند کا

ہیں کسے نزدیک طوق و رَسَن تو چیز کیا بسکہ ہوں غالبِ اسیری میں بھی آتشِ یزید کا

موتے آتشِ دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

کیا بتاؤں آتشِ الفت میں کیا کیا جل گیا ساز و سامانِ ہستی کا سراپا جل گیا

جسم بالکل بچک گیا ہے اور کلہا جل گیا دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا

آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

مجھ کو دعویٰ ہے ہلا دیتی ترا دل ہر صدا لیکن اب بے اثر ہے میں گجا اور تو گجا

نار ہو سکتا ہے اپنی حدِ امکان تک سا میں عدم سے بھی پرے ہوں ز غافل باہا

میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

خیمہ جو آتشِ غم دل میں جھٹکتا ہے نہاں ورنہ پھر چھوڑ گئی کیا دنیا میں یہ برقِ تپاں

ذکر سے اسکے زبانِ شمع ہوتی ہے زباں عرض کیجئے جو ہر اندیشہ کی گرمی کہاں

کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرِ اجل گیا

دیکھنے کو اب بھی ہے سرد چراغاںِ جسم زار دل کی ہستی پر ہے لیکن داغ کا دار و مدار

اب تو اک ظلمت کدرہ سینہ ہے گوہرِ دلفا
دل نہیں تجھ کو دکھاتا اور نہ غفل کی ہمار
اس چہرا غاں کا کروں کیا کار فرما بل گیا
ہے فراق ہمنشیناں پر طبیعت مشتعل
کمر دیا سوز و گداز دل نے مژدہ مضمحل
کوئی دل بھی تو نظر آتا نہیں غمشِ غل
میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبِ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ دل دنیا جل گیا

پنجرہ دیو جنوں دشمنِ داماں نکلا
اس سے بکھر نہ کوئی تارِ گریباں نکلا
ننگِ طبعوسِ تین عاشقِ حیراں نکلا
شوقِ ہرزنگِ رقیبِ ہر و ساں نکلا
قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا
دل میں ٹھہری نہ سنال کوئی گھڑی بھی یاز
کس ہلاکی اسے حاصل ہے روانی یاز
حسرتِ بوسہ سو فار نہ نکلی یارب
زخمِ نہ داؤد دی تنگی دل کی یارب
تیر بھی سینہ بسمل سے پراشتاں نکلا

ملہ اس شعر کا مطلب مزا غالب نے مولوی عبد الرزاق شاکر کے خط میں اس طرح لکھا ہے "رقیب یعنی مخالف شوق
مُرسماں کا دشمن ہے دلیل یہ ہے کہ قیس جو زندگی میں بکھر پڑا پھر تاتقا تصویر کے پردے میں بھی بنگاہی رہا
یہ ہے کہ محسن کی تصویر باطن عریاں کی گھنٹی ہے جہاں گھنٹی ہے اس شعر نے متعلق مزا صاحب نے
شاکر کو لکھا ہے یہ ایک بات میں نے اپنی طبیعت نکالی ہے جیسا کہ اس شعر میں ہے نہ نہیں مذکور راحت
حراحت پیکان ۷ وہ زخم تیغ ہے جسکو دکھایا ہے یعنی زخمِ تیر کی توہین بسبب ایک خندہ ہو گیا اور تو اس کے زخم
کی تھیں بسبب ایک طاقِ سا کھل جانے کے زخمِ نہ داؤد دی تنگی دلی یعنی زائل نہ کیا تنگی کو پراشتاں یعنی چٹا
اور یہ لفظ تیر کے مناسب ہے یعنی یہ کہ تیر تنگی دل کی داد کیا دیتا وہ تو خود حق مقام ہے گہرا گہرا اشتاں اور یہ

کون ہے جسکو ہے جمیبت خاطرِ حاصل کوئی آشفۃ کوئی منشور میں داخل
گھر ہے یا ہے کوئی شوریدہ سروں کی منزل ہوئے گلِ تلاؤں دو در چرخِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پشیاں نکلا

نوب لڑے میں نے دلیں جو تھی نعمت درد کسکی تقدیر کو یوں ہاتھ لگے دولت درد
کیوں ہوتی مجھے ہر دم طلب کثرت درد دل حسرت زدہ تھا مائدۂ لذت درد
کام یاروں کا بقدر لب و دندان نکلا

مدتوں دل کو رہی لذت آزار پسند متاثرگ جاں کو دمِ خنجرِ خونخوار پسند
اب بقا پائی نہیں ہے میں نہا پسند ہے نوا موزِ فنا ہمت دشوار پسند
سخت مشکل ہے کر یہ کام بھی آسان نکلا

قطرۂ اشک جو آنکھوں سے بہا یا غالب رشکِ دریائے شر کا لہجہ بنایا غالب
تارِ مژدے پہ چھوٹوں کا لگا یا غالب دلیں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب
آہ جو قطرہ ز نکلا تھا سو طوفان نکلا

کہتا ہے کون عشق میں فرادِ فرد تھا ہاں تھا جو کچھ تو قیسِ بیابانِ نورد تھا
وہ کیا جو کچھ ضعیفہ کے حملے میں سرد تھا دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا
لے نہ پاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دلتے ہیں کہ سنئے عرفِ عشق کی دھمکی میں تاکر پہاڑ کی طرح جان نہیں دی سکریم
تو مردانگی کیسا ہے عشق اور مصائبِ عشق کا مقابلہ تمام عمر کرتے رہے۔

عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا

کچھ وقفہ حیات جو مجھ کو عطا ہوا تھا اس میں بھی فنا کا تصور بندھا ہوا
گویا وطن میں تھا درِ غربت کھلا ہوا تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا

اڑنے سے پیشتر بھی مارنگ زرد تھا

تحصیلِ درس صرف فکر چکا تھا میں الفت کے امتحان سے فالغ ہوا تھا میں
بلے ہری زمانہ سے نا آشنا تھا میں تالیفِ نسخائے وفا کر رہا تھا میں

مجموعہ خیال ابھی فرد فرد تھا

سیدہ کہ ایک تخرمہ مشق جنوں ہواب جو داغ ہے کز خم ہے وہ لالہ گوں ہواب
حالت ہر ایک عضو کی زار و زبوں ہواب دل تابگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہواب

اس رہ گزریں جلوہ گل آگے گرد تھا

ہاروں نے دل لگانے کو سمجھا ہے دل لنگی حالانکہ آفتیں ہیں ہمیشہ نئی نئی
ممکن نہیں نجات ملے غم سے جیتنے جی جاتی ہے کوئی کش مکش اندوہِ شوق کی

دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

حاصلِ غرض ہوئی نہ مرے قید و بند سے تھا مدعا کہ گھر میں یہ وحشی پڑا رہے
چھوڑی نہ اپنی خود آوارہ گرد نے احباب چارہ جوئی و حشت نہ کر سکے

زندوں میں بھی خیالِ بیا بیاں نورِ دغا

میرزا یہ رحمِ ظلم و ستم کیا یہاں کی ہے مٹی خراب بیلِ ہندوستان کی ہے
شاکی جو اس زمانہ ناقدِ رواں کی ہے یہ لاشِ بے کفن آئندہ خستہ جاں کی ہے

حقِ مغفرت کے عجب آزاد مرد تھا

لے ماشیہ اگلے منور پر

وعدہ پورا کبھی اس شوخ کا کوئی نہ ہوا قصہ کوتاہ وفا عہد وفا بھی نہ ہوا
فیض کچھ ہستی مویوم سے اس کی نہ ہوا دہریہ نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا

سب غلط ہے کہ زبرد و ہی ہو گا اعلیٰ جس کا نظارہ کرے مارسیہ کو اندھا
کس طرح کہنے کی پتھر میں اثر یہ ہو گا بنزہ خط سے ترا کا کلی سرکش نہ دبا
نہ زمر و بھی حریف دمِ افعی نہ ہوا

اس سے مایوس ہوا ہوں کہ جہاں چھوٹوں جیتے جی دامِ غم ہو تر با سے چھوٹوں
غیر ممکن ہے کہ میں رنج و بلا سے چھوٹوں میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں
وہ ستم گر مرے مرنے پر بھی راضی نہ ہوا

ما شیدہ! آہستہ جہاں کو درختے عجیب آزاد و عقلاش کیلئے بھی پابند کف ہو گا اور اپنی آزادی
مکرر بھی برقرار رکھی۔ حضرت ذوق نے بھی اپنی موت کے متعلق اسی قسم کا شعر کہا ہے۔

کہتے ہیں آج ذوقِ جہاں سے گر گئی کیا کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے
لے غالب صاحبِ سانپ اور زمر کے متعلق چودھری عبدالغفور کو اس طرح لکھا ہے "قبول دعا وقت طلوعِ فجر
مضامین شری ہے جیسے کتابوں کا پرتو ماہ میں پھٹ جاتا اور زمر سے افی کا اندھا ہو جانا۔"

دامِ افعی۔ سانپ کی پھٹکار۔ زمر و بنزنگ کا قیمتی پتھر جسکے دیکھنے سے سانپ اندھا ہو جاتا ہے۔
آصف الدولہ ولی اودھ نے اس کا قہر کیا۔ سانپ کے سامنے زمر رکھا۔ لیکن سانپ اندھا نہ ہوا۔ غالب صاحب
نہ اس کی تائید میں بنزہ کو زمر و زلف کو سانپ سے تشبیہ دے کر میٹھون پیرا کیا ہے۔

ہم جو اس دم میں کمزور ہیں تو کمزور ہی رہیں گے
 آئینہ اپنا مکدر ہے مکدر ہی رہے گا
 کم ہیں نہاد سے زندوں کے برابر ہی رہیں گے
 دل گزر گاہ خیال سے دسا غری رہیں گے
 مگر نفس جاوہ سیر منزل تقویٰ نہ ہوا

ہو رہے تھے ترے لانے میں جو معترف ابھی
 کھل گئی ان کی غرض تو نے بھی ٹال دیا
 مجھ کو ممنون بنائے کو تھے احباب سبھی
 ہوں تیرے وعدہ نہ کرنے پر بھی راضی کہ کبھی
 گوشت منت کش طلبا نگ تسلی نہ ہوا

کس سے دل کھول کے کچھ شکوہ کلفت کیجئے
 کس دعا کے لئے امید اجابت کیجئے
 کون ہے کس سے بیان غم و حسرت کیجئے
 کس سے غرومی قسمت کی شکایت کیجئے
 اُم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

ذکر کرتا تھا مسیحا کا جو سب سے غالب
 متظر مرگ کا تھا دیکھئے کب سے غالب
 تنگ مرزا تھا غم و رنج و تعب سے غالب
 مر گیا صدر دینک جنبش لب سے غالب
 ناتوانی سے حریف دم عیسیٰ نہ ہوا

نہ کچھ مرغوب نہ کھو نہ کوہے نظارہ گلستاں کا
 نہ سوا اس میں ہر حسن و جمال جو و غلماں کا

۱۔ دم عیسیٰ عیسیٰ کی پھونک حضرت عیسیٰ ایک بزدست پیغمبر گزشتے ہیں اپنے ماننے والوں کو مسلمان بنائے ہیں
 بھی انکو بے عزت بنائے ہیں انکا بوجہ تھا کہ اپنی پھونک سے مراد زندہ کر دیا کرتے تھے۔ فرماتے ہیں میں نے مجھے حیات
 دینے کیلئے لب ہلائے مگر میری ناتوانی کو جنبش لب بھی گل لگ کر زری اور یہ صدمہ میری بڑانت نہ کر سکا۔ (باقی مشہور)

ہمارا دل ہے وارفتہ بہارِ بزمِ جانان کا ستائش کر ہے زاہدِ مستندِ حسنِ خانِ ضیواں کا

وہ اک گلِ دستِ بہم بخوردے طاقِ نسیاں کا

لیا کرتا ہے کام ابرِ حق سے ظالمِ بیخِ بڑاں کا شمار آساں نہیں خود و جاناں چمِ قضاں کا

مگر اس پر بھی دل تسبیحِ خواں، نامِ جانان کا بیاں کیا کیجئے بیدار کاوشِ بھائے شرکاں کا

کہ ہرک قطرہِ خوں دان ہے تسبیحِ مرجاں کا

بہت کچھ سخی و کوشش کی کر کو کوئل کے نالوں کو لبوں تنک بھی نہ آنے دیوں کبھی سینے سے نالوں کو

مردودی صورت نے ہر س دندان نے نالوں کو رزائی سُطوتِ قاتل بھی مانعِ مئے نالوں کو

یہ دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہِ میتاں کا

خدا نا خواستہ داغِ جگر اپنا جو جل اٹھے زبانِ شمع پیدا ہوا بھی ہر اک مبنِ موسے

ابھی دیکھئے کہاں ہیں تمہے شعلے سوزِ باطن کے دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرغتِ زمانے نے

مگر ہر داغِ دل اک غم ہے مگر پھر اغاں کا

نظر آنے لگے چاروں طرف اکھوں میں تجھ سے درو دیو اتیرے عکسِ رخ سے جگمگا اٹھے

ہوئے آثارِ ظاہر یک صدمت میں کثرت کے کیا آئینہِ خازن کا وہ نقشہ تیرے جلوئے نے

کہے جو پر تو غورِ شیعہ غمِ شہنشاہ کا

بظاہر کتنی حکمِ خازن کی بسا رکھی مگر خود سخیِ صانعِ وجہِ اسبابِ فنا نکلی

بنے گی صاعقہ اک دن یہی صانع کی دل گری مری تعمیر میں مضمحل ہے اک صورتِ خرابی کی

گزشتہ سے پیوستہ جو جنبشِ لبِ زندگی بخشے والی تھی میرے لئے موت کا باعث بن گئی۔

ہیولے برقِ خرمن کا ہے خونِ گرگدِ تنقار کا
 دمِ ہیجانِ وحشتِ پاؤں میں ہوتا ہے اک کلر
 مری اہولے بن بکر گولے اٹھتے ہیں طن بھر
 یہ نوبتِ صحن کی پہنچی کہ چمک زن ہے محراب
 اکا ہے گھومیں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
 ملار اب کھوٹے پر گھاس کبے میے دریاں

میرے جل جھینے کی دنیا کو ناقہِ جستجوئیں ہیں
 جگر کی آگ کا اظہار کم ظفوں کی خوئیں ہیں
 نہ شکوے میں نہ لب پر سوزِ دل کی گفتگوئیں ہیں
 خوشی میں نہال خود گشتہ لاکھوں ازوئیں ہیں

چرخِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا
 تصور میں جو وہ تصویرِ پر انوار باقی ہے
 یہ اک شکلِ تسلی بخش جانِ زار باقی ہے
 ہونے ہم خاک اس کی گرمی بازار باقی ہے
 دلِ افسردہ گو یا جرہ ہے یوسف کے زنداں کا

مری قسمتِ بری ہے آپ ہوتے ہم نشیں رنہ
 پسندایا ہے کرتے کیوں مجھے اندوگئیں رنہ
 یہ وری دیدہ و دانستہ ہے بہتے قریں ورنہ
 بغل میں غیر کی آج آپ سوئے ہیں کہیں رنہ

سبب کیا خواب میں اگر تم مہائے نہاں کا
 سبب تیری خوشی کا میں نے مہائے کو بھاتا
 ترا غم دیکھ کر عجب کو قلع ہے اپنے مرنے کا
 یہ میری تعزیت اور سب مل ملکر تزار ونا
 نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
 قیامت ہے سرخ آلودہ ہونا تیرے شرکاں کا

کھلا ہے سامنے منظرِ عدم آباد کا غالب
 سمجھتا ہے اسے مرزا سفر کا مہتا غالب

اسی میں منتشر ہوتے ہیں اور اوراقِ غالب
نظر میں ہے ہماری جاوہ راہِ فنا غالب
کر یہ شیرازہ ہے عالم کے اجڑا پریشاں کا



کیوں ہو رہا ہے خیمتہ برط نواز کا گرویدہ کس لئے ہے عراق و حجاز کا
ہے ہرزباں پہ راگ اسی بے نیاز کا محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

خنداں جو میرے حال پہ وہ ماہ پار ہے جاگے نصیب اونچ پر اپنا ستار ہے
پڑ مرگیا یہ میری خوشی کا اشارہ ہے رنگ شکستہ صبح بہارِ نظر آ رہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

ملتا بھی ہے جو مجھ سے تو آمادہ ستیز دشمن کے ساتھ رام ہے مجھ سے رگ و گریز
مجھ سے تنفر اور رقیبوں سے خیر و میز تو اور سوئے غیرِ نظر ہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری مژدہ ہائے دراز کا

بیتاب ہوں گا صورتِ برق و شمر نہیں نلک کروں گا درد سے شام و سحر نہیں
خاموش ہوں جتاؤں گا دردِ گلشن میں صرف ہے قبط آہ میں میرا و گرنہ میں
کلمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

سب کے ہیں انکی بزمِ میلِ رمل نکل ہے آبِ بقا کے چشمہ ہیں گویا اُبل رہے

مستوں میں پہ پہے ہیں عجب دور چل ہے ہی بسکرو خوش بادہ سے خیشے اچل ہے
ہر گوشہ بساط ہے سرشیشہ باز کا

اُس کو ہے رات دن طلب تیر سینہ دوز مطلوب اس کو شام و سحر و سیرینہ سوز
اس بواہوس کو چاہیے اک زخم تازہ روز کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہنوز

ناخن پہ قرض اس گرہ نیم باز کا

مرزا کے دل کی پوچھتے ہو بات کیا اسد صدقے میں عشق کے بیجر گھر اسد
بر باد مفت گنج جوا ہر گیس اسد تاراج کاوش غم بھراں ہوا اسد

سینہ کہ تھا دھینہ گھر ہائے راز کا



ہو نوید اہل سخن کو خیر کا منظر کھلا باب بیدل وجود گو یا کتہ سخنوں پر کھلا
اس جہان سے گرد و دوش کا در کھلا بزم شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا

رکھو یا رب یہ در گنجینہ گو ہر کھلا

زینت بزم فلک کا حال جب بھر کھلا تب مسرت سے ذرا پناہ دل مضطر کھلا
شاہِ خار چھپ گیا روتے میر انور کھلا شبِ ہولی پھر انجم ز شندہ کا منظر کھلا

۱۔ ان مشاعروں کا طرف اشارہ ہے جو حضرت بہادر شاہ ظفر کی زیر پرستی قلعہ علی میں ہوا کرتے تھے اور
جن میں مرزا صاحب بھی شرکت کیا کرتے تھے ۲۔ دوسرے شعریں شاہ کی چہل پہل اور رونق کو بتکرار کے
حسن و جمال سے تشبیہ دے کر ایک لطیف بات پیدا کر دی ہے۔

اس تکلف سے کہ گویا بت کردہ کا در کھلا

چاہیے مدت اگر یاروں کے گناؤں فریب انکی ہر اک بات میں چاہوں تو دکھلاؤں فریب
اعتبار انکے مجھے کیونکر ہو جب پاؤں فریب گرم ہوں لیوانہ پر کیوں دست کا کھاؤں فریب

آستیں میں دشنہ نہ پاں ہاتھ میں نشتر کھلا

بزمِ زمیں سے اس بڑاؤ کی کب تھی امید نشہ میں آئندہ مٹنے کی بھی دیتا ہے نوید
اس خوشی میں ہے دل وارفتہ نگرم نشید گو نہ سمجھوں انکی باتیں گو نہ پاؤں اسکا بھید

پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پہکے کھلا

عمر بھر دل میں رہا شاہد پرستی کا خیال اب حقیقت کھل گئی اسکی کہ تھا اچھا خیال
اس بہشتی رو کا آخر آج کام آیا خیال بے خیال حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال

خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

واہ کیا ہنسنے کا زینت دہے حسن و نشیں حسن کے پر تو سے ہو جاتا ہے زبور بھی حبس
نور سے اس لئے تباہاں ہے ہنسنے خوشہ چیں منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں

زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

گھر کی ظلمت دیکھ کر یہ فائدہ کپوں ہوں ملوں جو بلا نازل ہو سر پر بچکوبے دل سے قبول
کیونکہ شبِ تیرہ کا شکوہ لب تک آنے دوں قبول کیوں نہ چھری ہو شبِ غم ہے بلاؤں نزول

آج ادھر ہی کو بے گادیہ اختر کھلا

جب کیا قصور تو تھا طبیعت میں خیال اپنے بیکانوں کی الفت چمکے دل سے نکال
کر دیا ترک وطن ترکِ تعلق ہے محال کیا رہوں بت میں خوشی جب خود ادا نکال

نام لانا ہے وطن سے نام بردا کر کھلا

میں نے دل پر نقش کر لی حضرت مژا کی پسند چاہی ہو سی اہل و دنیا کی نہیں مجھ کو پسند
 آستانِ غیر پر کیوں جاؤں ہو کر مستمند اسکی امت میں ہوں میں میسے رہیں کیوں کار بند
 واسطے جس شہ کے غالب گنبد بے در کھلا



اسکی آمد کے تصور میں جو میں بے تاب تھا نیند کا آنکھوں میں ناک خیال خواب تھا
 اشکباری سے رواں اک سیلِ خونِ ناب تھا شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرہ ابراب تھا
 شعاعِ حوالہ ہر اک حلقہ گر داب تھا
 کنجِ تنہائی میں میں تھا اور وہاں دربارِ ما وہ عدسے کے ساتھ ہنسنے تھے محفلِ سحر کا
 میں بہا تا تھا یہاں نسو وہاں تھا دورِ جا وال کرم کو غدر بارش تھا افعالِ گیرِ خرام
 گریر سے بیاں پینہ بالش کفِ سیلاب تھا
 میں یہاں سنبل کی صورتِ غم سے تھا آشفہِ جا اور وہاں راستہ ہوتے رہے زلفونکے جال
 حق یہاں حیرت ہاں تھی آئینہ کی دیکھ بھال و ان خود آرائی کو تھا موتی پرٹنے کا خیال
 بیاں ہجومِ اشک سے نارنگہ نایاب تھا

لے فقطح میں قاتبِ ماسک شبِ معراج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ میں بھی امت میں ہوں جن کے لئے عرش
 پہ جاتے وقت آسمان کے دروازے کھل گئے تھے پہو میرے کام کس طرح بند رہ سکتے ہیں وہ بھی کھل جائیں گے۔
 معراج اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک رات حضرت محمد کو دیکر انبیاء سے ان کا درجہ بلند کرنے
 کے لئے عرش پر بلا یا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک خاص سواری (براق) پر سوار ہو کر آسمانوں کا فاصلہ طے کر کے
 اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچے تھے۔

وہ وہاں کرتے تھے ہاتھوں سے خالی شست و شو
 بہرہ تھا دل یہاں سینے میں ہو ہو کر لہو
 چاند ناگلشن میں تھا ظلمت یہاں تھی چارو
 جلوہ گل نے کیا تھا واں چہراں آب جو
 یاں رواں شرکان چشم تر سے خون ناب تھا

سو گئے وہ سنتے سنتے قصہ خواں کی گفتگو
 اور یہاں برسا کیا تا صبح آنکھوں سے لہو
 فرش راحت پر روتے اور ہم پریشاں کو کبھو
 یاں مشورہ کیا خرابی سے تھا دیوار جو
 واں وہ فوقِ نازخو باش کم خواب تھا

تھی یہاں کبھی مونس وہاں مغل جمی
 تھا یہاں دل صرف غمِ عشرت وہاں مسرت تھی
 وہاں تھے شمعِ مغل تھی یہاں ک لٹو لگی
 یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بخودی
 جلوہ گل واں بساطِ محبتِ احباب تھا

عیش میں وہ عورتیں دردِ غم میں مبتلا
 وہ وہاں سرشارِ بادہ میں یہاں لبتا شہ تھا
 یاں زمیں سے آسمان تک سوختن کا باب تھا
 وہ وہاں خنداں و فرحاں میں یہاں گمراہ کا

شوقِ جب سے زیادہ مجھ کو ٹپانے لگا
 سببِ سوزاں میں میرے گمراہ کا لگا
 چپکے چپکے میں کچھ اپنے جی کو سمجھانے لگا
 ناگہاں اس رنگ سے خونا برپیکانے لگا
 دل کر دوق کاوشِ ناخن سے لذتِ یاب تھا

شوق میں مضطرب مثالِ ماہی بے آب تھا مضطرب ایسا کہ گویا برق تھا سیما بے تھا
اسکی حالت سے پریشیاں جلسہ ہوا تھا نالہ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا
تھا سپندِ بزم وصل غیر گویتاب تھا

رہا دن نالہ ہی اس سے گوش زد تھے نکلے یاد ہی اسکے سوا گویا نہ تھی کچھ اور لے
جوشِ گریہ کے سوا بھاتی نہیں ہو کوئی شے مقدم سیلاب سے دل کی ناشائستہ گنگ ہے
فائدہ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

اسکے ذرہ کی خاک کو طلس کہوں یا کہوں اس زمین کے فرش کو یا فرشِ نخل کا کہوں
ہے بجا قائم سے نرمی میں اگر اگلے کہوں نازشِ ایام خاکستر نشینی کیا کہوں
پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ نہاب تھا

تھا اسی کے نور کا ہر چیز میں جلوہ عیاں ہو گیا کچھ پردہ غفلت ہی عاملِ درمیاں
حیف ہے یونہی گئی محرابِ دیواریں گیاں کچھ نہ کی اپنے جنوں نارمانے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ رُکوشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

یاد ہے صبا داپنا وہ زمانہ بھی تجھے آب و دانہ کی ہمائے فکر رہتی تھی تجھے
بیکسو کے حال سے غفلت نہ تھی اتنی تجھے آج کیوں پروا نہیں اپنے اہیر و نکی تجھے
کل تلک تیرا ہی دل نہرِ وفا کا باب تھا

آخرے میا دیکھا ضد ہے تجھے کچھ تو بتا دیکھ کر مجھ کو جو تونے دام اکٹھا کر لیا
شوق سے یوں تیرے پھنڈ میں کوئی آیا بھی تھا یاد کرو وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا
انتظار صید میں اک دیدہ بنے خواب تھا

ہونے والا تھا باطوفان اسکے انگ سے پوچھنے کیا ہو کر اک اک قطرے دریا ہے
خیریت ہی ہو گئی مرزا کہ آنسو تم گئے میں نے روکالات غالب کو گورنہ دیکھتے
اسکے سیل گریں گریں گریں کف سیلاب تھا

۱۱

ہم جو چاہیں کسی ذرے کا بیاباں ہونا ہے عبث چارہ و تدبیر میں حیراں ہونا
محنت کا سبھی ممکن نہیں امکاں ہونا بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ابرفرگاں نے جو ٹھہرائی ہے رسالے کی نوبت آئے نہ کسی دن کے بہر جانے کی
شکل ہونے لگی ہر گوشے میں برائے کی گویہ چاہے ہے خرابی مرے کاشلے کی
درو دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

بس جو دل پر ہو میرا کچھ تو اسے روکوں تو میں اس آواہ کا تا چند ہوں نگا دل جو
اپنے انجام کو سوچوں یہ مجھے ہوش بھی ہو وائے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

بخت آئینہ تیرے حسن سے کیا چمکا ہے سامنے آنکھوں کے پردہ بخیزیا ہے
خود نمائی کا جو ہے شوق تو بجا کیا ہے جلوہ از بس کرتا قضاے نگہ کرتا ہے
جو ہر آئینہ بھی چاہے ہے مڑگاں ہونا

حاصل آنکھوں کو ہے جو ذوق کئی مت پوچھو انبساط دل سرگرم تماشا ممت پوچھو
حسرتیں آج نکلنے کو ہیں کیا کیا مت پوچھو عشرتِ قتلِ گہر اہل تماشا مت پوچھو
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عسریاں ہونا

یوں تو ہر دل میں ہے کس دل میں ہیں طغناٹا ہاں جبکہ دل میں ہمارے ہی نہ کی وائے نشاط
جیتے جی میں رہی جوشِ سوداے نشاط سہ گئے خاک میں ہم داغِ تمناے نشاط
تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

عشق نے ذوق ہر اک چیز کو بخشا ہے جدا سینہ مشتاق سناں مرکو تبر کا سودا
جان بیتاب کو ہے شوقِ فدا ہونے کا عشرتِ پارہ دل زخمِ تمنا کھانا
نزد ریشِ جگر غرقِ نسکداں ہونا

جیتے جی میرے نہ کی مکر و دغا سے تو بہ نہ تم سے نہ کسی جرم و خطا سے تو بہ
بھول کر بھی تو نہ کی خوفِ خدا سے تو بہ کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے تو بہ
ہائے اس زور و ہیشماں کا پشیمان ہونا

ہوتی ہے حضرت مرزا کو جو دشتِ غالب پھر تو آجاتی ہے بلبوس کی شامتِ غالب
جیبِ اس کی تو ہوتی ہے بُری گتِ غالب جیت اس چارگرہ کپڑے کی قمیصِ غالب
لے (ماٹیرا لے مٹویر)

جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گرہاں ہونا

۱۲

مجھ سے غم آشام کا احباب غم کھائیں گے کیا
خوگر کلفت کو وہ آلام پہونچائیں گے کیا
جوشِ وحشت کے ہوتے زخم سلوائیں گے کیا
دوست غمخواری میں میری سخی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھائیں گے کیا
یہ جفا کاری روار کھو گے ہم پر کب تلک
اس طرح مالو گے قصہ سن سنا کر کب تلک
ہوگی آخر حاجتِ عرض مکر کب تلک
بے نیازی حد سے گذری بندہ پر کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا
دوست کیوں پند نصیحت پیتے ہیں خواہ خواہ
مجھ کو کچھ دیوانہ سمجھا ہے کسی نے واہ واہ
ہوں تحیر میں کہ آخر کیا ہوا مجھ سے گناہ
حضرت نامح جو آئیں دیدہ و دل فرشتہ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا
قتل گہرے روز کو نہا کامیاب آتا ہو کیا
وقتِ عرضِ مددِ قاتل سے شرماتا ہوں میں
دیکھئے تو راہ پر کینہ مکر انھیں لاتا ہوں میں
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
غدر میرے قتل کرنے میں وہ اب لاویں گے کیا

حاشیہ گذشتہ صفحہ کا رد مرزا صاحب کو ایک دفعہ زندان میں لگی جاتا پڑا۔ رہائی کے دن جب وہ چلنے لگے اور
باس تبدیل کوئے کا سر تلخ آیا نوکرتو وہیں پھاڑ کر پہنچا اور یہ شعر پڑھا ہے
جیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گرہاں ہونا

چارہ سازوں نے جو زنجیروں باندھ لیوں ہیں ہے ہی یہ جانِ وحشت کا دوا یوں سہی
ہو نہیں سکتا جو کوئی اور چارہ یوں سہی گر کیا نامح نے مجھ کو قید اچھا یوں سہی

یہ جنوں عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا
ہتھکڑی اور طوق گردن گیر سجائیں گے کیوں خوگر ایذا میں ہم تعزیر سے بھاگیں گے کیوں
اس مناسب چارہ و تدبیر سے بھاگیں گے کیوں خاندازِ زلف میں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتار و فائزنداں سے گجرائیں گے کیا

یوں تو ہے یہ شہر اک منزل گہہ شہر تاسد ہر طرف ہے عیش کے سامان کی کثرت تاسد
پیش ہے بایں ہمہ مرزا کو یہ دقت تاسد ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غم الفت تاسد

ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھاویں گے کیا

لے مرزا غالب نے یہ نہیں کہ یہ غزل کہی ہوگی مگر مقطع کے مصرعہ ثانی کا مضموں میں درجہ تحت خط سے وابستہ نظر آتا ہے جب
کہ وہ معصائب و فکر سستی کا اشارہ ہو کر دلی کو خیر باد کہے کا ارادہ کر چکے تھے فرماتے ہیں :-

”خوشی مجھ میں تم میں مشترک ہے تنہے مجھے تنہیت دی تو مبارک و میں نے تمہیں تنہیت دی تو مناسب الحمد للہ الشکو
بھائی پر تو یوں ہے کہ ان دنوں میں میرے پاس ٹکٹ نہیں اگر ہرگز بھول تو کہا رہا نہ اٹھ نہیں سکتا ڈاک گھونٹک جائے کوں؟
اپنا مقصود تھا کہ والدہ ماجدہ سے اور تمہاری جدہ ماجدہ اور تمہارے غم عالی مقدس سے کہہ چکا ہوں، خلاصہ یہ کہ میری بیوی اور
بچوں کو کہ یہ پہلوی قوم کے ہیں مجھ سے ملے لو۔ میں اب اس وجہ کا تحمل نہیں ہو سکتا، انہوں نے بھی بشرط ان لوگوں کے دوبارہ
خانے اس خواہش کو قبول کر لیا میرا مقصد سیاحت کا ہے، فیشن اگر کھل جائیگی تو وہ اپنے مرف میں لایا کروں گا جہاں ہی لگا
وہاں رہ گیا۔ جہاں سے دل اکٹھ گیا چل دیا۔ مگر مرزا غالب صاحب اپنے خاندانی وقار کا پورا خیال خاطر رکھتے ہوئے دلی
چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیا اور وہ دلی سے ماہرنگے جیسا کہ ایک خط نام حکیم غلام نعت خاں میں لکھے ہیں۔ بھائی میرا
دکھ سنو، پٹیا لے جانے میں ایک سبکی اور ذلت تھی۔“

ہیں اس کی بزم میں اگر اذن بار ہوتا دل غم زدہ نہ غم سے کبھی رشتکار ہوتا
شب و روز وقفِ حواں یہ امیدوار ہوتا یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا

اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ہیں پیشتر عیاں تھا ترا وعدہ پر نہ آنا بس اب اور جھوٹا کہہ کر ہے عبتِ یقین لانا
نہ کر اب یہ غدر بجانہ تراش کچھ بہانا ترے وعدے پر جیتے ہم تو یہ جان چھو جانا
کہ خوشی سے مرنے جاتے اگر اعتبار ہوتا

یہ شکستِ عہدِ الفت ہے مقامِ حیرت افزا کہ نہیں یہ کام ہرگز کسی تجھ سے نازنین کا
مگر اس قدر تو کھولا مرے دل نے یہ معما تری ناز کی سے جانا کہ بندھا تھا عہدِ بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

ترے ناوکِ ستم پر دل و جان فدا ہیں اب تو کہ نہ کال دیں انھوں نے مری حسرتیں تھیں جو جو
جو ملا ہے لطف کاوش وہ زبان کیا بیان ہو کوئی میرے دل سے پوچھے کسے تیرے کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ خطِ ملا ہی دل تھا یہ میرا ہی تھا طبعِ بیا ہزار صبر و تمکین سمی آفتوں کو حبیبِ لا
کسی کو یہ میں کہاں ہے مرے سوزِ غم کا یارا رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمنا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شہار ہوتا

یہ عجیب بات کی ہے کہ بنے ہیں دوست نامح
یہ انوکھی دل لگی ہے کہ بنے ہیں دوست نامح
کوئی چال یہ نئی ہے کہ بنے ہیں دوست نامح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

ہوا ضبط چارہ گر کو کہ جو تم سے مشتعل ہے
نہیں دل کا کوئی چارہ جو غم سے مضطرب ہے
نہیں سہل غم سے چھٹنا یہ شریکِ آبِ گل ہے
غم اگر چہ جانگسل ہے پہ کہاں نہیں کہ دل ہے
غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

نہیں شب ہی بھلو بجاری کہ دن اس بھی سولے
وہ بلائے جانگسل ہے تو یہ دلو جال گزارے
کبھی جاں لیوں پر آئی کبھی دم نکل گیا ہے
کہوں کس سے میں کہ کیا شب غم بری بلے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہیں تھا جو شوق جلوہ تو قصور فہم کا تھا
ہے مقام شکر لیکن کہ خدا نے پردہ رکھا
رہی شرم اپنی ورنہ کسے تھا نظر کا یارا
اے کون دیکھ سکتا کہ ریگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ کسی پر اپنا مرنا ہوا کھیل دوستوں کا
کہ لگا دیا ہے سب نے سر قبر ایک میل
لگے اپنی جان سے ہم انھیں ہو گیا تماشا
ہوئے مرے ہم جو رسوا ہوئے کیوں غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھنا نہ کہیں مزار ہوتا

ہوئی معرفت میں گویا جو تری زبان غالب
تو سمجھ گیا ہے مزا جو ہے تیری شان غالب
کوئی اب بھی تجھ سے کیونکر رہے بولگان غالب
یہ مسائلِ نصوص یہ ترا بیان غالب
لے ماشیہ اعلا صفر

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بارہ خوار ہوتا

۱۳۷

بشر کرتا ہے بیجا ادعا کیا یہ کر سکتا ہے ترک مدعا کیا
اسے تو دھن ہے ہو گا کیا ہو کیا ہوئیں کو بے نشاط کار کیا کیا

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

نہیں سمجھے ہو اب تک ماجرا کیا کہا کیا ہم نے اور تم نے سنا کیا
مال آخر ہے استغلام کا کیا تجاہل پیشگی سے مدعا کیا

کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

عدو پر لطف دونا دیکھتا ہوں روابط بھی زیادہ دیکھتا ہوں
مدارا میں اضافہ دیکھتا ہوں نواز شہائے بیجا دیکھتا ہوں

شکایت ہائے رنگیں کا گلہ کیا

بھنور ہیں نغمہ پردازانا لبحر عیاں موجوں سے آوازانا لبحر
صبا بھر کو نازانا لبحر دل ہر قطرہ ہے سازانا لبحر

ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

ذرا اس بے زبان دل کی صدا سن کچھ اپنی قدر دانی کا گلہ سن

حاشیہ گزشتہ صفحہ کا: غفر بادشاہ نے مطلع سنا تو کہا کہ تم تو اس وقت بھی نہ سمجھتے۔ غائب نے کہا حضور تو اب بھی ایسا
بھی سمجھتے ہیں یہ اسلئے ارشاد ہوا کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں۔ ۱۴

یہ عمل بے بہا کہتا ہے کیا سن سن سے غارت گر جنس وفا سن
شکست قیمت دل کی صد کیا

ہوائے سنبل و سوسن نہیں ہے طبیعت مائل گلشن نہیں ہے
بسائیں کیا یہاں دامن نہیں ہے دماغ عطسہ پیراہن نہیں ہے
غم آوارگی ہائے صد کیا

کیا ہے کیوں جفا کاری کا دعوے جتایا کیوں تم گاری کا دعویٰ
تجھے کیوں ہے دل آزاری کا دعویٰ کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ
شکیب خاطر عاشق بھلا کیا

ابھی تک مئے کہاں ساقی نے دیا ہے مگر حالت کمال نشہ کی ہے
کسی کی چشم میگوں دیکھ لی ہے نفس موج محیط بخود دی ہے
تفاطل ہائے ساقی کا گلہ کیا

عبث دشمن کو جلوسے کی ہوس ہے کہ اس کو اک نگاہ گرم بس ہے
اسے کیا سوزش پہاں سے مس ہے فروغ شعلہ رخس یک نفس ہے
ہوس کو پاس ناموس وفا کیا

کبھی تو جو ہر تیغ نظر دیکھ پھر اپنے جاں نثاروں کے جگر دیکھ
نہیں الزام تجھ پر بے خطر دیکھ مابا کیا ہے میں ضامن احمد دیکھ
شہیدان نگہ کا خوں بہا کیا

اس اپنی آرزو پر مرثا ہوں کر نصب العین چشم سرمہ سا ہوں
 ہم تن شوق نظر را ہوا ہوں نگاہ بے جا با چاہتا ہوں
 تغافل ہائے تمکین آزمایا

یہ ذکر جلوہ فردا کیا کیوں ابھی سے کر دیا محشر پیا کیوں
 تغافل اس قدر رکھا روا کیوں یہ قاتل وعدہ صبر آزمایوں
 یہ کافرستہ طاقت ربایا

کہے کیا کوئی اس کی بات پر بات کہے افسوں و جادو سرسرات
 نہیں ہے کوئی مرزا بے اثر بات بلائے جاں ہے غالب الکی ہر بات
 عمارت کیا اشارت کیا ادا کیا

۱۵

کون کہتا ہے کوئی عاشق شیدا نہ ہوا ہاں یہ دعویٰ ہے کہ ہم سا کوئی ہو گا نہ ہوا
 اپنی یکتائی کا دعویٰ ہمیں بے جا نہ ہوا درخور قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
 پھر لفظ کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

ہم سے رکھیں نہ یہ امید کبھی اہل کرم بند ہے در تو کریں طوف صدا دیں پیہم
 زعم ہے فرسہ یاں فقر و غنا پر ہر دم بندگی میں بھی وہ آزاد و خود ہیں کہ ہم
 اگلے پھر آئے دیر کعبہ اگر وا نہ ہوا

حسن کا تیرے زمانے میں ہے سکا ایسا سلنے ماہ میں کوئی گھڑی جم دسکا
ہ شرم سے ہر چہاں تاب بھی ہے رو بقنا سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکنائی کا

رو برو کوئی بت آئی نہ سیمانہ ہوا

کب تری آنکھ کے بیمار نے پہا ہا درماں کب ہوا چارہ گروں سے دوا کا خواہاں
چشم بد دور سے ہے یہ مرض راحتِ جاں کم نہیں نازش ہمنامی چشمِ خواہاں

تیرا بیمار برا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا

کیا فغاں ہے وہ فغاں جس سے کوئی دل نہ ہلا کیا کہیں آہ پھر اس آہ کو جو ہونہ رسا
ہے وہ فریادِ عبث جس سے کوئی گھر نہ جلا سینے کا داغ ہے وہ نازک لبِ ننگ گیا

خاک کا زرق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

جھیلتا ہوں جو شب و روز غم و بے بلا یہی مقصود تھا شاید کہ میری خلقت کا
کوئی حرمِ ازل زلزل اور نہ تھا نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا

کام میں میرے ہے وہ فتنہ کہ ہر پانہ ہوا

سن کے ذکر پیشِ قلب رہے صبر کی تاب داستانِ شبِ غم اور نہ اڑے آنکھوں سے خواب
سوز دل کا ہو بیاں اور گلبرہ ہو نہ کباب ہر بین سے دم ذکر نہ ٹپکے خوں ناب

جزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچانہ ہوا

جرم سے میں نہ ہو جلوۂ مہمانہ و مل ذرہ ذرہ میں نہ ہو سیرِ بیاباں و سبل
غنیہ گل میں نہ آجائے نظرِ گلشن و گل قطرہ میں دھلا دکھائی نہ دے اوڑھنِ کل

کھیل لڑکوں کا ہوا دیدہ بینا نہ ہوا
مدتوں خط و کتابت رہی مزا اس سے تب کہیں قتل کا اقرار کیا تا تل نے
آج کچھ قتل کے سامان بھی قتل میں ہوئے تھی خبر گرم کر غالب کے اڑیں گے پورے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے یہ تماشا نہ ہوا

۱۶

بجا ہے تم کرو جو کچھ گلہ اپنے فدائی کا ادا اس سے نہ کچھ بھی ہو سکا حق آشنائی کا
نہ پہونچا بزم تک تو غد ہے ہیبت و پائی کا پئے نذرِ کرم خفہ ہے شرم نارسائی کا
بچوں غلطیہ صدرنگ دعویٰ پارسائی کا

ابھی تک تو رہا پردہ تہا ری خوش دانی کا نہ ہو جائے کہیں دنیا میں شہرہ دلربائی کا
کسی دن رنگ لائے گا یہ لپکا خود نمائی کا نہ ہو حسن تماشا دوست رسوا یوفائی کا
بہ بہر صدر نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

ترے نور و ضیا سے فیض ہر وہا کو پہونچا مگر حسرت کش اک میں ہی رہا تیری تمکلی کا
ترے در پر جو سائل اُگیا خالی نہیں جاتا زکوٰۃ حسن دے لئے پیش کش کر ہر آسا
چراغ خانہ درویش ہو کا سہ گدائی کا

ہمیں تو یہ تمنا تھی کہ سر ہو اور ترا خنجر سرِ مقتل کہا کس نے کہ لے قاتل رعایت کر
یقیناً تجھ سے ہو گی باز پرس اسکی سرِ محشر نہ مارا جان کر بے جرم غافل تیری گردن پر

رہا مانند خون بے گنہ حق آشنائی کا
 ۱۔ محمد الشجیب سے شیوہ ملی سانی ہے نہ قصہ درد کا لب پر نہ کچھ غم کی کہانی ہے
 خموشی میں بسر ہوتی ہے اچھی زندگانی ہے تمناے زباں جو سپاس بے زبانی ہے
 شاجس سے تقاضا شکوہ بے دست و پائی کا
 مرے زخموں کی صورت سے جو ملی ہر طور گل ہے اسی صورت کا صدقہ ہے کفر و قیمت گل ہے
 مرے ہی خوں شدہ دل کا صدقہ حرمت گل ہے وہی اک بات ہے جو یافنس اُن نکہت گل ہے
 چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا
 وفادار و لیسے بھی تو نے جو بد عہدی کی ٹھہرائی شکایت بے دہن لوگوں کے لب تک بھی تری آئی
 حسینوں سے زبان طعن آخر تو نے کھلوائی دہان ہر بت پیغارہ جو زنجیر رسوائی
 عدم تک بیو فلہر چاہے تیری بے وفائی کا
 نہ ہو گا ختم نامہ یوں تو چاہے جس قدر نکھڑے پڑے گا کون تو دفتر کے دفتر بھی اگر نکھڑے
 مناسب ہے کہ مرزا کی طرح مصرع تر نکھڑے نہ وہ نامہ کو اتنا طول غالب مختصر نکھڑے
 کہ حسرت سبغ ہوں عرض ستم ہائے جدائی کا

چپ رہے تو اس کو راحت کا گال ہو جائیگا جو گلہ دل کو بے دل ہی میں نہاں رہ جائیگا
 جو بیاں سے مدد ملے رائیگاں ہو جائیگا گردن اندوہ و فرقت بیاں ہو جائے گا

بے تکلف داغِ مدہر دہان ہو جائے گا
ہستِ خم ہے بیٹھنے لک کو کربِ اضطراب
ہے شبِ مر میں طبیعت کو بلا کا بیچ و تاب
رو و مدائیں کہیں پیدا نہ کرنے ماہِ تاب
پر تو مہتابِ سیلِ فائماں ہو جائے گا

نراست میں ہے کس انداز سے وہ سبکبر
سورہا ہے مست مہیا ہے جوانی بے خبر
عاجبِ کم و زیادہ میں ہوں یہ حالت کچھ کبر
لے تولوں سوتے میں اسکے پاؤں کا بو گر
ایسی باتوں سے وہ کافر دگماں ہو جائے گا

اگر دعویٰ ابتدا میں تھا بہت کچھ عشق کا
عمر بھر الفت نہا میں گے یہ اپنا قصد تھا
کچھ جب اس سے لڑی سب جو صلا جاتا ہا
دل کو ہم صرف وفا تجھے تھے کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذر امتحان ہو جائے گا

ری مرضی سے ہے وابستہ زمانے کی ضیا
اس سے دنیا پھر گئی تو جس سونا خوش ہو گیا
نے چاہا جس کو مقبولِ دو عالم کر دیا
سبکِ دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

جو مجھ کو فرطِ غم میں لیں ہی خوں رنے کا خط
اور کھلے میں رہا یوں ہی جگر اور دل کو ربط
یہ نہ ہو جائیئے دونوں کے دونوں و خط
گزر گاہ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط
شعلہ خس میں جیسے خوں لگ میں نہاں ہو جائے گا

کچھ کرنا لاں مجھے مرغِ چین میں نومِ گر
میری حالت پر کیفِ افسوس میں برگِ شجر
وہائیں چاک چاک غم سرخسوں کے بگر
باغ میں مجھ کو نہ لے جاو نہ میرے حال پر
مگر تیرا اک شتمِ خوں فشار ہو جائے گا

منتظر میں بھی ہوں فوائے قیامت لے تو اپنی اپنی دوا اسی دن پائیں گے انصاف جو
 اک بڑی امید پر جمیلا ہے تیرے ظلم کو وائے گر میرا ترا انصاف عشرت میں نہ ہو
 اب تلک تو یہ توقع تھی کہ وہاں ہو جائیگا
 یاد رکھ سننے کے قابل پذیر مرزا ہے اسد ہوش میں آگیا ہوا دل کس کو دیتا ہے اسد
 بتلا اک طفل پر ہونا کچھ اچھا ہے اسد فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسد
 دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائیگا

یوں تو میرا علاج کیا نہ ہوا کم مرض ہے مگر خرا نہ ہوا
 مجھ پر احساں طیب کا نہ ہوا درد منت کش دوا نہ ہوا
 میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
 ہو گے رسوا تمہیں کہا مانو بات بڑھ جائے گی بہت یوں تو
 چل کے سن لو الگ جو سنتے ہو جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
 اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

اس غزل کے متعلق مرزا غالب نے مذکورہ مضمون علی قہر کو لکھا ہے۔

میرا کلام میسے پاس کبھی نہیں رہا، ضیاء الدین خاں اور حسین مرزا جمع کر لیتے تھے جو میں سے کہ انہوں نے
 لکھ لیا۔ ان دونوں کے گھر لٹ گئے ہزاروں روپے کے کتب خانے برباد ہوئے۔ اب میں اپنے کلام کو دیکھنے کو نرسا
 ہوں۔ کئی دن ہوئے ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور غمر پر داز بھی ہے ایک غزل میری کہیں سے نکھو
 لایا۔ اس نے وہ کافروں کو دکھایا یقین سمجھنا کہ مجھ کو روٹا آیا غزل تم کو بھیڑا ہوں اور صلیب اسکے اس خط
 کا جواب چاہتا ہوں۔ اور خط کے ساتھ مندرجہ بالا غزل بھی لکھی "درد منت کش دوا نہ ہوا۔" ..

اور تجھ ساحسں کہاں سے لائیں حسرت دل کی دلوں سے پائیں
کس کے ہاتھوں سے زخم دل کھائیں ہم کہاں قسمت آزمائے جائیں
تو ہی جب خنجر آزمائے ہوا

سخن تلخ کب ہے ان کے قریب ان سے باتیں سننے یہ کس کے نصیب
ہے ملاوت ہی کچھ سخن میں عجیب کتنے شیریں ہیں تیرے لب کر قریب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

جب ہیں دھن تھی انکے لانے کی استطاعت تھی گھر سجانے کی
اب جو بدلی ہوا زمانے کی ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

جان طاعت ہی میں کھپائی تھی کچھ خودی تھی نہ خود نمائی تھی
سر تھا سہمہ تھا جہ سائی تھی کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

قابل فخر کیا ہے بات اپنی عین احسان ہے اسکی خوشنودی
ہم نے اس پر نثار کیا شئے کی جان دی، دی ہوئی اسی کی مٹی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

غم سے خالی نہ کوئی دم گذرا کیا ٹھکانہ ہے کم نصیبی کا
کچھ نہ کچھ سلسلہ لگا ہی رہا زخم گر دب گیا ابھرنے لگا

کام گرگز گیا روا نہ ہوا
 دعویٰ دوستی زبانی ہے دل میں تو دشمنی کی مٹانی ہے
 قہر ہے یا یہ جہر بانی ہے رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے
 لے کے دل دِلستاں روا نہ ہوا
 مثل مرزا ممر وہ رہتے ہیں جی میں گھٹ گھٹ کے پھوٹتے ہیں
 سب غم انتظار رہتے ہیں کچھ تو پڑھے کہ لوگ کہتے ہیں
 آج عنالرب غزل سرائے ہوا

یہی ہمیشہ نشیمن رہا تمنا کا رہا ہے درد اسی میں تمام دنیا کا
 مگر ہے اب اسے درکار پہن صحرا کا گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا
 گہر میں موہوا اضطراب دریا کا
 ترا خیال و تصور جو دل کو ہے محبوب اسی سے نامہ نویسی کا شغل ہے مرغوب
 مجھے امید کرم اور تجھ سے ہو کیا خوب یہ جانتا ہوں کہ تو اور پانچ مکتوب
 مگر ستم زدہ ہوں ذوق خامہ فرسا کا
 نہ ہونگے گل روش روزگار اگر کو یہی پسے گا زیر قدم سبزہ زار اگر ہے یہی
 لٹے گا دہر کا نقش و نگار اگر ہے یہی خانے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
 دوام کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا
 ہنسی کا خاک بلیقہ نہیں کسی گل کو کہیں یہ سیر و تماشا نہ رخ افزا ہو

جمن کا قصد ہے یا رو تو مجھ کو ساتھ نہ لو غم فراق میں تکلیف میرا غنہ دو

مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

مثال آئینہ حیرت زدہ سراپا ہوں امید وار تجسلی روح افزا ہوں

رہیں شوق ہوں ستر باہا تمنا ہوں ہنوز محرمی حسن کو ترستا ہوں

کر رہے ہر بن مو کام چشم بینا کا

اب اور کیسے کہ انداز اس ستم گر کے دم نظارہ طلب گار جسکے پس ہم سے

اشارہ جان کا ہوگا تو یہ بھی روٹ دینگے دل اسکو پہلے ہی ناز واداسے دے بیٹھے

ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

مے سر رشک کا انداز سخت مشکل ہے کہ قطرہ قطرہ میں پوشیدہ بحرِ کامل ہے

حساب کا کوئی دعویٰ کسے تو باطل ہے نہ کہہ کہ گریہ بر انداز حسرتِ دل ہے

مری نگاہ میں ہے جمع خرچ دریا کا

ستم جو اسکے اٹھاتا ہوں لہرِ شاد آسند نہیں کسی سے طلب گارِ عدل داد آسند

نہ مجھ سے اس کو نہ مرزا سے غدا آسند فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اسکو یاد آسند

جفا میں اس کی ہے انداز کار فرما کا

اس نے جبِ خست پے رقعہ منازل باندھا چھڑے ناو مے گھر کے مقابل باندھا

مے نے کجاہِ سلف سے کاٹا باندھا جب بتوقیب سلف یار نے محل باندھا

تپش شوق نے ہر ذرہ اک دل باندھا
قتل کر دیے میں عشوہ تھا بڑا دستِ راز
بانی قتل کر شہر تھا انگہ تھی غماز
دیکھ کر آئید جب ہو گئے قتال انداز
اہل بنیش نے ہجرت کدہ شوخی ناز

جو ہر آئینہ کو طوطی بسمل باندھا

منہ ہی جس کا نہ کبھی عرض تمنائیں کھلا
اس کو حیراں کے سوا اور یہاں کیا ملتا
کام کچھ سہل نہیں تھا طلب مقصد کا
یاس و امید نے یک عہدہ میلہ مانگا
عجزِ مست نے ظلمِ دل سائل باندھا

اس بیباں میں ہیں حیراں دل غروں غالب
مالِ مزاج ہے جس میں دگرگوں غالب
ہو گیا فکرِ مضامین میں جگرخوں غالب
زندہ سے تشنگیِ ذوق کے سفھوں غالب
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

اگر میں صورتِ قطرہ دریا سے جدا ہوتا
تو کیوں درویشِ فقرِ بختِ نیست و کا ہوتا
گر ہاں نفی سے اثبات پیدا بر ملا ہوتا
نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈر لویا مجھ کو بولنے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

دل بیمار تو فکر و فائیں گھل گیا اپنا
جگر باقی رہا تھا اکو دردِ عشق نے کھایا
جھکا بارالم سے فرق یوں پہون نہیں ٹھٹھا
ہو اجب غم سے محسوس تو غم کیا سرکھٹنے کا

نہ ہوتا اگر جدا تن سے تو زانو پہ دھرا ہوتا

اسی کی یاد میں اٹھوں پہر دل تہلے لاتا ہے تصور اس کا مزارات دن دگھو دکھاتا ہے
خیال اکا بھلا کب کب طرنگیں سے جاتا ہے ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات کہنا کیوں ہوتا تو کیا ہوتا

کب کوئی باعث خونباری شرکاں سمجھا کب کوئی علت آہ شرر افشاں سمجھا
کوئی غم خوار نہ حال دل نالاں سمجھا وہ مری چین جیس سے غم پنہاں سمجھا
راز مکتوب بے ربطی عنوان سمجھا
لوث دنیا سے مکر ہے ماسینہ ہنوز دل میں باقی ہے ابھی کلفت دیر نہ ہنوز
خاک بھی شکل صفائی نظر آئی نہ ہنوز یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریاں سمجھا

حاشیہ گذشتہ صفحہ کا: حسب تخلیق عالم نہیں ہوئی تھی تب ہی خدا موجود تھا اور اگر کائنات پیدا نہ ہوتی تب بھی خدا ضرور ہرگز موجود نہ ہوتا۔ اگر میں پیدا نہ کیا جاتا تو میرا وجود بھی خدا کے وجود میں نہ غم ہوتا یعنی میری سستی ہی میری بربادی کا باعث ہوتی۔ ”مسیحی ہی تھی تھی۔“ اس شعر کی شرح خود غالب صاحب ماسٹر چاہیے لعل اشوبک خلیفہ اس طرح کی: پہلے یہ گھٹنا چاہیے کہ ”بے عارت فلاد کے آئینے سے ہے ورد جللی آئینوں میں جو ہر کہاں اور انکو یہ قتل کون کرتا ہے فلاد کی جس چیز کو قتل کر دے گا شہر ہے ایک لکچر ٹرنگی اسکو الف صیقل کہتے ہیں جب یہ مقدمہ معلوم ہوا تو اب اس شہوم کو سمجھئے معرہ۔ چاک کرتا ہوں میں جب کہ گریاں سمجھا یعنی ابتدائی س تیرے مشق جنون ہے دنک کمال فن حاصل نہیں ہوا آئینہ تمام صاف نہیں ہو گیا بس ایک نیکر صیقل کی جو ہے سچے چاک کی صورت لطف کی ہی ہوتی ہے اور چاک حسب آئینہ جنوں میں سے ہے۔“

حزن و اندوہ میں ناچاری خاطر مت پوچھ زلیست سے باعث پیناری خاطر مت پوچھ
 حال دشواری و بیماری خاطر مت پوچھ شرح اسباب گرفتاری خاطر مت پوچھ
 اس قدر رنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

کب یہ منظور ہے وہ علوہ غا ہو سرِ بام کب گوارا ہے کہ وہ رخ ہو نظر گاہِ عوام
 چاہتا ہوں رہے مستورہ شوخ خود کام بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرم خرام
 رخ پہ ہر قطرہ عرق دیدہ حیراں سمجھا

چھیڑ کر غیر نے اس کو جو غضب ناک کیا آگ ہو کر صفتِ شعلہ آتش بھڑکا
 باعث طیش تو اعیار کا سفلہ پن تھا تجس سے اپنے یہ جانا کہ وہ بد خو ہو گا
 بنضِ خس سے تیشِ شعلہ سوزاں سمجھا

قطع منزل کے لئے میں نے کمر تو باندھی پر نقاہت نے اجازت پئے رفتار نہ دی
 نوبت نہ آئی تھی دو ایک قدم چلنے کی سفر عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
 ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستاں سمجھا

کوئی پہلو بھی تو بچنے کا نہیں تھا دم مرگ نشتر آخر رگ جاں نے وہی کھایا دم مرگ
 پیش آیا وہی تقدیر کا کھاد دم مرگ تھا اگر یزداں مژدہ یار سے دل تادم مرگ
 دفع پر کانِ قضا اس قدر آساں سمجھا

یوں تو تم بھی اسے کہتے تھے جفا کارا سدا پھر بھی مژدے تھا کیا تمہیں ہیشیا راسدا
 کیوں ہوئے دیدہ و دانستہ گرفتار ااسدا دل دیا جان کے کیوں اسکو و فادلا سدا

غلطی کی کر جو کافر کو مسلمان سمجھا

۲۳

پھر مجھے یار کا در یاد آیا اپنا پھوٹا ہوا سر یاد آیا
پھر وہی خون جگر یاد آیا پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا
دل جگر تشنہ فر یاد آیا

تھا ترابیر عذاب جہاں سوز لفظ رحمت تھا سناں دلروز
پھر نصیبوں نے دکھایا یہ روز دم یا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقت سفر یاد آیا

جب ملا آنکھ پھر الی اپنی نظرِ لطف کسی دن نہ ہوئی
کی نہ اک روز تغافل میں کسی سادگی ہائے تمنا یعنی
پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا

کیوں نہ فر یاد مجھے ہو مشکل آبلے منہ میں ہیں سینہ گستاخ
میں کہاں آہ و فغاں کے قابل عذر و اماندگی اے حسرتِ دل
نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا

بستجو گر نہ تری کی جاتی یہ مصیبت ہی نہ جھیلی جاتی
جان کیوں مفت میں اپنی جاتی زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی

کیوں ترا راہ گذر یاد آیا
 ماننا ہوں وہ جگہ ہے اچھی ہیں وہاں عیش کے سامان سبھی
 کیا کروں گا جو طبیعت نہ لگی کیسا ہی رضوان سے لڑائی ہوگی
 گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

اب کہاں ضعف سے یالائے فغاں آہ کی تاب نہ تانوں کی توار
 جی نذر تا ہے جو ہلنی ہے زباں آہ وہ جسراتِ فریاد کہاں
 دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا

دل میں رہ رہ کے جو آتا ہے خیال کیا بلا دیکھئے لا تنبے خیال
 پھر مجھے غم میں پھنسا تا ہے خیال پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال
 دل گم گشتہ مگر یاد آیا

قدر مسکن کی ابھی جانی ہے یہی اس میں بھی پریشانی ہے
 یہ ہے بے مثل وہ لاشانی ہے کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
 دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

خاک ابھی میں نے کہاں چھانی ہے دل دھڑکتا ہے پریشانی ہے
 فرط ہیبت سے جگر پانی ہے کوئی ویرانی سی ویرانی ہے

۱۔ اسی مضمون کا ایک شعر تو میں نے بھی کہا ہے۔ جیس وحشت میں سوتے سحر اکبوں؟ کم ہیں ایسے گھر کی
 ویرانی۔ اسی طرح کا ایک شعر قابل مطالعہ ہے۔

یاد آیا مجھے گھر دیکھ دشت دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
 قاتل اس کا ہے ہر افساں شاید کہ بدی کی ہے مکافات بھی بد
 جرم ہوئے کو تھا مرزا سرزد میں نے مجنوں پر لڑکپن میں اسد
 سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

۲۴

آپ کے ساتھ کوئی دشمن بلے پر بھی تھا
 سست رفتار کوئی از رہ ترویر بھی تھا
 دیر کرنے میں کوئی مائل تیر بھی تھا
 ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا
 آپ آتے تھے مگر کوئی عنایاں بھی تھا

تم نے جو کام کیا غیر مشیت نہ کیا
 تھا مقدر جو مرے واسطے ہونا وہ ہوا
 دوں جو تنہا نہیں الزام تو کہہ رہی خطا
 تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلا
 اس میں کچھ شائبہ خوبی تقدیر بھی تھا

شاہد حال ہے ہر چند مرا حال زبوں
 سخت حیراں ہوں کہ کیوں کر تجھے آگاہ کروں
 کچھ خبر بھی ہے کہ میں عاشق دیرینہ ہوں
 تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں
 کبھی فراق میں تیرے کوئی بچیر بھی تھا

مجھ سے کہتا ہے کہ تو کون ہے کیا بتلا دوں
 عاشق زار ہوں کیا اسکے سوا بتلا دوں
 نہ رہا ہوں جو تجھے یاد تو آ بتلا دوں
 تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں

کبھی فراق میں تیرے کوئی فخر بھی تھا
 حد سے گندی ہوئی تھی چارہ گروں کی بیداد
 بھول کر بھی تو نہ لب پر کبھی لایا فریاد
 دل پریشانیوں میں بھی تو رہا خرم و شاد
 قید میں ہے تو ہے وحشی کو وہی زلف کی یا

ہاں کچھ اک رنج گرا نباری رنج بھی تھا
 محفل یار میں اللہ سے اس کا غنا
 حق تو یہ ہے کہ بڑے بول کا سہہ نیچ
 خوش ہوں اس سے کہ اثر کچھ تو ہوا بھول کا
 دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈ
 ناز کرتا تھا ولے طالب تاثیر بھی تھا

وصل شیریں سے وہ گوہر نہ سکا شیریں کا
 کر گیا کام تو ایسا کہ رہا نام صدا
 کہتے ہیں سنگ تراشی کو جو آپ ادنیٰ کام
 پیشے میں عیب نہیں رکھتے نہ فریاد کونا
 ہم ہی اشفہ سروں میں وہ جواں میو بھی تھا

سینہ زانو سے جو اس نے نہ دبایا نہ سہی
 خنجر تیز گلے پر نہ چلا یا نہ سہی
 ہاتھ شمشیر کا بڑھ کر نہ لگایا نہ سہی
 ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی
 آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

ہم پہ فائق جو سمجھتے تھے کبھی اپنا حق
 ان کو یہ خفیہ نویسی کا ملا کیسا
 ان کی تحریر کو کیوں مانے سرتا پاختی
 پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے نکھر پڑا
 آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

رکھتے تھے دیدہ دیدار طلب شوق بے تا
 پھر تو دیکھا تو مجھے دیدہ کا یارا ہی نہ تھا

ہلوہ دیکھا بھی مگر دل کا نہ ارماں نکلا ۔ بکلی اک کو نہ گئی آنکھوں کے آگے تو کیا

بات کرتے کہیں لب تشنہ تفریح بھی تھا

دی جو تشبیہ اسے ہر درخشاں سے کہی ۔ آگ غصے سے ہوا چہرے کی رنگت بدلی

اس کی تمثیل ہی گویا کوئی دنیا میں نہ تھی ۔ یوسف اس کو کہوں اور کچھ کہے خیر ہوئی

گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا

انکساری سے توجہ چاہو وہ کہلو غالب ۔ تم پہ دیکھا نہیں مڑانے کسی کو غالب

کوئی دعوے سے ذرا آگے کہے تو غالب ۔ ریتنے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب

کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

۲۵

دنیا میں کہی کیا کوئی دل برد ہوا تھا ۔ بدکیش و جفا پیشہ و کافر نہ ہوا تھا

سفاک مگر تیرے برابر نہ ہوا تھا ۔ تو دوست کسی کا بھی ستم گرد ہوا تھا

اور وہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا

قدرت جو ملے اور حسینوں کو بنا نے ۔ اس کا کوئی ہمتا ہونہ چاہا یہ خدا نے

پائی نہ تھی تکمیل ابھی نور و ضیائے ۔ چھوڑا مرغش کی طرح دستِ قضا نے

لے کر خشبِ اودھ مصنوعی پاند جس کو حکیم ابن عطا مشہور ابن مقفع نے ادویاتِ مرکب سے تیار کیا تھا وہ پاند چاہ

خشب سے نکلتا تھا اس کی روشنی زیادہ دو ٹوک جاتی تھی وہ اہل پاند کے برابر روش نہ تھا آخر کار کچھ عرصہ بعد شق

ہو گیا کارکنانِ قضا و قدر نے آفتاب بنا کر شروع کیا ابھی اس کی روشنی تیرے حس و جمال کے برابر نہ ہوئی تھی کہ اس کا حال بگا

ماہ خشب کی طرح ہوا ۱۳۔

خورشید ہنوز اس کے برابر ہوا تھا

۱ کم درمیں سے نہیں کچھ اشک ہمارے آنسو نہ ہوئے ہوتے تو گوہر ہی بنتے

ہے مادہ تو ایک ہی ایجادیں ان کے توفیق باندازہ ہمت ہے ازل سے

آنکھوں میں ہے وہ قطرہ گوہر نہ ہوا تھا

درو سے عیاں خیر خو خوار کا عالم مست آنکھ مگر فتنہ بیدار کا عالم

ہو جس سے پیا حشر وہ رفتار کا عالم جب تنگ کہ نہ دیکھا تھا قدر کا عالم

میں معترف فتنہ فشر نہ ہوا تھا

قسمت یہ کہاں تھی کہ کبیرہ سے دیکھوں آنکھوں سے طوں پاؤں خوشاں گئے لوں

برسوں سے تمنا تھی کروٹے تو مناؤں میں سادہ دل آزدگی یار سے خوش ہوں

یعنی سبق شوق مکرر نہ ہوا تھا

لکھنے میں فرشتوں نے سمندر کو کیا خشک اک لمحہ قلم کو کبھی ہوئے نہ دیا خشک

عامی ہوں میں ایسا کہ قدم رکھتے ہی خشک دریاہ معامی تنگ آبی سے ہوا خشک

میرا سردامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

کیا سوز نہاں پر کسی آتش کو ہوا تفصیل جو اس سے فائدہ تھے نہیں قابل تفصیل

۲ سینہ تقارر درہم و دینار کی زنجیل جاری تھی اسد داغ جگر سے مری تحصیل

۱۰ لے مرزا غائب صاحب ایک خط میں خواجہ غلام غوث تجر کو تحریر فرماتے ہیں: پروم رشداً خاصاً نہیں ہوا کرتے۔ یوں

سننا مجھے باور نہ آیا یہاں تک تو میں مورد عتاب نہیں ہو سکتا: اسی خط کے آغاز میں یہ شعر تحریر فرمایا ہے۔

میں سادہ دل آزدگی یار سے خوش ہوں یعنی سبق شوق مکرر نہ ہوا تھا

آتش کردہ جاگیر سمندر نہ ہوا تھا

۲۶

میں کب فدائے خجرت تل نہیں رہا کب تیغ نازیار کا بسمل نہیں ہوا
لیکن وہ ضبط اب مجھے حاصل نہیں رہا عوض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

دل میں بھرے ہیں لاکھ غم اس کے لیے ہوئے پوچھو نہ مرگدشت کرب میں جیسے ہوئے
آیا تھا میں بقا کا تہیتہ کئے ہوئے جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لئے ہوئے
ہوں شمع کشتہ درخور محفل نہیں رہا

دشمن تھے اس کے سامنے سپہز سپہر کہ میں پھرتے تھے ہاتھ پر وہ لئے اپنا سر کہ میں
اب غیر ہیں کہ جن سے پھر ہی بے نظر کہ میں مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کہ میں
شایان دست و بازوئے قابل نہیں رہا

یکساں گداز شاہ سے یاں ساز باز ہے محمود غزنوی کے برابر یا زہے
دل صاف ہے کسی سے نہیں احتراز ہے بر روئے شمش جہت در آئینہ باز ہے

سلا مزا قلاب مٹی نئی بنش حقیر کو کھٹنے ہیں انوس ہے گرم کو میرے حال کی خبر نہیں اگر دیکھو تو ماورج
حس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا۔ کوئی دم ایسا نہیں کہ تجھ کو دم واپس کا خیال نہ ہو۔ ساتھ برس کا ہو چکا
ہوں اب کہاں تک جیوں گا۔ غزل، رہائی، فار کا اردو دس ہزار بیت کہ چکا اب کہاں تک کہوں گا۔ زندگی بڑی
بھلی جس طرح بنی کاٹی اب فکر یہ ہے کہ دیکھئے موت کیسی ہوتی ہے اور بعد موت کیا پیش آتا ہے پھر کھٹے ہیں
سے عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ نہ مرنے پھر دیکھئے دیکھا نہیں کیا۔ ۱۲

یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا
جب سے کھلا ہوا ہے تصویریں باب حسن پیش نظر ہے آٹھ پہر آفتاب حسن
اٹھابے درمیان سے گویا جاب حسن وا کر دیئے ہیں شوق نے بند نقاب حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا
تھامیج و شام در پئے کس چرخ کج مدار تھام سے وقف درد و غلش سینہ تھامگار
دل تھانزار کاوش حریاں سے بے قرار گو میں رہا رہن ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے بے فائل نہیں رہا
خوننا بہ جگر سے سدا مثل باغباں ہم سینچتے رہے تین الفبت ہستاں
دیکھا مال کو تو تردد تھا رائیگاں دل سے ہوائے کشت و فضا گئی کواں
حاصل سوائے حسرت حاصل نہیں رہا
یہ تیغ آزمائے تو حاضر ہے سرا سدا کیسے بچے یہ تیرا اگر تو ہے سینہ سپر اسدا
مرزا ہوں کھیل جاؤں گا میں جان پر اسدا بیدا و عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

جس کو ہم سمجھتے تھے یا رہر ہاں اپنا ہو گیا وہی دشمن آہ ناگہاں اپنا
ہم نے اپنے ہاتھوں سے کر لیا زیاں اپنا ذکر اس پری و ش کا اور پھر بیاں اپنا

بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا

ان کو قہری ہو سنا کی مے کشی میں اتنی کب پیتے تھے جو میرے ساتھ کرتے تھے حفظِ تر لب
ضد ہی کچھ مر مغل ان کو چڑھ گئی بیڈھب مئے وہ کبوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یارب

آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا

حال اضطرابِ دل کچھ اسے دکھا سکتے نار کے ذریعہ سے دکھ اسے سنا سکتے
لطف اس کے جلوے کا دم بدم اٹھا سکتے منظر اک بلندی پر اور ہم بننا سکتے

عرش سے ادھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

بستر اسکے کوچے میں اک طرف جمالیں گے جو کڑی پڑے گی اب شوق سے اٹھالیں گے
اب تو اس سے ملنے کی راہ کچھ نکالیں گے دے وہ جس قدر ذلت ہم بندھی میں ٹالیں گے

بارے آشنا نکلا ان کا پاس ہاں اپنا

دل میں ہے کرٹنے کی خود ہی ان سے ٹھہراؤں سلسلہ کتابت کا درمیاں سے اٹھواؤں
نامہ بر سے کیا ہو گا خود ہی ان کو کھجاؤں درِ دل لکھوں کب تک جاؤں انکو دکھلاؤں

انگلیاں فکار اپنی خام خوں چکاں اپنا

ہو گیا ہوں جب عادی آستانے بھڑوں کا پھر بھی تو یہیں آخر ہوں گامیں جہیں فرسا
پلے بپے جرات اور دن بھر میں یہاں کرتا گھستے گھستے مٹ جاتا اپنے عبت بدلا

ننگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستاں اپنا

لاکھ اس کی محفل میں غیر کی رسائی ہو اب کسی برائی میں لبِ ذرا ہلائے تو

اس کے منہ سے کھلایا ہم کو کہنا تھا جو جو تاکے دغا بازی کر یا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہم نے ہزیاں اپنا
روز کے شانے سے کر دیا ہے تنگ اسے جسے اب تو اسے مرزا بڑھکے ستم اس کے
کہتے ہیں عداوت ہے اسکو ہر زور سے ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بلے سبب ہو غالب دشمن آسمان اپنا

۲۸

ظلم پر وہ عذر و جھٹ لائیں کیا غیر تاویل غلط فرمائیں کیا
چھوڑ کر ایذا دہی شرمائیں کیا جوڑے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھائیں کیا
جو مقدر ہے وہ ہو گا بے گناں پھر ہوں کیوں مصروف سعی رائیگاں
ہیں امیدیں بھی جو قائم ہے جہاں رات دن گردش میں ہیں سات آسمان
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرا ئیں کیا

۱۔ مرزا غالب ایک خط میں قائم علی تہر کو یور تقریر فرماتے ہیں میں نے کتابیں چلا کر بیچیں پسبیل پارسل ارسال
کیں اگرچہ پہنچنے کی خبر باقی ہے مگر قریب کیس سے نہیں آئی حالات دن گردش آگیا۔ دیکھا جانی اس غول کا مطلع
کیا ہے۔ جوڑے باز آئے پر باز آئیں کیا کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھائیں کیا۔ ۲
۳۔ مرزا غالب نے ایک خط نامہ مرزا ترم بیگ مصنف ساطع برہان لکھا ہے جس سے مرزا صاحب کی دماغی صلاحیت
طبیعت اور تحقیق کا پورا اظہار ہوتا ہے لکھتے ہیں کہ چکا ہوں کہ نہ تم کو مناظرے کا دماغ نہ نجوم امراض جسمانی و آلاء
روحانی سے فراغ، اگرچہ جو بہت نہیں ہاری تھی اور غیب توقع مدد گاری تھی لہذا اپنا بیچارہ دل سے درد زبان اور پاس
(دماغی صدمہ)

کوئی بتلاؤ کہ ہم بت لائیں کیا

۲۹

شرط ہے اس کا ذرا جلوہ نما ہو جانا پھر تو آساں ہے مجھے مٹو لقا ہو جانا

راحتِ جزو نہیں کل سے جدا ہو جانا عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

یا تو تھا مجھ سے محبت میں کبھی عہد ابد اب ہے کس تفرقہ انداز کے باعثِ دو کہ

ہو گیا ایک ہی جنگی میں محبت کا رد تجھ سے قسمت میں مری صورتِ فعل، ابجد

تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

ہوتی تھی اس کے لئے فکر ہی صبح و شام نہ ہوئی واشدگی اور نہ ہوا کچھ آرام

بسکہ دریاں مخالف سے فنا تھا انجام دل ہوا کش مکش چارہ زہمت میں تمام

مٹ گیا گھسنے میں اس عقد کا واپس جانا

جب تک ہم سے تعلق تھا اور اک طرح کی راہ چھڑاٹھا یاد کے اور ظلم کے خواطر خواہ

دفعۃً پھر گئے کیوں آپ بتائیں تو گناہ اس جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ

اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا

خون اک آتش سیال مرے دلیں تھا پانی ہو کر دم گریہ جو مژہ پر آیا

خاک بھی تن میں بجز عنصرِ خاکی نہ رہا نصف سے گریہ تبدیل بد دم سرزد ہوا

باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

جلوہ گران میں تصور سے تیری مثال مردم چشم کا آنکھوں سے نکلنا ہے محال
جی میں جو بات کھپتی دیکھے کس طرح نکال دل سے سناتری انگشت خانی کا محال

ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

اپنی ہستی کو سر بزم جو کرتی ہے فنا شمع نے مجھ سے دم گر یہ یہ گھلتا سیکھا
بیچ کن ہے مرا گر یہ ہی مری ہستی کا ہے مجھے ابر بہاری کا برس کر کھلتا
روستہ دوتے غم وقت میں فنا ہو جانا

سبزہ رکھتا ہے ترے پاؤں کے بوسے کی ہوس گل کو بازار میں لائی ترے جلوے کی ہوس
تجھ تلک کس کو نہیں اٹکے پہنچنے کی ہوس گر نہیں نگہت گل کو ترے کو بچے کی ہوس

کیوں ہے گردِ درو جو لانا مہیا ہو جانا

جن کو رہتی ہے صفائی کی تمنا ہر پل خواہش تصفیہ قلب میں وہ ہیں بیکل
کر کے پہتا ہے ہر رنگ میں شوقِ پناہ ل تاکہ تجھ پر کھلے اعجاز ہوائے صیقل

دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا

قابل دید ہے ہر ذرہ یہاں کا غالب کیوں نہ پھر کھجے نظارہ دنیا غالب
متفق تم سے ہے اس قول میں مرزا غالب بخش ہے جلوہ گل ذوق تماشا غالب

چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

پھر گلوں کا باغ میں منظر کھلا بہن سبز اور اراق کا دفتر کھلا
یہ بہار اور ظلم یہ مجھ پر کھلا کچ میں بیٹھا، ہوں، یوں پر کھلا
کا شے ہوتا قفس کا در کھلا

ہم ہیں اس دھن میں کہ وہ خود ہی بلائے کون جا کر بے طلب خفت اٹھائے
جائیں جاتے ہیں اگر اپنے پر اے ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

ان کو ہے دشمن کی یاری پر گھمنڈ دوستی پر جانثاری پر گھمنڈ
اس کو اپنی ہوشیاری پر گھمنڈ ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ
دوست کچے راز دشمن پر کھلا

داغ کھا کر دل ہوا تھا باغ باغ تھا معطر اس گل تر سے داغ
یہ اندھیرے گھر کا تھا روشن چراغ واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ
زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

باز آیا ظلم سے کب وہ جواں تاز سے اس کے ہے بسمل اک جہاں
پھینک دی شرکاں نے کب اپنی ستاں ہاتھ سے رکھ دی کب ابرو نے کہاں
کب کمر سے غمزے کی خنجر کھلا

وودی جب پہر تاج ہے یہ گمراہ سا پھر کسی کا خاک ہو گا رہنما
یہ ساقی ہے تو حرج کیا مفت کا کس کو برا ہے بدرقمہ

رہرودی میں پردہ رہبر کھلا

کب تک برسا کرے بارانِ اشک چارہ کس کس کا کرے بارانِ اشک
کیا جگر ٹھنڈا کرے بارانِ اشک سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک

آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا

ہو گیا جامِ مسرت جامِ مرگ حور کا بازو بنی مصمصِ مرگ
نکلے صبحِ زندگانی شامِ مرگ نامہ کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ

رہ گیا خطِ میری چھاتی پر کھلا

اس سے بڑھ کر زند کیا ہو گا کوئی ہو نہیں سکتا کبھی ایسا کوئی
اس کو کیا چھوٹے گا اے مرزا کوئی دیکھو غائب سے گرا لجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

ردیف (ب)

ہے مرے واسطے سامانِ بقا موجِ شراب اس سے جیتا ہوں کہے روحِ فزا موجِ شراب
لے حاشہ حشر

ایک مدت سے نہ تھی جلوہ نما موجِ شراب پھر ہوا وقت کہ ہو بالکشا موجِ شراب
دے بطے کوئل دوستِ شاموچِ شراب

بزمِ رندانِ قدحِ خوار بنابے گلشن بادہ نوشوں کی طرح جھوٹے ہیں سرو و سن
نیچو دوست ہیں مرغابِ گلستانِ ہر تن پوچھ مت وجہ سیہ مستی اربابِ چمن
سایہ تک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

بے حسے مل گئی شاہانہ دلخ اس کا ہے تخت شاہی کی پھر اس مست کو پڑا کیا ہے
کون ہو اس کا شنوار یہ عجب دریائے جو ہوا غرق ہے بخت رسار کھتا ہے
سرے گزے پر بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب

خشک اشجار کو بھی اس نے کیا بار آور دور کیا ہے کہ لگیں سرو چرغاں میں ثمر
ہوتی ہے اس کی ہوا بھی عجب اعجاز اثر ہے یہ برسات وہ مہم کہ عجب کیا ہو اگر
موجِ ہستی کو کرے فیض ہوا موجِ شراب

بقضہ - مراعات ہے اپنے ولی ہونے کے مطلق اپنی ایک غزل کے مطلع میں بھی کہا ہے -

یہ مسائل تصوف تیرا بیان غالب تجھے ہم ولی بکھتے جو نہ خوار ہوتا

دیکھنے والوں پر کیا شوخیاد انداز اختیار کیا ہے اور میں غالب صاحب کسی ولی سے کم نہ
تھے جس کا پتہ ان کے اشعار کے الہامی کیفیت سے چلتا ہے - ۱۲

۱۵ ایران میں قاعدہ ہے کہ جبہ انور یک جلتہ ہی تو سنگِ درم کے حوضوں میں بھر دیے جاتے ہیں، آفتاب کی تیزی
سے دو چار دن بعد ان کا عرق نکلتا شروع ہوتا ہے اس وقت دھڑلے کے ان حوضوں میں ان کے انور کو پاؤں سے
رہندے ہیں اس کے بعد ان کی ہند مزہ میاں حوضوں میں ڈال دی جاتی ہیں انہی مراحموں کو بطے کہتے ہیں - ۱۲

موسم گل ۽ گلستاں میں کیا کیا جادو پھولے پڑتے ہیں مسرت سے گلخنداں رو
 موج میں پھرتی ہے مستانہ گلوں کی خوشبو چار موج اٹھتی ہیں طوفانِ ہوا سے ہر سو
 موجِ گل موجِ شفقِ موجِ صبا موجِ شراب

مے کدے میں جو شبِ روز میں سرگرم نیاز ان سے پوچھے کوئی شادابی گلزار کا راز
 ہے یہ ہاراں کی کرامت نہ ہوا کا اعجاز جس قدر روح بناتی ہے بجز نشہ ناز

دسے تسکین بدِ آبِ بقا موجِ شراب
 اپنی حرمت میں یہ نکلی گل تر سے برتر رنگ پر اس کے فدا دل پر تو صدقے ہو جگر
 قوتِ نامیدہ نام اس کا نہ ہو اس کا اثر بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر
 شہرِ رنگ سے ہے ہالکشا موجِ شراب

جامِ جمشید کا ہمسرہ مرا جامِ سفال سامنے ہیں مری نظروں کے جہاں کے احوال
 کیوں نہ چل ہومری فکرِ درخشاں کو کمال موجِ گل سے چراغاں ہے گزر گاہِ خیال
 ہے تصویر میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

آنکھ مٹاتی ہے چڑھتی ہے بالائے دماغ موجِ زن دلیں ہے ہر وقت تنائے دماغ
 ہے جو مرغوب اسے منزلِ زیا ہے دماغ نشر کے پردے میں ہے خود تماشائے دماغ
 بسکہ رکھتی ہے بر نشو و نما موجِ شراب

ہے عجب عالمِ نورانی کیفیت فصل کیفیت کوئی نہیں ثانی کیفیت فصل
 کیونے کیوں نہ شاخوانی کیفیت فصل ایک عالم پر ہے طوفانی کیفیت فصل

موجِ بہرہ نونیز سے تاجِ شراب

جس کو اس بزم میں ساقی نے دیا ساغرِ دل اس کے سر میں نہرا وہم و خیالِ جزو کل
شارحِ فصلِ گلستاں ہے نوائے بلبل شرحِ ہنگامہ ہستی ہے رہے موسمِ گل

رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے خوشاموجِ شراب

شوقِ بادہِ دلِ مرزا میں بھرا پھر بند بعد تو بہ کے کہیں پھر نہ خطا ہو سرزد
فصلِ گلِ جوش پہ ہے ابر کی بھی بوند ہوش اڑتے ہیں مے جلوہ گل دیکھ اسد
پھر ہوا وقت کہ ہو بالکشا موجِ شراب

ردیف (ت)

۳۲

خارزارا تو ہوا ہے گلشنِ بے خارِ دوست ہے نمونے بہرہ سے صرف خزاں گلزارِ دوست

چھپ گئی ہے تیرگی میں تابشِ انوارِ دوست آمد خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست
دو در شمع کشتہ ہے شاید خطِ خسارِ دوست

آنکھ اٹھائے اس کے نظارہ کو ہر کسا جگر کیا لڑا سکتا ہے کوئی برقِ تاباں نظر
لن ترانی اس کو زیاہے کمالِ حسن پر اسے دلِ ناعاقبت اندیش غبطِ شوق کر
کون لا سکتا ہے تابِ جلوہ دیدارِ دوست

لے ماخیرہ مہر

سانے ہو کر مس گزرا کچھ اس انداز سے ہر قدم پر پائمالی کے مزے میں لگنے
 کر دیا سرتا پاک ویدہ حیران مجھے خانہ ویران، سازی حیرت تماشا کیجئے
 صورت نقش قدم ہوں زخم زخماں دوست

غیر کے ساتھ ان کو دیکھوں کہاں یا راجھے پوچھئے آئے تو دکھلایا یہ نظار ارجھے
 کچھ نظر آیا نہ مرنے کے سوا چار ارجھے عشق میں بیدار شک غیر نے مارا مجھے
 کشتہ دشمن ہوں مفر گر چہ تھا بیمار دوست

ہو اگر ہر آن ہم پر اک نئی افتاد ہے اپنا لب کب آشنائے شکوہ بیدار ہے
 خوش ہے وہ زاری سے اولذت کش فریاد ہے چشم مارو شن کہ اس بیدار کا دل شاد ہے
 دیدہ پر خوں ہمارا ساغر نثار دوست

قطع

۱۰۵۶



یہ رفاقت کی جو ٹھہرائی ہے اس نے بحر میں جا ہتا کر دیے دھوکا بعید کچھ لے بحر میں
 اس پہلے سے غم وایز ارجھے دے بحر میں غیروں کو تباہ کشتش مجھ سے اس کے بحر میں
 ہنر کلف دوست مجھ سے کوئی نخواستہ دوست

اوحایہ ہے کہ ہیں تابع مرے جن و ملک نہر و مہر و پری و آدمی ارض و فلک

حاشیہ صفحہ ۱۰۵۶۔ مازعہ میں میرے احباب محبوب کو اس وقت میرے پاس لائے جب میں ان کے انتظار میں بار بار اٹھتا ہوں
 کھولنے کا کوشش کرتا تھا مگر ایسا انتظار میں میری آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں اور میں اسے دیکھ بھی نہ سکا حیرت
 کی انتہا ہے اس مضمون کا ایک شعر حضرت غالب صاحب نے ادا بھی کیا ہے
 منہ نہیں کھولتے کا کھولتے آنکھیں ہے ہے خوب وقت آئے تم اس ماثقی میرا کیے پاسی ۲

یوں بیاں کرتا ہے اس مغل کی باتیں حیرت
تا کہ میں جانوں کہ ہے اسکی رسائی واں تلک

مجھ کو دیتا ہے پیام وعدہ دیدار دوست

میرے ہر اک درد کا ظالم لگا تا ہے سراغ
اور یہ کہتا ہے کہ اب حاصل ہوا اس سے فراغ

کیا بتاؤں مجھ کو دکھلاتا ہے کیا کیا ہرز باغ
جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوہ ضعف دماغ

مگر کہے ہو وہ حدیث لطف غنیمت یار دوست

باتوں باتوں میں لگا دیتا ہے دل میں نیتنر
یاد دلواتا ہے باتیں یار کی آنکھوں پہر

ہے تسلی و دلاسا سے جفا مد نظر
چکے چکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر

ہنس کے کرتا ہے بیان شوخی گفتار دوست

دشمن اس کا مرسلہ آیا ستانے کے لئے
دوست بن کر ظلم اس انداز سے اسنے کئے

ہوں تخریب کہ دونوں میں کہ دکھ کس دئے
مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجئے

یا بیاں کیجئے سپاس لذت آزار دوست

بات جو ہوتی ہر اچھی دلیس کھپ جاتی ہر آپ
کھینچ کر سامع کا دل اپنی طرف لاتی ہر آپ

طبع مرزا دمدم یہ کہکراتر آتی ہے آپ
یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ

ہر دلیف شعری فالتی بس تکرار دوست

ردیف (دو)

(۳۳)

ناز کا لطف حسینوں سے گیا میرے بعد دلربا عشوہ دل کش نہ رہا میرے بعد
وہ کرشمہ نہ رہا ہو شرابا میرے بعد حسن غمزے کی کشاکش سے چٹھامیے بعد

بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

شیوہ غنچ و دلال آج جہاں سے اٹھا کام سے اپنے ہوا ناز معطل گویا
اب کہاں ہو کوئی دل ان سے جو ہو عہد برا منصب شفتگی کے کوئی قابل نہ رہا

ہوئی معزولی انداز وادامیرے بعد

اب کہاں ہے کوئی سر باز بیسرمجھ سا تیر جس کے لئے کی جائے گی شمشیر قضا
اب تو بیکار ہے خود جو ہر ذاتی اس کا درخو رخص نہیں جو ہر بیدا کو جا

نگہ ناز ہے سرمہ سے خفا میرے بعد

یا کبھی ان کی پھر انگشت ابھیں تر تھی یا نظر آتی تھی پوروں پر خنکی سرخی
میرے مرتے ہی صدا فسوس یہ نوبت پہنچی خوں ہے دل خاک میں احوال بتاں پڑتی

ان کے ناخن ہوئے محتاج حایمے بعد

آج دنیا سے اٹھی درمت گریباں کی نزار اب کبھی ایک جگہ ان کا نہ ہوگا اجراع

رہنِ عشق سے محفوظ ہوئی دیکھی متاع ہے جنوں اہل جنوں کیلئے اغوش و دراع

چاک ہوتا ہے گریہاں سے جدا کیسے بعد

مے کرے بند ہوئے سرد ہوا گلخنِ عشق کون ایسا ہے کہ آباد کرے گلخنِ عشق

ہے کوئی اب کہ ہوا سوارِ سر تو سنِ عشق کون ہوتا ہے حریفِ مے مردِ فگنِ عشق

ہے مگر رب ساقی پہ صلا میرے بعد

بزمِ الفت ہے دھواںِ حار تو حیرت کیا ہے کیا تعجب ہے جو اندھیر بہاں چھایا ہے

مجھ سا پروانہ جاں سوز کہاں پیدا ہے شمعِ جمعیتی تو اس میں سے دھواںِ اشتہا ہے

شعلہٴ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

مذہبِ روئگی سر پیٹ کے حسرتِ میری کوئی بھی بات نہ پوچھے گاتمناؤں کی

بے کسی ہوگی پس مرگ لے کر چھائی غم سے قربا ہوں کہ اتنا نہیں نیاسیں کوئی

کہ کرے تعزیتِ جہر و وفا میرے بعد

چھوٹ کر مجھ سے ہوا ایکس و تنہا غالب ایسا وارفتہ کہاں اس کو ملے گا غالب

ہاتھ ملتا ہے جو افسوس سے مرزا غالب آئے بے کسی عشق پر رونا غالب

کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلائیے بعد

۱۔ حوا گلنِ عشق۔ مراد کو بچھاڑ دینے والی عشق کی شراب

میرے مراد کے بعد ساقی پکا پکا کر کہہ رہا ہے کہ اب کوئی ہے جو مے مردِ فگنِ عشق کا حریف ہو یعنی عشق کی شراب کا

جام ہے۔ لیکن جب کوئی آواز نہیں آتی تو پھر چپکے سے یلوس ہو کر کہتا ہے کہ حریفِ مے مردِ فگنِ عشق کون ہو سکتا ہے

یعنی کوئی بھی نہیں ہو سکتا۔ اس شعر میں نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرعہ بھی ساقی کی صلا

(دیکھی ص ۴۵ پر)

رولیف (ر)

۳۳

ہوئے ہیں سدرہ شوق در در دیوار د اس کو روک سکیں گے مگر در دیوار
کریں گے اور اسے تیز تر در دیوار بلا سے ہیں جو یہ پیش نظر در دیوار

نگاہ شوق کو ہیں بال و پیر در دیوار

شب فراق میں رونے کی آگئی جو امنگ تو پل کی پل میں ہوا کچھ عجیب گھر کا ڈھنگ
ادھر ہے خشت کا انہار اُدھر ہو تودہ سنگ و فور اشک نے کا شاد کا کیا یہ رنگ

کہ ہو گئے مرے دیوار و در در دیوار

خبر ہے کہ سر شام آئے گا وہ نگار تو سایہ حد سے بڑھتا کہ ہو قدم پہ نثار
چلا ہی جلتا ہے بڑھتا ہوا نہیں ہے قرار نہیں ہے سایہ کہ سنکر نوید مقدم یار

گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

چڑھا دماغ میں کچھ نشہ شباب ایسا کہ گرم کر دیا بازار خود نمائی کا

بقیہ ۱۱۵ء - کے الفاظ ہیں۔ اس مصرع کو گھر پر رہا ہے ایک دفعہ بلانے کے بعد میں پڑھا ہے۔ کون ہوتا ہے عزت
سے مردانگ عشق، یعنی کوئی ہے جو ہے مردانگ عشق کا حریف ہو، پھر جب کوئی آواز پر نہیں آتا تو اسی مصرع
کو مایوسی کے بعد میں گھر پر پڑھتا ہے۔ کون ہوتا ہے حریف..... یعنی کوئی نہیں ہوتا۔ اس میں لہجہ
اور طرزِ ادا کو بہت دخل ہے کہ کو بلانے کا لہجہ اور یہ اور مایوسی سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز ہے اس طرح مصرع
مذکورہ کی تکرار کرنے سے یہ معنی فوراً ذہن نشین ہو جائیں گے۔

کسی سے اب تجھے مطلق حجاب بھی نہ ہا ہوئی ہے اس قدر ارزانی سے جلوہ
کرمست ہے تھے کوچے میں ہر در و دیوار

سدا جو جانب دیوار و در رہا نکلتا ہوا ہے آئینہ ہر سنگ و خشت حیرت کا
کئے ہیں کام مری چشم شوق نے کیا کیا جو ہے تجھے سر سودائے انتظار تو آ
کہ ہیں دکان متاعِ نظر در و دیوار

رہی ہمیشہ جو گردش ہی سایہ کو گھر کے یہ شوق تھا کہ بلائیں یہ اس کے گھر کی لے
نصیب خفتہ مرے غم کدہ کے جاگ اٹھے وہ آ رہا مرے ہمسایہ میں تو سایہ سے

ہوئے فل در و دیوار پر در و دیوار

یہ آرزو ہے کہ اپنوں سے پائیں آزادی یہ رونق ان کی نہیں ہم کو وہ نشادی
چہل پہل سے پریشان ہیں ل سے فریادی نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی

ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار

ہمیشہ ضبط ہی گر یہ کو کر لیا میں نے اُنڈ کے اشک جو اے انھیں پیامیں نے
یہ عجز دیکھ کے گھر کو بچا دیا میں نے نجومِ گرہ کا سامان کب کیا میں نے

کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار

ہر ایک جزو ہے گھر کا سرور سے بیتاب ہر ایک ذرہ نظر آ رہا ہے مست و خراب
ہمارے اشک لگے گویا اٹھائے ہیں حجاب نہ پوچھ بے خودی عیشِ مقدم سیلاب

کہ نہ چتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

نہ کوئی دوست ہے مزار کہیں رٹانے میں نہ راز داں ہے نہ ہے ہمیشیں رٹانے میں
 بھرے ہوئے ہیں بہت اہل کیں رٹانے میں نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانے میں
 حریف رازِ محبت مگر در و دیوار

۳۵

پایا نہ میرے گھر کو ستم گر کہے بغیر ڈھونڈا ہے گھر رقیب کا کیونکر کہے بغیر
 سمجھا مرا پستہ نہ مکر رہے بغیر گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
 جالے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

جب تک وہ دیکھتے تھے کہے قدرت سخن اک روز بھی تو مجھ کو نہ دی رخصت سخن
 چھوڑا کبھی تو بولے نہیں فرصت سخن کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقت سخن
 جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

حراما نصیب کون ہے ہمساجان میں نکلا نہ کوئی کام ہمسارا جہان میں
 کس طرح دیکھے ہو گزرا جہان میں کام اس سے آپڑا ہے کہ جس کا جہان میں
 یوں نہ کوئی نام ستم گر کہے بغیر

کیا کیا تمہارے ہاتھ سے ہوتے نہیں ستم کیا کیا ہمیں پہنچتے نہیں تم سوز و غم
 لیکن جو سودرا بھی شکایت تو لو قسم جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے و گرنہ ہم
 سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

ابرو کو اس کی کہتے ہیں شمشیر خوش نیام تیرا جل ہے اس نگہ جاں ستاں کا نام
ہوتا ہے ہر اداسکے بیاں میں اک انتظام مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگوں کا کام
چلتا نہیں ہے دشمنہ و خنجر کہے بغیر

بہتر سمجھتا ہے کوئی پتھر کو پوجنا مذہب کسی کا مہر منور کو پوجنا
ایمان عاشقوں کا ہے دلبر کو پوجنا جھوڑوں کا میں نہ اس بتِ کافر کو پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

ہوتا نہ کس طرح سے فدائے خم و سبو دکھلا رہا تھا عالم مستی مقام ہو
پیش نظر خدا ہو جو ساقی ہو روبرو ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے شبشہ و ساغر کہے بغیر

رکھنا ہوں پاس اسلئے کا فہم دوا تحریر سے ہوتا بسہولت ہر ایک بات
ممکن ہے کون دن کہے سمجھوں یلکا کورت بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہوا التفات
سننا نہیں ہوں بات مکر کہے بغیر

مرزا نے کچھ کیا جو کبھی حالِ زار عرض انجام یہ ہوا کہ ہوئی ناگوار عرض
یوں ہی نہ ہو کہیں دلِ نازکِ بار عرض غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر

اس بام پر تجسلی انوار دیکھ کر حیراں ہوں اپنے آپ کو ہشیار دیکھ کر
 جمپکی نہ آنکھ برقی شرر بار دیکھ کر کیوں جل گیا نہ تاب رنج یار دیکھ کر
 جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر

رکھتی ہے رات دن پیشِ دل تپاں مجھے تاب سکوں ہے برقی کی صورت کہاں مجھے
 کرنا نہ آیا سوزِ محبت نہاں مجھے آتشِ پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے
 سرگرم نالہاں شرر بار دیکھ کر

ظلم و ستم کا وقت ہے کوئی نہ جو رکا اک کعبیل ہو گیا کہ جب اٹھے ستالیا
 دل اب تو نام سے ہے محبت کے کانپنا کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
 دکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

نوبت نہ آئی تھی کہ گلے پر مرے چلے چلنے سے اس کے پہلے ہی مرنا پڑا مجھے
 یہ اور بوسے لے مرے قاتل کے ہاتھ سے آتے میرے قتل کو پر جوش رشک سے
 مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

مستی نے تیری کھو دیا صبر و سکونِ خلق ہے لغزشِ خرام سے زخمی دروِ غلطی

۱۔ آتشِ پرست۔ پارسی لوگ آگ کو مظہرِ خدا سمجھ کر پرستش کرتے ہیں۔ ان کی عبادت گاہوں میں ہر وقت
 آگ روشن رہتی ہے۔ فرماتے ہیں محبوب کی جہانی میں جویں آہ و بکا کرتا ہوں اور میرے منہ سے آگ برساے
 والے نکلے ہیں تو ان کو دیکھ کر لوگ مجھے آتشِ پرست کہتے ہیں۔ ۲

شیشہ ہوا ہے باعثِ حالِ زبونِ خلق ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پر خونِ خلق
لڑے ہے موج نے تری رفتار دیکھ کر

پڑتا ہے دمِ دم میں سر پہ عالم سے ہاتھ مصروفِ سینہ کو بی ہے ہر وقت غم سے ہاتھ
قسمت کہاں وہ ہنس کے ملنا کر مہاتھ وحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
مجھ کو حریص لذتِ آزار دیکھ کر

مضمون ہمارے تلے ہیں لعلِ بین کیساتھ نسبت ہے حرفِ حرف کو درِ عدن کیساتھ
لیتا ہے اس کو کوئی اگر قدرِ فن کے ساتھ بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کیساتھ
لیکن عیارِ طبع خریدار دیکھ کر

چلنے سے پیشتر تجھے لازم ہو دیکھ بھال رستے کی اونچ نیچ سے چلنا نہ ہوا بال

لے متاعِ سخنِ ظلام کی دولت، ہمیشہ متاعِ سخن کے خریدار کے ہاتھ بک جاتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ وہ سخن اہم اور
سخنِ شاس ہو۔ غالبی سلسلے میں منشی ہر گویا لفظ کو ایک فارسی خط میں منشی نبی بخش حقیر کی سخن فہمی کے معنی بکھنے
ہیں، یہ خط کتنا حسرت آمیز خدائے میری یکسی اور نہائی پر رحم کیا اور ایک شخص کو میرے پاس بھیجا جو میرے
رفقوں کا درہم اور میرے درد کا درماں اپنے ساتھ لایا جس نے میری اندھیری راتوں کو روشن کر دیا۔ اس نے اپنی
باتوں سے ایسی شمع روشن کی جسکی روشنی میں میں نے اپنے کلام کی خوبی و برتری و خوبی کے اندھیرے میں خود میری
نگاہ سے غفلت تھی دیکھی میں حیران ہوں کہ اس فرزندِ یگانہ منسی نبی بخش کو کس درجہ سخن فہمی اور سخنِ سنجی عنایہ
ہوئی ہے، حالانکہ شعر میں کہتا ہوں اور شعر کہا بھی جانتا ہوں مگر جب تک میں نے اس بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں
سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے اور سخن فہمی کس کو کہتے ہیں؟ مشہور ہے کہ خدائے حسن کے دو حصے کے آدھا یوسف
کو دیا اور آدھا بنی نوع انسان کو۔ کچھ تعجب نہیں کہ ہم سخن و ذوقِ معنی کے بھی دو حصے کے گئے ہیں۔ آدھا منشی
نبی بخش کے اور آدھا تمام دنیا کے صحیح میں آیا ہو۔ جو زمانہ اور آسمان میرے گہا ہی مخالف ہو مگر میں اس شخص کی
بدولت رہنے کی دشمنی سے بے فکر رہوں اور اس نعمت و نیا پد کا نفع و (از یادگارِ غالب)

پُرسنگ راہ میں بھی ہے غافل سفرِ مال ز ناز باندہ سببِ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

دن رات خاک دشت کی یا چھانتا تھا میں یا کچھ دنوں سے نقشِ قدم بن رہا تھا میں
مثلِ شکستہ پا سرِ وادی پڑا تھا میں ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

اس درجہ بدظنی ہے خدا جانے کیوں اسے ہر دم یہ وہم ہے کہ محبت ہے اور سے
کہتا ہر ہنس کے مجھ کو ہری چگ اسی لئے کیا بدگمان ہے مجھ سے کہ آئینہ میں مرے
طولی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

ہیبتِ بھٹائی ہوتی طلبِ نور پر خاکِ سیدہ پہاڑ ہوا کس قصور پر
یہ گرمیاں یہ غیظ اور اک بے شعور پر رگرنی غمی ہم پر برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہِ ظریفِ قرحِ خوار دیکھ کر

دیکھا جو آستانہ تو آنکھوں میں پھر گیا مرنا کا صبح و شام وہ سجدوں کا مشغلا
دھتے جو پھر لہو کے نظر آئے جا بجا سر پہوڑنا وہ غالبِ آشفۃ مال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

یہ مگر غمی پر ناحق میری بربادی کے سلاں ہے فصولِ اتنا ترسنا ہے اس گرمیاں ترساں پر

غلطی کی یہ کیوں مجھ کے حال پریشاں پر
لڑتا ہے مہر اول زحمت مہر درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرہ شہم کہ ہوں خرابیاں پر

ہوئی گوشتی کے ہاتھوں زلزلے بھر میں رسوائی
ہوا بے ساز و سامانی پہ بھی سامانِ زیبائی
سیہانہ میں جب آئے کہ بھگتیں قید تنہائی
نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی

سفیدی دیدہ یعقوب کی پھرتی ہونداں پر

جنوں مانع ہوا استاد کا احساں ٹھانے سے
فرغت پا چکا روز ازل ٹپھنے پڑھا لے سے
رہا انکار عقل کل کو غیر لانا سے
فنا تعلیم درس بے خودی ہوں اس زلزلے سے

کہ جنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دستان

جگر میں غلش سرگز نہ رہتی نشتر غم سے
یہ ایذا میں ہوتی جو بیاباں جبر کے دم سے
کوئی دم جان کو بہت تو ہوتی درجیم سے
فرغت کس قدر رستی مجھے تشویش مریم سے

بہم گم صلیح کرتے پارہ ہائے دل نمکلاں پر

ہر بے نقشہ عالم سے سن آباد کا نقشا
وہاں بیٹھا ہر سکر روز اول سے رشتے کا

حضرت یعقوب حسبِ یوسف سے نہایت محبت رکھتے تھے۔ اسلئے ان کے دو بڑے بھائی ان سے بہت جلتے ایک
ن سب جاتی ان کو شکار کے ہانے جنگل میں لے گئے۔ اور ان کو ایک کنوئیں میں ڈھکیل دیا۔ گھر آکر اپنے ماپ سے
لہدیا کہ یوسف کو بھڑایا اٹھالے گیا۔ حضرت یعقوب بہت رنجیدہ ہوئے اور یوسف کی یاد میں روتے روتے اندھے
ہو گئے۔ ادھر یوسف کو ایک قافلے کے لوگوں نے کنوئیں سے نکال کر عزیز مصر کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ عزیز مصر
لہ بیوی رہی حضرت یوسف کے حس و جل پر عاشق ہو گئی تھیں مگر حضرت یوسف نے انکی کوئی بات نہیں مانی۔ آخر کا
یوں ہو کر اور ان بڑا لازم لگا کر کو زندان میں ڈال دیا۔ اس تعزیر میں واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ قید میں بھی حضرت
یوسف نے خانہ آرائی۔ چھوڑی حضرت یعقوب کی آنکھوں کی سفیدی زندان کی دیواروں پر پھر پھر کر اسے آراستہ
اری تھی یعنی جس کسی حالت میں بھی اپنی آرائش نہیں چھوڑتا۔

نالوں کے دھوئیں کجے شب تار میں نقشا انجم میں ہے آہ شرر افشاں کا تماشا
 ہے شعلہ الفت سے زمانے میں اجالا لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا
 ہر روز دکھاتا ہوں میں اکٹا غ نہاں اور

دل باختہ کو کب ہے ترے سر کی قسم چین پاتا ہے کہاں بستہ زنجیر الم حسین
 دیتے ہیں کہاں جھکوشب وز کے غم چین لیتا نہ اگر دل تمھیں دیتا کوئی دم چین
 کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

تھے نہیں رستہ جو ذرا پاتے ہیں نالے بہتے ہوئے اشکوں کے چلے آتے ہیں نالے
 وہ جوش ہے دریا کو بھی ٹھرتا ہے نالے ہاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
 رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

پہلے اشعار کہتے تھے جو ہر بہت اچھے تھے سیکڑوں ایک لیک سے بہتر بہت اچھے
 مرزا کے بھی اشعار ہیں اکثر بہت اچھے ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
 کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

۱۵ مرزا غالب نے اس شعر کی سرخ تینوں کو بدل رکھی ہے "لیتا نہ اگر دل" یہ بہت لطیف تقویر ہے لیتا کو
 رابطہ چین سے کرنا مراد ہے آہ و فغاں سے غم میں اعتقاد معنوی اور لفظی دونوں مبعوس ہیں فارسی
 میں اعتقاد معنوی عیب اور تقدیر لفظی جائز بلکہ فصیح اور علیحدہ تقدیر ہے فارسی کے حاصل معنی مصرعین ہر اگر
 دل تمھیں نہ دیتا تو کوئی دم چین لیتا اگر نہ مرزا تو کوئی دن اور آہ و فغاں کرتا ہے

نیز پوری غزل (اس شعر کو تھوڑا کر) مرزا غالب نے عالم علی قہر کو ارسال فرمائی تھی علاوہ ازیں
 اس غزل کے سات شعر اور ایک اور غزل اس بزم میں مجھے نہیں مٹی جائے "نوار" علامی کو اپنی یادداشت
 پر بھی مٹی - ۱۲

وقف جو یہاں مجھ کو ابھی تھا کوئی دن اور تم کو بھی مناسب تھا مگر ہا کوئی دن اور
تم نے نہ مرا ساتھ نہ ہا کوئی دن اور لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تہا گئے کیوں اب ہو تہا کوئی دن اور

در پر ترے اس خاص غرض سے ہوئی ہیں سا منظور ہے ہستی کا مجھے اپنی مٹانا
ہے سخت اگر سنگ در اس کی نہیں پروا مٹ جائے گا سرگزر ترا ہر غم گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

بگڑے ہوئے آثار ہیں کیا بات بناؤں کچھ روٹھ گئے ہو تو بتا دو کہ مناؤں
اک بات ذرا سی ہے جو مانو تو بتاؤں آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

دیرینہ محبت کا کیا پاس نہ تم نے حیرت ہے کہ کس دل کو جدا ہونے ہو مجھ سے

لکھ غزل نہیں مرنے سے مرزا غالب نے نواب زین العابدین عارف کی موت پر لکھا جو عین جوانی کے عالم
ہی راہی ملک بھا ہوئے تھے جب کہ ان کی عمر ۲۶ برس کی تھی۔ غالب صاحب کے اپنے سات بچے ہوئے لڑکے
بھی اور لڑکیاں بھی۔ مگر کوئی پذیرہ جینے سے زیادہ نہ جیا، لہذا زین العابدین خاں کو جو ان کی سالی کا لڑکا
تھا جینی مانایا، زین العابدین خاں خوش فکر ہونے کی وجہ سے مرزا غالب کو اور بھی زیادہ عزیز تھے ان کی
اچانک موت کا مرزا غالب کو نہایت صدمہ ہوا۔ اور یہ دلدروز نوہ لکھا چھ نکہ اسی سال موس اور تسکین بھی
گزرے تھے اس لئے سالک نے یہ تاریخ بھی تھی۔

برس دن میں ہوئے یہ تین شاعر ارم میں عارف و تسکین و مومن

نالوں کے دھوئیں کچے شب تا میں نقشا انجم میں ہے آہ شرر افشاں کا تماشا
 ہے شعلہ الفت سے زمانے میں اجالا لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
 ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

دل باختہ کو کب ہے ترے سر کی قسم چیں پاتا ہے کہاں بستہ زنجیر الم چسپیں
 دیتے ہیں کہاں مجھ کو شب و ز کے غم چسپیں لیتا نہ اگر دل تمھیں دیتا کوئی دم چسپیں
 کرتا جو نہ مرنے کوئی دن آہ و فغاں اور

تھے نہیں رستہ جو ذرا پاتے ہیں نالے بہتے ہوئے اشکوں کے چلے آتے ہیں نالے
 وہ جوش ہے دریا کو بھی ٹرتا ہے نالے پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
 رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

پہلے شعرا کہتے تھے جو ہر بہت اچھے تھے سیکڑوں ایک ایک سے بہتر بہت اچھے
 مرزا کے بھی اشعار ہیں اکثر بہت اچھے ہیں اور بھی دنیا میں سغنور بہت اچھے
 کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

اے مرزا غالب! اس شعری سربِ جنتِ کو یاد رکھیں ہے "لیتا نہ اگر دل الایہ بہت لطیف فقر ہے لیتا کو
 رابطہ ہے چین سے مکرنا مروت سے آہ و فغاں سے مروت میں تعہد معنوی اور لفظی دونوں معسوب ہیں فارسی
 میں تعہد معنوی عیب اور تعہد لفظی جائز بلکہ معیوب اور بلج ریختہ تقلید ہے فارسی کے حاصل معنی مصرعین ہر اگر
 دل تمھیں نہ دیتا تو کوئی دم چسپیں لیتا نہ اگر نہ مرنے کوئی دن اور آہ و فغاں کرتا ؟

نیز، پوری غزل (اس شعر کو چھوڑ کر) مرزا غالب نے حاتم علی قدیر کو ارسال فرمائی تھی علاوہ ازیں
 اس غزل کے ساتھ شعر اور ایک اور غزل "اس بزم میں مجھے نہیں سی جایا" "نوارِ علائی کو تپ بادداشت
 پر بھی تھی - ۱۲

مجبوراً ہی تھا کوئی دن اور تم کو بھی مناسب تھا ٹھہرنا کوئی دن اور
 ساتھ نہ ہا کوئی دن اور لازم تھا کہ دیکھو مزارِ ستا کوئی دن اور
 تنہا گئے کیوں اب ہو تنہا کوئی دن اور

خاص غرض سے ہوں جس میں سا منظور ہے ہستی کا مجھے اپنی مٹانا
 سنگِ در اس کی نہیں پروا مٹ جائے گا سرگزر تر پہنچے نہ گھسے گا
 ہوں در پتھرے ناخیز فرسا کوئی دن اور

اے آثار ہیں کیا بات بناؤں کچھ روٹھ گئے ہو تو بتا دو کہ مناؤں
 راسی ہے جو مانو تو بتاؤں آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
 مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

ت کا کیا پاس نہ تم نے حیرت ہے کہ کس لہجہ جاہل ہوتے ہو مجھ سے

یہ مرثیہ مرزا غالب نے نواب زین العابدین عارف کی موت پر لکھا جو بین جوانی کے عالم
 بنا ہوئے تھے جب کہ ان کی عمر ۲۶ برس کی تھی۔ غالب صاحب کے اپنے سات بچے ہوئے لڑکے
 بھی مگر کوئی پندرہ چھبیس سے زیادہ نہ جیا، لہذا زین العابدین خاں کو جو ان کی سالی کا لڑکا
 با زین العابدین خاں خوش فکر ہوئے کی وجہ سے مرزا غالب کو اور بھی زیادہ عزیز تھے ان کی
 کا مرزا غالب کو نہایت صدمہ ہوا۔ اور یہ دلدوز لڑکھ کچھ نکدہ اسی سال موسیٰ اور تسکین بھی
 ملے سالک نے یہ تاریخ بھی تھی

برس دن میں ہوئے یہ تین شاعر ارم میں عارف و تسکین و موسیٰ

باندھی ہے کمر ملک عدم کے ہیں ارادے جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن او

کس ذوق سے تھا نحو تماشا ابھی عارف اس نرم سے کس واسطے اٹھا ابھی عارف
کیوں ہو گیا پیوند زمیں کا ابھی عارف کیوں اے فلک پیر حواں نقا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرنا کوئی دن اور

والہ تمہیں گھر کے اجلے کا سبب تھے چھایا ہے اک اندھیر مری آنکھوں کے آگے
کس خاک کے پرے میں جیسے میری نظر سے تم ماہِ شب چار دم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن او

مانا کہ وہ آیا تھا فقط جان ہی لینے ممکن تھا کہ چیلے سے اسے ٹالے رہتے
کچھ بات بنا دیتے تو کیوں چھوٹتے تم سے تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

جلدی جو یہ کی جانے میں کیا جی میں سمائی جاتے ہوئے ہر ایک سے کیوں آنکھ پھرائی
افسوس نہ اپنوں کی بھی الفت تمہیں آئی مجھ سے تمہیں نفرت ہی نیڑے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

ناراض ہی تم تھے تو دلِ غمزدہ تھا خوش تم سامنے تو پہننے تھے ناخوش ہے یا خوش
جب تم نہ ہے یہ تو کہو دل ہے کیا خوش گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جو انرگ گزرا کوئی دن اور

چھوڑے گی ابھی جان کہاں رشتہ قالب مرزا ابھی سمجھے نہیں تم اس کے مطالب
کیا زیست ہر ایسے کی جو ہو موت کا طالب ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن او

۲۰

اجابتوں پر دعاؤں کی کیجئے کیا ناز نہ عجز اپنا ہوا کارگر نہ سوز و گداز
ازل میں بسکہ ہر اک شے کا ہو چکا ہر طراز حریفِ مطلب مشکل نہیں فسوں نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

نظر ہی سب نہیں پھر دوڑ دھوپ ہے سود ابھی ہے تجھ سے بہت دور منزل مقصود
ہر ایک ذرہ میں ہے نور ہستی معبود نہ ہو بہرہ بیاباں نور دویم وجود؟
ہنوز تیرے تصور میں ہی نشیبِ فراز

ہم آج تک تو رہے شکل دیدہ حیراں ہوا نہ سامنے نظروں کے حسن یار عیاں
گزاریں صبر میں کچھ اور دن کہاں یہ تو اں وصالِ جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں
کہ دیکھئے آئینہ انتظار کو پرواز

رہا ہے یہ تہہ تجر بھی ذوق دید میں مست گیلے جان سے پھر بھی ہوا خیالِ پست
کیا ہے یا کے پر تو نے اسکو نیست و هست ہر ایک ذرہ عاشق ہے آفتاب پرست
گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوہ ناز

عجب مقام میں مرزا ہے کیا کہوں غالب مثال اسکو اگر دوں تو کس سے مومن غالب
فضا میں عالم امکان ہے فزون غالب نہ پوچھ وسعتِ میخانہ جنوں غالب
جہاں یہ کارگر دوں ہر ایک خاک انداز

۴۱

مفت ہوتے ہیں پریشان عزیز کیا مجھے سمجھے ہیں نادان عزیز
مجھ کو ہے یار کا فرمان عزیز کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز
مشکل اس کا ہے نکلا دل سے ہے تعلق بھی بلا کا دل سے
تیر کو تو نے جو کھینچا دل سے دل سے نکلا یہ نہ نکلا دل سے
ہے ترے تیر کا بہرکان عزیز
آف نہ مرزا نے کبھی کی غالب جو مصیبت پڑی جھیلی غالب
ضبط لازم ہے تمہیں بھی غالب تاب لاتے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

۱۵ مرزا غالب نے ایک خط میں مرزا آقہ کو لکھا کہ بکوں ترک لباس کرنے ہو، پینے کو نہ پائے پاس ہے کیا جس کو تار
کر پھینکو گے ترک لباس سے قہرِ ہستیاٹ نہ جائے گی۔ بغیر کھانے پے گزارا نہ ہوگا۔ سختی اور سستی اور رخ و آرام کو
ہوا کر دو جس صورت ہو اس صورت سے ہر صورت گزرنے دو۔ ج تا ب لاتے ۱۶۔ نیز نواب ملانی کو بھی
لکھا ”بھائیوں سے پھر نہیں ملا۔ بازار میں نکلتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ جو اہر خبردار میرا سلام انوین کو ادا ان کا
سلام مجھ کو پہنچا دیتا ہے اس کو غلیظت جانتا ہوں۔ ج تا ب لاتے ہی بنے گی غالب ۱۷۔“

میری ہستی ہے اک انوکھا راز میں بقتا و فنا ہم دم ساز
ظاہر انجام ہے نہ کچھ آغاز نہ نکل نغمہ ہوں نہ پردہ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تجھ کو ہنسنے سے کام صورت نکل میں ہوں اور ہم نوائی بلبل
لاگ دونوں میں آپڑی بالکل تو اور آرائشِ خیم کا کل
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

بس زیادہ نہ لے تعلق کی غیر ممکن ہے دل کی آزادی
کیا عجب ہے کھلے پر پردہ بھی لاف تمکین فریبِ سادہ دلی
ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گزار

جب سے کچھ قفس کیا آباد بھول کر بھی نہیں چمن کی یاد
دل نہیں چاہتا کہ ہوں آزاد ہوں گرفتارِ الفتِ سیاد
ورنہ باقی ہے طاقت پرواز

تنگ آیا ہوں بحرِ دلبر سے کیوں نہ آنکھوں سے اشکِ خوں برے
دل کہاں تک فراق میں ترے وہ بھی دن ہو کہ اس ستم گرے
ناز کہیںچوں بجائے حسرتِ ناز

یہ کوئی ضبط ہے کہ میں چپ ہوں دل ہو خالی تو کیا لہو روؤں
روتے روتے ہوا ہے حال زبوں نہیں دل میں مرے وہ قطرہ خوں
جس سے مڑکاں ہوئی نہ ہو گلہ باز

تیغِ بڑاں تری نگاہ تیسر عشوہ تیرا جہاں سے گرم ستیز
خوش خرامی تری قیامت فیز اے ترا جلوہ یک قلم انگیز
اے ترا ظلم سر بسر انداز

اٹھ گیا ہے نقابِ روئے نکو خوب نکلیں گی حسرتیں اب تو
منعِ پابوس سے نہ کر مجھ کو تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو
ریزشِ سجدہ جبینِ نیاز

غم سے کس دن میں جاں بلب نہ ہوا ورد سے حالِ غیر کب نہ ہوا
لطفِ مجھ پر یہ بے سبب نہ ہوا مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا
میں غریب اور تو غریب نواز

سرخوش و مستِ نظم رہتا تھا دل سے تنہا شاہدِ سخن پہندا
روئے خاک اڑائے مڑنا اسد اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا وہ زند شاہد باز

روایف دک

(۴۳)

چاہتے یہ شوخ تو دنیا میں کیا کم تھا نمک سنگ کے بدلے لے سکتے تھے پتھر کا نمک
ان کے ہاتھوں کب دہان زخم نے چکھا نمک زخم پر چھٹکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک
کیا مڑا ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

بے سبب کب تک سے اخترا زخمِ دل تو نہیں واقف تو مجھ سے پوچھ از زخمِ دل
اس کی خاکِ پاچھر گل لے چارہ ساز زخمِ دل گھر در راہ یار ہے سامانِ ناز زخمِ دل
ورنہ ہوتا بے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

چاہتا ہوں میں تو یہ پیدا کوئی ہمہ دہو اور مزہ مجھ کو یہ ہے دیکھوں اسے ہنسنا ہو
حسرتیں نکلیں کہیں فصل بہاری لائے تو مجھ کو از رانی ہے تجھ کو مبارک ہو جو ہو
ناکِ بلبل کا درد اور خندہ گل کا نمک

غیر ممکن تھا کسی مرہم سے ہو اس کا علاج تھا اسی دماں کا طالب اسکے زخموں کا مزاج
تھی تنگ دو کس کی اس کو اور کس کی احتیاج شورِ جولاں تھا کنارِ بحرِ برکس کا کآج
گردِ ساحل ہے بزخمِ موبہ دریا نمک

سیکھ لے اس شوخ سے کوئی محبت کا نباہ گو بظاہر ہو چکی پر مجھ سے ترکِ رسم و راہ

پھر بھی مجھ پر کس قدر ہے ہر بانی کی نگاہ داد دیتا ہے مرے زخم جگر کی واہ واہ

یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وجہ جانمک

پوچھ لو اگر یہ کیسی لگ رہی ہے انکوئے تاکہ ہو اس خستہ تن کا قصہ آسانی سے طے

تم گئے مجھ پر گئے ہونے تقاضے پر پے چھوڑ کر جانا تن مجروح عاشق حیف ہے

دل طلبِ نازِ زخم اور مانگیں ہیں اعضا نمک

ہے عروسے چارہ جوئی باعثِ تھقہ درد کیوں کسی کی سعی سے حاصل کروں تاثیرِ درد

اس کے ہنسنے سے مجھے ہاتھ اگئی نذرِ درد بغیر کی منت نہ کھینچوں گاپے تو قیرِ درد

زخمِ مثلِ خندہ قاتل ہے سزا پانمک

اپنی آنکھوں سے جو تیرے شوق کو بھر دیکھ لیں حضرت مرزا علی تیری بخود کی داد دیں

اب کہاں رہم کھائے اور کہاں وہ لذتیں یاد ہیں غالب مجھے وہ دن کو وھڑوق میں

زخم سے گرتا تو میں ہلکوں سے خستہ تھا نمک

۴۴

ختمِ قصہ ہے شبِ ہجر بسر ہونے تک صورتِ شمع ہوں مہمانِ سحر ہونے تک

کیا خبر حال ہو کیا تجھ کو خبر ہونے تک آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

اک تلامذہ ہر پاک کیوں نہ ہے پھر دل تنگ روز طوفانِ حوادث کا ہر آمادہ جنگ

کس طرح دیکھئے بے چارہ کی نکلے گی ہنگ
دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ

دیکھیں کیا گزرتے ہے قطرہ پر گہر ہونے تک

آتش ہجر سے حالت ہے جگر کی جو خراب
کش مکش سے ہے مری جان گو قمارِ عذاب

دل یہ کہتا ہے کہ پہلے مجھے کھجئے خونِ ناب
عاشقی صبرِ طلب اور تمنا بے تاب

دل کا یارِ نگ کروں خونِ جگر ہونے تک

تم سے اور وسدہ وفائی ہو کبھی ناممکن
دیکھو لیں خیر کر لائے ہو خدا کو ضامن

اپنی اس دارِ فناء میں ہے بقا ہی کے دن
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن

خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

ہو گیا حسن کی ہیبت سے دل کو وہ دو نیم
سخت حیرت ہے کہ زندہ ہے کس طرح کلیم

فرض عاشق ہے دم جلوہ کرے جانِ کلیم
پر تو خور سے ہے شبنم کو فست کی تعلیم

میں بھی ہوں ایک۔ عنایت کی نظر ہونے تک

ظرف رکھتا ہے تو کر بادہ پرستیِ نافل
ورنہ یہ بزمِ رب کی نہ یہ بستیِ غافل

تجہ کو محروم نہ کرنے تری مستیِ غافل
اک نظرِ پیشِ نہیں فرصتِ ہستیِ غافل

گرمی بزمِ ہے اک رقصِ شر ہونے تک

پلو پچھتے کیا ہو یہ مرزا سے کہ کیسا بے مزاج
کل تھی فرصت اسے اندر وہ مصیبتِ بزدان

وہ مرض ہے کہ معانِ نہ دوا کا محتاج
نہ بستی کا اسد کس سے ہو تہِ مرگِ ملاج

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

رویف (دل)

(۲۵)

یہ بے شعور جب سے ہوئی مبتلائے گل
چنتا نہیں ہے اس کی نظر میں سوائے گل
بھولی ہوئی ہے عہدِ قیام و بقائے گل
ہے کس قدر ہلاک فریبِ وفائے گل

بلبل کے کار و بار پہ ہیں خندہ ہائے گل

مدت سے یاد گل میں غنا دل کو تھا شغف
اشجارِ برگِ بار سے خالی تھے صفِ بصف
اب گل سے شاخ شاخ ہوئی جامِ جمِ بکف
آزادی نسیمِ مبارک کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقہٴ دام ہوئے گل

جوشِ بہار میں کوئی غنچہ اگر کھلا
کتر کسی طرحِ دلِ صد چاک سے نہ تھا
سمجھنا نہ کوئی خستگی گل کا مہرا
جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا

اے وائے نالائِبِ خونیں نوائے گل

جب پائے بوس کی بھی اجازت مجھے نہ دو
کم قسمتی کا اپنی گلہ مجھ کو کیوں نہ ہو
مجرم بنوں رگائوں جو آنکھوں پائوں کو
خوش حال اس حریفِ یہ مست کا کہ جو

رکھنا ہو مثل سایہ گل سر بہائے گل

گل کو جو دیکھتا ہوں کھلتا ہوں دل میں خار
کہتا ہوں ہوں نہ یہ کہیں تیرے گلے کا بار

اس کے وجود پہ ہے مجھے رشک بار بار ایک یاد کرتی ہے اسے تیرے لئے بہار
میرا رقیب ہے نفس عطرائے گل

دل تنگ آگیا ہے غم روزگار سے فرحت ہو خاک سیر گل ولا زار سے
خالی ہے ہاتھ سر میں گرانی خار سے شرمندہ رکھتے ہیں مجھے باد بہار سے
مینائے بے شراب و دل بے ہوائے گل

بو باس اس نے حسن میں حاصل ضرور کی لیکن وہ بات اس میں کہاں تھی نور کی
نسکین کیا ہو اس سے دل ناصبور کی سطوت سے تیرے جلوہ حسن غیور کی
خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

رکھتا ہے غنچہ دل میں ازل سے چسک سنبل کو کر رہی ہے پریشاں تری لشک
نرگس بھی چاہتی ہے تیرے نور کی جھلک تیرے ہی جلوہ کا ہے پردہ صو کا آج تک
بے اختیار دوڑے ہے گل در قضاے گل

پھیلی ہے جسکی بوئے دل آویز چار سو چل چڑ جس سے ہر گلِ خنداں کو رنگائے بو
مرزا کو جس کی باغِ جہاں میں ہے جستجو غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گلِ حریب قبائے گل

رولیف (ن)

(۴۶)

اب وہ دل اور وہ خیال کہاں وہ تصور وہ دیکھ بھال کہاں
وہ خوشی اور وہ ملال کہاں وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

جب تک آزادہ جہاں ہم تھے دید بازی میں ہم نے دن کاٹے
دل ہے اب اور غم ہیں دنیا کے فرصت کار و بار شوق کسے
ذوقِ نظارہ جمال کہاں

اب نہ دل میں خیال گیسو کا اور نہ آنکھیں ہیں محو شوقِ لہ
و لولہ مٹ گئی جو دل میں تھا دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رھا
شورِ سودا کے خط و خال کہاں

کیا کروں گردِ دشتِ زمائے حوصلے پست کر دیئے دل کے
نہ رہا وہ سخن : ذوقِ مجھے تھی وہ اک شخص کے تصور سے

اب وہ رعنائی خیال کہاں
بہر چکا توں دل میں جتنا تھا کوئی قطرہ جگر میں بھی نہ رھا

ہمنشیں لمن کیا یہ مجھ کو دیا ایسا آسان نہیں لہو رونا

دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

تھے کبھی خاک آستانہ عشق اب نہ وہ ہم نہ وہ زمانہ عشق

جیب پرستی تو تھے یگانہ عشق ہم سے چھوٹا قمارخانہ عشق

واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں

جو رگِ ردوں اٹھائے جاتا ہوں ٹھوکر میں صبح و شام کھاتا ہوں

روز ایذا نئی اٹھاتا ہوں فکر دنیا میں سرکھپاتا ہوں

میں کہاں اور یہ وبال کہاں

کہئے مرزا کا حال کیا غالب بے طرح ضعف ہو گیا غالب

ہے یہ پیری بھی کیا بلا غالب مضحکہ منہل ہو گئے قوی غالب

وہ عناصر میں اعتدال کہاں

اے مرزا غالب اس شعر کے متعلق عبدالرزاق شاکر کو بیوں لکھتے ہیں "بندہ نواز زبان فارسی میں خطوں کا کھنٹا

پہلے سے متروک ہے۔ پیراہ مری وضعف کے صدروں سے محنت نردہی و جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی

حرارت غریبی کو زوال ہے اور یہ حال ہے کہ سہ مضحکہ منہل ہو گئے قوی غالب : وہ عناصر میں اعتدال کہاں۔

کچھ آپ کی تخصیص نہیں۔ سب دوستوں کو جن سے خط و کتابت رہتی اردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں

اس مکتوب میں آگے چل کر فرمایا ہے "اور میں اب انتہائے عمر ناپائیدار کو چھو چکر آفتاب لب با او"

بجوم امراض جسمانی و آلام روحانی سے زندہ درگور ہوں۔ کچھ یاد خدا بھی چاہئے نظم و شری نظم رو کا انتظام

ایزدانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا ہے اگر اس لے جا با تو قیامت تک میرا نام و نشان

باقی و قائم رہے گا۔" آثار ایسے ہی نظر آتے ہیں۔

بھاگا ہوں دام توڑ کے آفت رسید ہوں بیجا نہیں جو سایہ سے اپنے زمیدہ ہوں
 ہیبت زدہ ہوں چاشنی غم چشیدہ ہوں ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
 میں دستِ غم میں ہوئے مباد دیدہ ہوں

کہتے ہیں یوں تو سب مجھے با اختیار ہو لیکن خدا گواہ جو کچھ اختیار ہو
 مجبور جو ہو پھر اسے کیا اختیار ہو ہوں درد مند جبر ہو یا اختیار ہو
 گر نالہ کشیدہ گر اشک چکیدہ ہوں

چکے ہوئے ہے غصہ غم کا فرہ دہن خوش ذائقہ تلاوتِ جاں سے ہو کیا دہن
 اس درجہ تلخ قحطِ آخر مرا دہن جاں لب پر آئی تب بھی نہ شیریں ہو دہن
 از بسکہ تلخی غم ہجراں چشیدہ ہوں

جے جس ہوں مثلِ عضوِ معطل پڑا ہوا جنبشِ مجھے ہو ذرہ برابرِ جال کیا
 میں لائقِ جزا ہوں نہ مستوجبِ نرا نے سب سے ملا کہ نہ ساغ سے واسطہ

میں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں
 ہوں دشمنِ فرشتہ نہ جنِ دہری سے لاگ حیواں کی تاک میں نہ کسی آدمی سے لاگ
 اپنے سے ہے لگاؤ نہ کچھ غیری سے لاگ ہوں خاکسار نہیں مجھ کو کسی سے لاگ
 نے دانہ فنادہ ہوں نے دام چیدہ ہوں

پوچھو نہ ہمدومری حسرت کی داستاں
حراماں نصیب کر کے قضا لاتی ہے یہاں
نا کامیاں نصیب میں وہ ہیں کہ الاماں
ظاہر ہیں میری شکل سے فسوس کے نشاں

خاراں سے دست ہند لگزیہ ہوں
سنبھلنے اپنی زلف کے کھولے نہیں شکیں
سبزان باغ ابھی نہیں گرم دلاں و غنچ
باغ خیال دل سے ملنے ہوئے ہے رنج
ہوں گرمی نشاط تصور سے لغتہ سنج
میں عنذ لیب گلشن نا آفریدہ ہوں

مسکن نہ آسماں نہ زمیں ہے مری جگہ
کرسی ہے اور نہ عرش بریں ہے مری جگہ
میں خود کہیں ہوں اور نہ کہیں مری جگہ
ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
ہوں میں کلام لغز و لے ناشفیدہ ہوں

ہے اک زمانہ بربر کہین و مخالفت
دنیا کو ہے عروج میں میرے مزاجت
پہناں ہے مشتری کی نظر سے مری صفت
جو چاہیے نہیں وہ مری قدر و منزلت

میں یوسف بر قیمت اول خریدہ ہوں
مشرک میرے کیوں ہے زمانے کو قال و قیل
میں بھی ہوں اپنے رنگ میں بے مثل و بیحدیل
اہل و ع کے زمرے میں ہر چند ہوں ذلیل
پرنیکوں نے فرض کر لیا بدخجہ کو بے دلیل
پرواصیوں کے فرقے میں ہیں برگزیدہ ہوں

مرزا ہی سے نہیں ہے زمانے کو کچھ حسد
میں نے بھی بن گئے انسان دام و دود
اس طرح کھائے لینے میں جسکی نہیں ہے حد
پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد

ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردِ گنہگار ہوں

ہم سے بڑا و برا ہو تو بھلا کہتے ہیں لطفِ بیجا کو جوان پر ہے بجا کہتے ہیں
کچھ صواب اس نے کیا بھی تو ظاہر ہو ہیں کی وفام سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ آچھوں کو برا کہتے ہیں

دل پریشانی ہے مغمموں میں پریشاں اپنے ایسی آشفتمندانہ کو کوئی خاک سے
کہہ نہ بیٹھیں کہیں کچھ اور خدا خیر کرے آج ہم اپنی پریشانیِ حاطران سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

دردِ دل خود بھی جو رکھتے تو سمجھتے اسکو دردِ انگیز ہیں اندوہ فرا ہیں یہ تو
سارنگ سے مگر اب تیر یہ کہیں سب سن لو اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جوئے و لغو کو اندوہ رہا کہتے ہیں

راستہ دن بیتی، بیانیہ کی حالتِ غش سے ناکش خاک ہوں تیری بڑی گشتِ غش سے
بہت نالہ جاتا ہے ملتی ہو جیہ ہلتِ غش سے دلیں جا بے ہوتی ہو جو فرصتِ غش سے
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں

ہی ہو تر بخیز شرک ہے دلی سے مفقود ہم معبود ہیں نہ کہے کے نہ کعبہ معبود
رواقبہ میں تو صرف ایک جہتِ مقصود ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود

قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

یوں تو کانٹوں پر ہمیشہ ہمیں ترپایا ہے اب محبت کا تری لطف مگر پایا ہے
حالتِ زار پہ تو بے جو ترس کھایا ہے پائے اوکار چبے تجھے رحم آیا ہے

خارہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں

سوزِ باطن کا جو کچھ حال ستم کرنے سنا دلنشین ہونے کو تھا ہی کر کیا کچھ جو کا
ہم نے بھی رنگ بیان کو وہیں اپنے بدلا اک شہر دل میں ہر اس کو کوئی گھر ایسا کیا

اگل مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

کرتے ہم رد و قدح اس سے تو ہوتا دل تنگ گفتگو کرتے ہوئے رہتا ہے مادہ بھنگ
ہاں میں ہاں اسکی ملاتے ہیں تو بڑھتی ہوا تنگ دیکھ لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ

اس کی ہر بات پر ہم نام خدا کہتے ہیں

سن کے یہ سانحہ مرزا سمجھی رو دیں شاید جو سخن سنج ہیں اس غم کو نہ بھولیں شاید
بزمِ ماتم ہو پیا بزمِ سخن میں شاید وحشت و شیفقتہ اب مرثیہ کہیں شاید

مر گیا غالب آشفقتہ نوا کہتے ہیں

۱۵ مہر گیا۔ ایک نظم کی گھاس جسکے متعلق روایت ہے کہ جو اسکو اپنے پاس رکھتا ہے لوگ اس پر مہربان ہو جاتے
ہیں گویا حبیب کا اثر رکھتی ہے جس سے تجھ رحم آیا ہے مانے ہی کچھ لیا ہے کہ تیرے راستے کے کانٹے مہر گیا کا اثر
رکھتے ہیں اور ان ہی کی وجہ سے تو ہم پر مہربان ہوا ہے ۱۲ ۱۵ آشفقتہ نوا۔ پریشان مایس کہنے والا۔ وحشت و
شفقتہ دونوں غالب کے ہم عصر شاعر اور دوست تھے۔ اس شعر میں وحشت و شفقتہ کے الفاظ خاص طور پر
برکاری ہے۔ وحشت صاحب کا نام غلام علی خاں اور شفقتہ کا نام نواب مصطفیٰ خاں تھا۔ وہ جہانگیر آباد کے رئیس تھے چنانچہ
شفقتہ صاحب ایک مانے ہوئے گنہگار اور کس کس کے جو دہلی میں رہنے لگے وہ غالب کی عظمت کے حد سے زیادہ تھے

عشق کیا جہنم قمری طوق گردن میں نہیں وہ جنوں کیا پھڑوں کز زم اگر تن میں نہیں
اسکو جنوں کیا کہیں جس کا مکاں بن میں نہیں آبرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں

ہے گریباں سنگ بیراہن جو دامن میں نہیں

پہلے دامن میں جو گلکاری تھی گلشن میں نہیں لطفِ خونباری جو تھامے کل میں نہیں
دل تو دل اب تو لہو گہاے گردن میں نہیں ضعف سے لے کر کچھ باقی مستی میں نہیں

رنگ ہو کر اڑ گیا خوں کے دامن میں نہیں

چونکہ دیواریں ہوئی تھیں سداہ آفتاب اسلئے وہ درہو ہے سجدہ کاؤ آفتاب
مٹی جو زردیدہ نگاہی اک گنہ آفتاب ہو گئے ہیں جمع اجزاء نگاہ آفتاب

ذرا اسکے گھر کی دیواروں کے وزن میں نہیں

در سیر خانہ کا میرے اک دربان خیر ہے موت کے مزے میں ہوں جینے کی طبیعت خیر ہے
ذراے افکار ہیں زمین خاکِ سید کا ڈھیر ہے کیا کہوں تاریکی زندانِ غم اندھیر ہے

یہ بنہ نور صبح سے کم جسکے روزن میں نہیں

اس کو مارا اس کو زندہ کر دیا عجائز سے اسکو غم سے کیا بھل تو اسکو ناز سے
گھر بنایا اس نے ہر دل میں نئے انداز سے رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویران ملک سے

بقیہ ۵۵۔ ۱۔ مستفادہ قدر شمس سے ان دونوں کو اس مقطع میں یاد کرتے ہیں۔ ۳

انجن بے شمع ہے گر برق خرمین میں نہیں

غم بھر میں اس نے لے دیکر فقط یکساں طعن دیکھے انصاف سے تو سرسبز بجابے طعن
نہ فقط نا تجربہ کاری کر یہ کرتا ہے طعن زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کلدت زخم سوزن میں نہیں

جیسے تھی اہل شک گل کے خوب نظائے ہوئے مرے بھی پوئے یوں ہی ارمان ل ساکے ہوئے
قبر میں ہمیشہ نظر وہ گل سے رساں ہوئے بسکہ ہیں ہم اک بہار نازکے ماں کے ہوئے
جلوہ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

کرنہ درماں چارہ گر مجھ خستہ ورنجور کا ہر مسام اک زخم ہوگا اس تن محروم کا
دل کی حالت دیکھ چھٹا ہو گیا زنجور کا قطرہ قطرہ اک ہیو لاپے نئے ناسور کا
نوں ملی ذوق درد سے فاسخ مئے تن میں نہیں

کثرت سے پر جو شجی پر مینماں کو تھی ڈٹ گیا میں زندہ پینے پر تو قلعی کھل گئی
ایک کش میں تم کے خم خالی کئے اور بس نہ کی لے گئی ساقی کی نخوت قلمز آشامی مری
موج سے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

غم تو آئیکلے بھر کیونکر نہ اٹھے دل سے دوو کیا ادھیڑا پنجہ پیری نے تن کا تار و بود
نیستی ہے اپنی ہستی اور عدم اپنا وجود ہو فشاں ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود
قر کے جھکنے کی بھی گنجائش مئے تن میں نہیں

کس طرح مرزا ہو اسکی دیدہ خلقت میں قدر مال میں جس کا نہ حصہ ہو نہ ہولت میں قدر

قد کی شہریت ہر جہت ہو قسمت میں قدر
حق وطن میں شان کیا غالب ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں ہر مشقت خس کر گلشن میں نہیں



اب جو مستانہ گھٹائے برستی ایک دن
آؤ مل جل کر اٹھائیں لطف ہستی ایک دن
دیکھ لو گے بخودوں کی تیز دستی ایک دن
ہم سے کھل جاؤ بوقت بے پرستی ایک دن
در نہ ہم پھیریں گے رک کر گذرستی ایک دن

جب گرد میں دام تھے پر مغال تھا ہریاں
رات دن پینے پلانے سے تھی تب فرصت ہل
مظنی میں بھی نہ اس جسکے سے باز آن زباں
قرص کا پیتے تھے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ ہستی ایک دن

ہے بہا اس دور کی ایک ایک ساعت جانے
اس کی رونق کو نہ کچھ بے قدر و قیمت جانے
زار نالی بھی جو ہو تو ساز عشرت جانے
نغمہ ہائے غم کو بھی اسے دل غنیمت جانے
بے صدا ہو جائیگا یہ ساز ہستی ایک دن

زعم دانانی پر اس درجہ نہ کر ناداں نہ ہو
مثل گل پڑمردہ ہو گا ورنہ یوں خداں نہ ہو

اے مولیٰ محمد حسین آردے آب حیات میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ مرزا غالب فرما رہے تھے عرض خواہوں سے
نالس کر دی۔ جواب دی میں طلب سے گئے مہتمی صدر الدین صاحب کی عدالت تھی جس وقت یہی پر گئے انھوں نے
یہ شعر طرحا سے قرض کی پیتے تھے اے آردہ نے مدعی کو روپے اپنی گروہ سے ادا کر دینے اور اس طرح مسرزا
غالب قرض سے سبکدوش ہو گئے۔ ۱۲

چاردن کی رفعت موبہوم پر نازاں نہ ہو غرہ اوج بنائے عالم امکان نہ ہو
 اس بلندی کے نصیب نہیں ہر پستی ایک دن
 شب سرمحل جو ہاتھ پائی وہ کرنے لگا کون کہتا ہے کغیروں نے اسے کسنادیا
 اس بڑے برتاؤ میں مہرا نہیں اس کی خطا دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا
 ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیشدستی ایک دن

۵۱

ظاہر میں گو شغیف نہیں جہر باں نہیں ان کے ہمارے ربط کو فی درمیاں نہیں
 لیکن خفا بھی ہم سے وہ جان جہاں نہیں ہم پر جفا سے ترک وفا کا گماں نہیں
 اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں
 تم پوچھنے جو آئے تو مجھ پر کرم کیا کچھ بھی اگرچہ رسم عیادت نہ کی ادا
 کیا کم ہے یہ نگاہِ ترحم سے دیکھنا کس منہ سے شکر کیجئے اس لطیفِ خاص کا
 پرستش ہے اور پائے سخن درمیان نہیں
 ہوتا نہیں وہ رام تو ہے اس کارم عزیز بڑھتا ہو جس سے شوق و شہتہ کیا ہر کم عزیز
 خفگی کا بھی تو شوخ کی ہر ہم کو غم عزیز ہم کو ستم عزیز ستم گر کو ہم عزیز
 ناہریاں نہیں ہے اگر جہریاں نہیں
 کیا جانے ذوقِ جور و جفا کو عد و ساینر ہم جس سے یاد آتے ہیں ہر ظلم ہی وہ چیز

اس لطیف معنوی کی کہاں غیر کو تیز ہم کو ستم عزیز ستم گر کو ہم عزیز
 نامہریاں نہیں ہے اگر مہریاں نہیں
 کیا بات میں نے کی ہے کہ تم کو بری لگی حیرت سی نام بوسہ لب سن کے ہو گئی
 میں نے کیا سوال تو مجھ سے خطا ہوئی بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی
 آخر زباں تو رکھتے ہو تم گودہاں نہیں

قطع

ہر چند خولے یار میں اک التہاب ہے ہر چند فحہ کو اس کو حضوری عذاب ہے
 ہر چند غیظ و غصہ بوقت خطاب ہے ہر چند جاں گدازی قہر و عتاب ہے
 ہر چند پشت گرمی تاب و توان نہیں
 لیکن جب اس سے رحم و کرم کی امید ہے جو گفتگوئے تلخ ہے حلوائے عید ہے
 اس ذوق و انبساط میں شکوہ بعید ہے جاں مطرب ترا کہ ہل من فریب ہے
 لب پر وہ سنج زمرۃ الاماں نہیں
 صادق اگر ہے عشق تو پھر کیا ہر خوف و بیم کر نذر یار گو ہر جاں بھی نبی الیم
 پیدا وہ درد کر کہ ہو حال جگر سقیم خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم
 دل میں چھری چھو جو مرہ خونچکاں نہیں
 بے داغ سینہ ہو تو د سینہ اسے کہو خالی ہو سوزے تو جگر کو نکال دو

مضطر اگر نہ ہو تو سلام ایسی جان کو ہے ننگِ سینہ دل اگر آلتِ لہر نہ ہو
 ہے عارِ دل نفس اگر آذرِ فشاں نہیں
 وحشت میں مرکب پھڑپھڑاتا ہوں کھاکے پیچ و تآ
 دیوار و درگزی کہیں ہو کچھ تو انقلاب
 دیوانہ ہوں تو کیا مجھے آنا نہیں حساب نقصان نہیں جنوں میں بلا ہے ہو گھر خراب
 سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں
 نغائبِ ندگی کا مادہ میری سرشت میں بیتِ انعم میں عمر کٹی یا کفشت میں
 ہوتا تھا اور خاک مے بختِ زشت میں کہتے ہو کیا لہجہ تری سرِ نوشت میں
 گویا جہیں پر سجدہ بت کا نشان نہیں
 ہو حرف گیر اگر ہے زباں خاص و عام کی پروا نہیں کسی کے خیالاتِ خام کی
 شہرت ملائکہ میں بھی ہے میرے نام کی پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
 روح القدس اگر چہ ملا ہمزباں نہیں
 مرزا سوالِ بوسہ لب کو وہ ہر گھڑی سن کر چوٹا لٹا ہے تو سوچی ہو دور کی
 جب جاں بلب سے گاتا تو خود ہو گا مقتضی جان ہے بہائے بوسہ وے کیوں کہے ابھی
 غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

میں جو آوارہ ہوں اس میں مری تھیں نہیں میری تحریر جہیں لائے تغیر نہیں

قابلِ چارہ مری گردش تقدیر نہیں مانعِ دشتِ نوردی کوئی تندر نہیں

ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

دل کا اک لور ہے جو لئے پھرتا ہے کشتاں بخود اتنا ہوں کہ ہے راہ بھی نظروں نہاں

کوئی منزل بھی تو پیدا نہیں جزوِ مگلاں شوقِ اس دشت میں دوڑاں ہر جھکو کر جہاں

جادہ غیر از نگہِ دیدہ تصویر نہیں

جان تو ندر میں جلاد کو دی جاتی ہے اس کے خوش کرنے کی تدبیر تو کی جاتی ہے

لیکن امیدِ جفا قطع ہوئی جاتی ہے سیرتِ لذت آزار رہی جاتی ہے

جادہ راہِ رفتِ بزدل شمشیر نہیں

نہیں ناکامی فریاد کی پروا مجھ کو نہ خیالِ آہ کی برباد روی کا مجھ کو

ہو نہ پوری نہ سہی ہے تو تمنا مجھ کو رنجِ نو مبری جاوید گوارا مجھ کو

خوش ہوں گزراں زبونی کشِ تاثیر نہیں

خشک ہو زخمِ توبے چینِ دل اپنا ہو جائے جب تک اک زخمِ بیاور نہ پیدا ہو جائے

سنگِ طفلان جو نہ کھاؤں مجھے سودا ہو جائے سر کھاتا ہے جہاں زخمِ سراپا ہو جائے

لذتِ سنگِ باندازہِ تقدیر نہیں

کریا عفو کا جب وعدہ راسخ اس نے کون شرمندہ ہو پھر شرمِ گنہگاری سے

نفس کہتا ہے کہ لے خوب گناہوں کے مجھے جب کرمِ رخصتِ بیباکی و گستاخی دے

کوئی تقصیر بجزِ نجلتِ تقصیر نہیں

وہ بھی مرزا سا جریدہ ہے بقول ناسخ صاحب اوصاف حمید ہے بقول ناسخ
ہند میں شاعر چمیدہ ہے بقول ناسخ غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد تیر نہیں

تری رد گزریں جو ہم دیکھتے ہیں فضا ایسی جنت میں کم دیکھتے ہیں
گل و لالہ ہر صبا ہم دیکھتے ہیں جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں
ہوئے ہم جہ مشتاق اس کے سخن کے یہ آثار گویا ہیں دیوانہ پن کے
دہن ہی نہیں اس بت سحر فن کے دل آشفنگاں خال کنج دہن کے
سویدرا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

۱۔ یہ ترقی کی علامت اور ان کے کلام کی عظمت کا ہر ساعہ اعتراف کیا ہے دوفی نے کہا ہے
ہو پھر ہو امتیر کا اعدا نصیب دوفی یاروں سے بہت دور غزل میں مارا
ستودار یا لکھی کہا ہے ستودار تو اس غزل کو محلِ دو غزل کہہ نہ ہونا پڑا ہے تیرے استاد کی طرف
عالم نے یہ مس اور گزراں ہر استاد کا اس رائے سے اتفاق کہ نامیر تقی تیر کے طبع باریستا ہوئے ہیں کوئی مستر
باقی نہیں رہے جیسا کہ انھوں نے کہا ہے
رہنچے کے تمہیں استاد ہیں ہو غالب کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی تیر بھی تھا
ناسخ لکھنؤ کے مشہور ساعر اور اپنے زمانے کے استاد تھے انھوں نے فرمایا ہے کہ جو شخص میر تقی میر سے عقیدت
ہیں رکھتا وہ بے بہرہ ہے غالب نے مقلع میں ناسخ کے مہر تالی کو بابر دعا ہے۔ ۱۲

ترے قدموزوں نے پایا وہ عالم عجب کیا قیامت کرے غیر مقدم
جو تو ہو خسران تو محشر مسلم ترے سرو قیامت سے اک قد آدم

قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

جو ہے حیرت آئینہ تجھ کو پیاری تو اس سے بھی بڑھ کر ہے حیرت ہماری
فقط اک نگہ کی ہے امیدواری تماشا کر اے مومن داری

تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

رہے ہجر میں رات بھر گرم نالے گئے قافلے جانبِ عرش ان کے
نہ ہوتا نشان تو نشان بھی نہ پاتے سراغِ توفیق نالے داغِ دل سے

کر شبرو کا نقش قدم دیکھتے ہیں

نہیں رکھتے مرزا کسی سے مطالب نہ دل جانبِ عیش دنیا ہے راغب
تمنائے زر ہے نہ دولت کے طالب بنا کر فیروں کا ہم بھیس غالب

تمنائے اہل کرم دیکھتے ہیں

جلتا ہوں ان کی گرمیِ قہر و عتاب میں کیونکر مرے نہ پاؤں غلابِ عتاب میں
پوچھو نہ مجھ سے گرمیِ دوزخ کے باب میں ملتی ہے خوشے یار سے نارِ التہاب میں

کافر ہوں گر نہ ملتی ہو لذتِ غلاب میں

لے جاؤ گے صوفیہ پر

آیا ہوں درد و غم کے لئے انتخاب میں دن زندگی کے کاٹ رہا ہوں غلاب میں

ہوں غم و دلاز سے اس پہنچ و تاب میں کب سے ہوں کیا بتاؤں چہاں خراب میں

نہہائے ہجر کو بھی رکھوں گھر حساب میں

کیا کہتے ہوتی تھی شب غم کس طرح بسر اختر شمار یوں ہی میں ہو جاتی تھی سحر

توڑا ستم یہ اور نیا چشم شوق پر تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر

آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

آنکھوں میں پیشتر ہی نہ تھا نیند کا گزر کرتا تھا صبح ہجر میں سر پیٹ پیٹ کر

غفلت جو روتے روتے ہوئی شب کسی قدر تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر

آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

نکھ تو دیا انہیں کہ مرا حال ہے زبوں ہے ان سے آرزوئے تسلی تزا جنوں

آگاہ ان کی عادت و خصلت و خوبیوں قاصد کے آتے آتے خط اکا اور نکھ رکھوں

میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے تو امیں

رہتے تھے ہم پیالہ جہاں ان سے خاص عام اٹھنا تھا ایسی بزم سے میں روز نشہ کام

پینے میں آج مجھ کو نہ ہو کس طرح کلام مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا و کجام

ساتی نے کچھ ملانہ دیا ہو شراب میں

لے تا یہ آتش و دھنچا اہتاب منہوں کا مٹ کر نہا۔ فرماتے ہیں محبوب کی بد خوئی بھی میرے لئے سامان راحت ہے۔ دوزخ

کا آگ بھی نکل دینی اور بھرنے میں اس کی خوشی سے مست بہت کر سکتی ہے اس لئے یہ بھی میرے لئے سامان راحت ہے اگر میں

ایسا نہ سمجھوں تو کافر ہوں عشق کا ایمان یہی ہے ۱۲۰

آنکھیں بھی راہ میں جو بچھاتا ہوا چلے ممکن نہیں کہ مکروفسوں غیر کا چلے
چالیں ہزار بار سے یہ پردغا چلے جو مکروفا ہو فریب اس پہ کیا چلے
کیوں بدگمان ہوں دوست دشمن کے بائیں

دھڑکا مجھے تو یہ ہے کہ دشمن نہ امے جاتے ہوئے تمہیں مے گھر سے نہ دیکھ لے
تم ہنستے ہنستے ہو گئے خاموش کس لئے میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ قریب سے
ڈالاجے تم کو وہم لے کس بیچ و تاب میں

وہ آن میرے گھر جو چلے آئے مستے شکر خدا کہ ہو گئے قصے تمام طے
جاتے لے وصال کا وعدہ بھی کر گئے میں اور خط وصل خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بول گیا اضطراب میں

سیردہ کچھ اثر ہیں نمایاں عتاب کے لیکن ہیں چپ خیال سے شرم و حجاب کے
آثار بات بات میں ہیں بیچ و تاب کے ہے تبوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرف نقاب میں

آنا ہے یوں تو ان کو لڑانا نگاہ کا نظر میں بچا کے سب کی ملانا نگاہ کا
آفت ہے اُف مگر نہ اٹھانا نگاہ کا لاکھوں رگ و ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

لے لٹاؤ سے ٹاؤٹ یا محبت مرا جے۔ فرماتے ہیں دوست کی لاکھوں لگاؤ میں ایک طرف اور نگاہ کا چرانا ایک طرف۔ اسی طرح مصرع ثانی میں لاکھوں بناؤ سنگار ایک طرف اور غصہ میں بگڑنا ایک طرف۔ دونوں مصرعے ہم اند اور لاجواب ہیں۔ عاشق و معشوق کے درمیان ہمیشہ ایسا ہی گزرتا ہے معشوق کی (باقی ص ۹۷)

وہ نالہ جو کہ عرشِ معلٰی کو بھی ہلائے وہ نالہ جو زمین کو بھی زلزلے میں لائے
وہ نالہ اور کان تک اس شورخ کے بجائے وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے

جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

جادو وہ چیز ہے کہ جو اس کو عمل میں لائے مشکل سے مشکل امر کو آسان کر دکھائے
لیکن مجھے یہی تو ہے افسوس ہائے ہائے وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے

جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

تھے یا رنگ پیالہ ہمارے سبھی کبھی دیکھا نہ ہم نے ہوش میں مہرزا کو بھی کبھی
وہ دن کہاں کہ شغل سے فرصت نہ تھی کبھی غالب جھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی

پیتا ہوں روزِ ابرو شبِ ماہِ تاب میں

۵۵

جامِ سبو کو رکھ نہ بچا کر سحاب میں شامل نہ کر صبوحی کو شب کے حساب میں
وہاں کچھ کمی نہیں کہے تو اضطراب میں کل کے لئے کر آج نہ خستِ شراب میں
یہ سوئے فتن ہے ساقی کو تر کے باب میں

گردِ شہ سے پیوست نہ لگاؤٹ عاشق کے لئے بہت بڑی چیز ہے اور عاشق کی نظر میں مکہ چرانا لگاؤٹ سے بھی زیادہ
دل فریب ایک طرح معنوں بناؤ سنگار میں مہابت و دل فریب ہونا ہے مگر اس کا عہد سے مجھڑا انکے بناؤ سے بہرہ دار ہونا ہے؟
مولانا آئندہ جو بیہوشہ سادہ کلام کو پسند کرتے تھے اور عائشہ کی پیروی گوئی پر حرف رکھتے تھے اس شو کو سنکر نہایت
خوش ہوئے مگر طرزِ بطور مزاح یہ کہا یہ تو ہماری طرز کا شعر ہے اس میں غالب کی کون سی خوبی ہوئی۔ ۱۳

یا تو ملائکہ سے بھی مخامخ مرتبہ بلند ہم سا نہیں ہے یا کوئی اب خوار و مستمند
 پہونچا رہا ہے ہر تنفس میں گزند ہیں آج کیوں ذلیل کر کل تک تھی پسند
 گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

آہرے کیوں روح کا قالب سے انزع کیوں بڑھ کے کرب سانس کا ہونا ہے انقطاع
 سنے سے اسکے کہتے ہیں کیوں ہوش اوداع جان کیوں نکلے نلگتی ہے تن سے دم سماع
 گر وہ صدا سمانی ہے چنگ و رباب میں

کہتے ہیں صاف صاف یہ انداز چال کے لینا نہیں دم سے ادھر دم کہیں اسے
 بے اختیار ہوں کہیں مجھ کو گرانہ دے رو میں ہے رخس عمر کہاں دیکھے تھے
 نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

کی لاکھ فکر ہستی آشیاب میں پے پے قصہ ہوانہ ان کے وجود و عدم کا طے
 جہنم میں بتلا ہوں کہ میں بھی ہوں طرفشے انسا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
 ہنسا کہ وہم غیر سے ہوں بیچ و تاب میں

ایجاد کیا کہ موجد و وجود ایک ہے سب معبدوں میں عابد و معبود ایک ہے
 کیا ذکر سجدہ ساجد و مسجود ایک ہے اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
 جہاں ہوں پیر شاہدہ ہے کس حساب میں

موج و حباب میں ہے مقرر وجود بحر ان کا وجود بھی ہے سراسر وجود بحر
 کہنے انھیں عرض تو ہے جو ہر وجود بحر ہے مشتمل نمودِ صورت پر وجود بحر

یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
 بیٹے ہیں تانہ حسن سے ہم کو ہوا لگی
 بے رہروں کے واسطے سامان گوی
 جب چھپ سکے نہ ذات سے پرے کی کیا رہی
 شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے ہی
 ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں
 گو خود نما نہیں ہے وہ پردہ نشیں ہنوز
 نظارگی نہیں کوئی اس کا کہیں ہنوز
 ہے بخوناز خود بھی وہ ناز آفریں ہنوز
 آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
 پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں
 اشیا کی ہے تصور اشیا سے سب نمود
 دیکھا جو غور سے تو خیالی ہیں سب جود
 استی کی ولہے کی ہڈت پرست بود
 ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
 ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
 مرزا کو ایک عمر سے ہے جستوئے دوست
 کچھ آرزو نہیں ہے بحر آرزوئے دوست
 آنکھیں ہیں بخشش کی طرف دل پر سوائے دوست
 غالب بنیم دوست کراتی ہر لوئے دوست
 مشغولِ حق ہوں بندگی بو تراب میں

کس طرح روکوں گریہ شام و سحر کو میں
 کس کس کے سچ و غم میں کھپاؤنگا سحر کو میں
 رولے میں روزِ بیٹیوں کہیں چشمِ ترکو میں
 جیراں ہوں لکھو روؤں کہ بیٹیوں کے ترکو میں

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوم گزر کو میں

مانا نہ دل سے تیرا چہ دشمنوں کو دوں آگاہ تیرے نام سے اغیار کو کروں
آوارہ و خراب تری جستجو میں ہوں چھوڑا نہ رشک لے کر تیرے گھر کا نام لوں

ہراک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

جس راہ میں قدم کا بھی رکھنا تھا ننگ عار طے سر کے بل کیا اسے اللہ رے اضطار
دم بھر کو بھی تو دل لے نہ لینے دیا قرار جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار

اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں

آہ میرے قتل کو کس زعم پر ہوئے انجان تم نے جان یا جان من مجھے
دھمکی میں تو وہ آئے نہ معلوم ہو جسے ہے کیا جو کس کے بازو ہو گے میری بلا ڈرے

کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کر کو میں

میں جانتا تھا مجھ کو فقط ان سے کام ہے لغت ہو یا سوا سے تو سودائے خام ہے
اس پر بھی ہے بہ قدر تو میرا سلام ہے لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ نام ہے

یہ جانتا اگر تو سنا تا نہ گھر کو میں

کرتا ہوں سو قدم بھی اگر طے نہ تو کیسا تھ یعنی ہراک قدم پہ ہوں کہ خضر نو کیسا تھ
آہستہ رو کے ساتھ کبھی تیرو کیسا تھ چلتا ہوں تھوڑی دور ہراک رو کیسا تھ

پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

ہر چند بت کدوں ہی میں سب عمر دی گزار لیکن خدا گواہ کہ ایماں ہے برقرار

ہاں شوق دید کا تو ہوں بیشک گناہگار خواہش کو محنتوں نے پرستش دیا قرار
 کیا پوچھا ہوں اس بہت بیدار کو میں
 پھر گم ہوا تلاش میں اس کی میں دلفگار ہوش و حواس پر نہ رہا پھر کچھ اختیار
 پھر سچی و جستجو کا جنوں سر پہ ہے سوار پھر بخودی میں بھول گیا راہ کو تے یار
 جاتا دو گرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں
 پرسانِ حال کوئی ہنر کا نہیں رہا باقی جہاں میں قدر ہنرور نہیں ذرا
 مجھ کو یہ زعم اب بھی ہیں گاہک ہزار ہا اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا
 سمجھا ہوں دلپذیر متاع ہنر کو میں
 مرزا میری دعا بھی یہی ہے بعد نیاز دیکھوں جمالِ بار میں اے رب کار ساز
 جس طرح پہلے کہہ گیا ہے اک سخن طراز غالبؔ خدا کرے کہ سوارِ سمنند ناز
 دیکھوں علی بہادر عالی گہر کو میں

اے مقطع میں اب علی بہادر خاں والی باندہ کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے مرزا غالب کو اپنے یہاں مدعو کیا تھا
 ایک خط میں انوار الدولہ رفعتی کو یوں تحریر فرماتے ہیں میرے باندہ ہندیل کھنڈڑ آنے کا میں نے سب سامان کر لیا
 ڈاک میں روپیہ ڈاک کا دے دیا قصہ بہتہا کہ فتح پور تک ڈاک میں جاؤں گا وہاں سے نواب علی بہادر کے ہاں کی
 سواری میں جا کر باندے میں ہفتہ بھر رہ کر کالمی ہوتا ہوا آپ کے قدم دیکھتا ہوا سبیل ڈاک دلی چلاؤں گا
 ناگاہ مصور والا بیمار ہو گئے (ظہر بادشاہ) اور مرض نے طول کھینچا وہ ارادہ قوت فعل میں آیا۔

کون کہتا ہے خفا مجھ سے وہ مغرور نہیں کینہ و بغض جو مجھ سے ہے وہ متور نہیں
 لے سکے نام مرا کوئی یہ عقدور نہیں ذکر میرا بدی بھی اسے منظور نہیں
 غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں
 بعد اک عمر کے بیدار ہوا طالع شوق خوش نصیبی ہے کہ چرکا تو ذرا طالع شوق
 آج تو برسرِ یاری ہے مرا طالع شوق وعدہ میر گستاں ہے خوشا طالع شوق
 مردہ قتلِ مقدر ہے جو مذکور نہیں
 ہے فقط نقطہ موہوم اگر ہے عالم دہن اس شونخِ دل آرا کا مگر ہے عالم
 وہم ہی وہم ہے گو پیشِ نظر ہے عالم شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم
 لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں
 غور سے دیکھ اگر رکھتا ہے چشمِ باطن تجھ پہ کھل جائے گا یہ عقدہ مشکل کُن
 جزو ہو کل سے جدا یہ نہیں ہرگز ممکن قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
 ہم کو تقلیدِ تنگِ ظرفی منصور نہیں

لے عاتب صاحب نے ایک خط شاہِ عالمِ ہاروی کو لکھا :-

مشفق، کرمی! چودھری عبدالغفور صاحب کو میرا سلام کہئے گا اور یہ پیغام پہنچائیے گا کہ حضرت صاحبِ عالم
 کی تنائے دیدار بقیدِ بارہ کتابہ اس سے ہے کہ اور کسی کا بھی دیدار مطلوب ہے۔ خواہش وصلِ مقدر کو جو نہ کر
 نہیں۔ معروضاتی ترمیم کے ساتھ لکھا۔

وائے ناکامی امید کہ ہمت نہ رہی ہار غم جس سے اٹھاتے تھے وہ قدرت نہ رہی
خوصلہ دل کا ہوا پست وہ جرات نہ رہی حسرت لے ذوق خراپی کہ وہ طاقت نہ رہی
عشق پر عہدہ کے گوں تن رنجور نہیں

ہنس کے کہتے ہیں گئے آپ اگر جنت میں ہوں غے غلمان ہی غلمان ہاں یا چوریں
کچھ تعجب نہیں جو آپ وہاں چور ہیں میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں نصیب
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم چور نہیں

یہ تو ممکن نہیں تو دل سے مجھے بھولا ہو ہاں جو اغماض سے لے کام تو چارہ کیا ہو
کچھ بیان بھی رہے یاد کا تو اچھا ہو ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو
تو تغافل سے کسی رنگ میں معذور نہیں

لے خوش از ہم طرب جس میں ہم ہیں ہم لوگ دافح رنج و الم دشمن غم ہیں ہم لوگ
آج تک راہرو نقش قدم ہیں ہم لوگ صاف ورد کی شہ پیمانہ ہم ہیں ہم لوگ
وائے وہ بادہ کہ افشردہ انگور نہیں

ہے فدای مرے نکتوں کا فدائی غالب میری حکمت کا شاگر ہے شنائی غالب
پوچھو مرزا سے مری نغمہ سرائی غالب ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب
میرے دعوے پر یہ جہت ہے کہ مشہور نہیں

قابل رجز فغان دل ناشاد نہیں آہ وزاری یہ مری لائق ایراد نہیں
ہے فقط یاد دہانی کوئی فریاد نہیں نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں

ہے تقاضا، جہاں شکوہ بیدار نہیں
 عاشقوں کو نہیں محبوبے جاں بھی محبوب
 ہاں سمجھتے ہیں رضا جوئی دشمن محبوب
 ننگِ عشاقِ مخافہاد کا بیجا اسلوب
 عشق و حروری عشرت گہر و کیا خوب
 ہم کو تسلیم کنو نامی فرحاد نہیں
 رقصی نغمی خانہ نشینی تنگ دوسے فروم
 اب کاوٹ دم و حشت ہر نہ دل ہے مغموم
 گویا ہاں میں ہے آبادی و رونقِ مقدم
 کم نہیں وہ بھی خرابی میں یہ وسعت معلوم
 دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھریا د نہیں
 بر تغیر سے زمانہ کے ہے عبرت مطلب
 دور اس کا سبق آموزی عالم کا سبب
 یہ مودب وہ ہے جو خوب کھانا ہے ادب
 اہل بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
 لطمہ موج کم از سیلی استاد نہیں
 کس خموشی سے توجہ لائے ہم جو رجوا
 آہ و نالہ کو کیا ضبط سمجھ کر شکو
 پھر بھی سمجھانہ تم گارے پا بند رضا
 وائے فرومی تسلیم و بداحالِ وفا
 جانتا ہے کہ ہمیں طاقت فریاد نہیں
 اشیانے سے قدم اب تو نکال اپنا کہیں
 اب نہیں ہے وہ زمانہ کہ رہے گوشہ نشین
 شکر کراں کوئی دام نہیں فرشِ زمیں
 بدگل کے تلے بند کرے بے گل چیں
 مرده اسے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں
 دل کے لینے کو تو ہر دم تھا تقاضا لا لا
 بوسہ مانگا تو بہ تکرار یہ بولا لا لا
 ف خوب گل چہرے اڑا کوئی حرام ہی نہیں۔

مقا تو معدوم دہن لانے معما کھولا نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا
 دی ہے جائے دہن اس کو دم ایجا نہیں
 شبنم اس عشرت گلزار یگریاں کیوں ہے دیدہ نرگس حیرت زدہ حیراں کیوں ہے
 منقبض غنچہ گل وقت بہاراں کیوں ہے دیدہ نرگس حیرت زدہ حیراں کیوں ہے
 گر چراغان سر رہ گزر بار نہیں
 تم اگر بھول گئے اپنی حکایت غالب سن لو مرزا سے وہ پردرد روایت غالب
 ہو گئی سہو کی یہ کیا تمہیں عادت غالب کہنے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
 تم کو بے مہری یا ران وطن یاد نہیں

مرے عقائدِ راسخ میں کچھ فساد نہیں خدا نخواستہ میں منکرِ معاد نہیں
 غلط کہ یاد مجھے طولِ روزِ داد نہیں نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
 شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں
 یہ بات ساقیِ ہوش نے کیا بنائی ہے کہ ہو نہ ابر تو پیٹنے میں کیا برائی ہے
 ہمیشہ کیا اسی صورت سے پی پلائی ہے کوئی کہے کہ شبِ مر میں کیا برائی ہے
 بلا سے آج اگر دن کو ابر باد نہیں
 کریں رقیبِ برائی بھی تو بُرا نہ کہیں بھلائی لاکھ ہو مجھ سے مگر بھلا نہ کہیں

کبھی زباں سے کوئی کلمہ خیر کا نہ کہیں جو آؤں سامنے ان کے تو مرجانہ کہیں

جو آؤں پاس سے ان کے تو خیر یا نہیں

دل و ہجر غم و ایزدائے رشک بہتے ہیں سرشکِ خونِ جگر چشمِ تر سے بہتے ہیں

عرو کے ساتھ وہ مصروفِ عیش ہوتے ہیں کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں

کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

کھلا ہی رہتا ہے اٹھوں پہر فیضِ کباب اس آستانے سے ملتا نہیں کسی کو جواب

جو صرف راہِ خدا ہو نہیں کچھ اس کا حساب علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب

گدائے کو چھ میمنہ نامراد نہیں

رہے جہان میں ہم مبتلائے رنجِ مدام کھلی جو آنکھ تو دیکھانہ بزمِ غم و آلام

سنا نہیں کبھی ہم نے سرور و عیش کا نام جہاں میں ہوں غم و شادی ہم ہیں کیا کام

دیا ہے ہم کو خزانے وہ دل کشاد نہیں

اک التماس تو مرزا کی بھی سنو غالب کرو وہ بات نتیجہ بھی جس کا ہو غالب

خفیف ہو گئے یہ چھڑان سے چھوڑو غالب تم انکے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کر غالب

یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

روز مضمون نیا باندھتے ہیں روز مرہ بھی جدا باندھتے ہیں

تجھ کو ہم برق ادا باندھتے ہیں تیرے تو سن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں

نالا دل کی حقیقت کیا ہے کامیاب اس سے کوئی ہوتا ہے
چھیڑنا اس کو فقط منشا ہے آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے
ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

تجھ کو وہ چال ہے حاصل لے عمر دم میں لے کرتی ہے منزل لے عمر
تیری رفتار ہے کامل لے عمر تیری فرصت کے مقابل لے عمر
برق کو پار حنا باندھتے ہیں

بند کا جب کہ ہے بندہ مفہوم مرگ کی پھر ہے توقع موہوم
کیوں رہیں شوقِ اجل میں مغموم قید ہستی سے رہائی معلوم
اشک کو بے سرو پا باندھتے ہیں

سر میں رکھتا ہے نہ یہ نشہ مل نہ اسے نازش عشقِ بلبیل
ناز ہے حسن پہر اپنے باکل نشہ رنگ سے ہے واشد گل
مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

ان کی بندش کو سخن چیں مت پوچھ کس طرح لیتے ہیں تمہیں مت پوچھ
شعرا کی غلط آئیں مت پوچھ غلطیہائے مضا میں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

مجھ سے وحشی کا کیا کیا درماں ڈال دی پاؤں میں گویا جولاں
 چارہ گر اپنے ہیں کتنے ناداں اہل تدبیر کی دامانہ گسلاں
 آبلوں پر بھی حسا باندھتے ہیں
 تھے وہ مرزا ہی سے پیماں غالب ہم سے دھوکا نہیں آساں غالب
 ہم کو سمجھا کوئی ناداں غالب سادہ پر کار ہیں خوباں غالب
 ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

۶۱

جب تیری خاک رہ کی برابر نہیں ہوں میں کیا شکوہ سنچ جو مقدر نہیں ہوں میں
 بے تے میں سنگ در کا بھی ہمسر نہیں ہوں میں قائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
 خاک ایسی زندگی پر کہ پتھر نہیں ہوں میں

۱۔ خطِ بنام نواب کلب علی خاں۔ بعد تسلیم معروض ہے حب بادشاہ دہلی نے مجھ کو نوکر رکھا اور خطاب دیا اور
 خدمتِ تاریخ نگاری سلطینِ مہور رنجہ کو تعویض کی تو میں نے ایک غزل طرزِ تارہ پر بھی مقطع اس کا یہ ہے
 ”عالت و ظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دما۔ ۶۱“ اب مقطع کی صورت بدل کر حضور کی نذر کرنا ہوں خدا کرے کہ حضرت
 کو پسند آئے سے بوڑھا ہوا ہوں قابلِ خدمت نہیں اسد نہ خیرات خوار محض ہوں نوکر نہیں ہوں میں
 خط میں ایک قطعہ بھی لکھا تھا جس میں مقطع بدل دیا ہے۔ قطعہ حسبِ ذیل ہے۔ ۱۔

در برابرِ کلب علی خاں کے ہوں مقیم
 ستائے گئے ہر در نہیں ہوں میں
 بوڑھا ہوا ہوں قابلِ خدمت نہیں اسد
 خیرات خوار محض ہوں نوکر نہیں ہوں میں

ہو جائے مضطرب تو نہیں کچھ خطائے دل انصاف شرط ہے کہیں راحت بھی پائے دل
دن رات جو چرخ کہاں تک اٹھائے دل کیوں گردشِ ملام سے گھرا نہ جائے دل

انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

بیکار کیوں سمجھتے ہیں اہل جہاں مجھے نقصان کیا کسی کو ہے میرے وجود سے
سہواً نظم نہیں ہوں کہ معنی بدل گئے یارب مجھے زمانہ مٹاتا ہے کس لئے

لوحِ جہاں پر حرف مکر نہیں ہوں میں

تجویرِ قتلِ جرمِ الفت کے واسطے ہے ننگِ مدعیِ عدالت کے واسطے
یہ جو روِ ظلمِ اہلِ محبت کے واسطے حد چاہیے نزامیِ عقوبت کے واسطے

آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

حُفرتِ حقیر جانتے ہیں کس لئے مجھے بے آبرو کیا مری تقدیر نے مجھے
نسبت نہیں ہے کوئی جمادات سے مجھے کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے

لعل و زمرہ و زرو گوہر نہیں ہوں میں

اجرامِ چرخ بھی تو نہ فروم ہوں دریغ اور مجھ سے کہ تنگ ہو وہی جوں کا توں دریغ
بندہ نواز کس لئے آخر ہے یوں دریغ رکھتے ہو تم قدمِ مری آنکھوں سے کیوں دریغ

رتے ہیں ہر وہاں سے کمتر نہیں ہوں میں

گردِ دل نے بوسے پاؤں کے کس شوق سے لئے سر پر قدمِ تمہارے زمیں تک نہ لئے
یہ روک لو کہ ہے تو فقط ہے مرے لئے کرتے ہو مجھ کو منبعِ قدمبوس کے لئے

ہو گیا ہر چند پہلو سے جدا نکت جگر دیکھتی آنکھوں ہوا گم یک بیک نورِ نظر
دیدہ بے نور واسطے شوق سے اٹھوں پہرے قید میں یعقوب نے لی گونہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزِ دلیوارِ زنداں ہو گئیں

سیکڑوں قربانی رنگِ رقابت مر گئے ہیں زبانِ خلق پر دن رات جکے تذکرے
غیر کا نظارگی ہونا نہ چاہا عشق نے شہرِ رقیبوں سے ہیں ناخوش پر نہاں مہر
ہے زلیخا خوشی کہ مجھ ماہ کنعاں ہو گئیں

ہم کو یہ سمجھے ہوئے ہیں اس قدر بے ننگ نام ننگ ہے اندیشے ہم ہوں اگر ان کے غلام
خیر اگر چاہا خدا نے پھر تو بن جائے گا کام ان پر یزادوں سے لینے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے ہی حوریں اگر وال ہو گئیں

دل میں تو بیشک اترتی ہیں یہ چھریاں بدبار آں واحد کے لئے لیکن نہیں ان کو قرار
تیرہن کر آ رہی ہیں جاری ہیں برق وار وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یاربِ گبار
جو مری کوتاہی قسمت سے شرکاں ہو گئیں

دیدیا ہے اذن درباں نے تو کھا کر چیخ و نباح کم ہوا منیت سماجت سے مری امر کا غتاب

لے قاعدہ کے عاشق ہمیشہ قہر ہو گا خوش رہتے ہیں گمراہی سے مستی رہی معنی وہ معرکہ ورتوں کو دیکھ کر خوش ہوئے تو
زلیخا پر طعنہ زن تھیں کہ تو نے ایک غلام سے عشق کیا ہے۔ زلیخا نے انھیں اپنے گھروں کو کیا۔ جب وہ انہیں تباہ ایک لیموں
پھربک ایک جھری سب کے ہاتھ میں دے کر ہلاکت کی کہ جب یوسف انہیں تو مچھری سے لیموں کاٹ دیں مگر سب یوسف
ساتھ آئے تو ان کے حال کو دیکھنے میں اتنی غور ہو گئیں کہ سب نے انتہائی وارفتگی میں بجائے لیموں کاٹنے کے اپنی انگلی
کاٹ لی تب زلیخا نے کہا کہ تم مجھ پر طعنہ زن تھیں اب جن کا اثر دیکھ لیا۔

ہو گیا ہے سہل گو فعل میں ہونا بایاب واں گیا بھی میں تو انکی کا یوں کا کیا جواب

یاد تھیں جتنی دعائیں صرف رہاں ہو گئیں

کام اچھا دے گیا صبر و سکون انجام کار ورنہ پہونچی تھی یہ نوبت پیر بن ہوتا رتار

دل فغاں کرتا تو پھر ہاتھوں کو کیوں تار قرار بسکرو کا میں نے اور سینے میں ابھریں بار بار

میری آہیں بخیر چاک گر یہاں ہو گئیں

میکرے میں تشنہ لب جو زندہ کام آگیا چہ خیر آب بقا تک وہ مے اُشام آگیا

جی گیا جو کشتہ شمشیرِ آلام آگیا جاں فزا ہے باد جس کے ہاتھ میں جام آگیا

سب بیکریں ہاتھ کی گویا رگ جال جا گئیں

اپنے نصب العین ہیں جملہ مذہب بالقوم نقش ہیں دل پر تمام انکے قوانین و علوم

بچ ہیں اپنی نظر میں لاکھ ہوان سکی دھوم ہم موہ رہیں ہمارا کیش بے ترک رسوم

ملتیں جب مٹ گئیں اجزاء ایماں ہو گئیں

ابتلا میں تو بہت کچھ دل کو تر پاتا ہے رنج غمزدہ کی جان کو آٹھوں پہر کھاتا ہے رنج

ضبط و استقلال سے آخر تک آتا ہے رنج رنج سے ہو کر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج

منشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کڑاں ہو گئیں

دوستوار مرنے کا میرے کیوں راتے ہو مذاق یہ لہو رو نما بھی ہے آنکھوں کا حسن آفاق

۱۔ مضمون کو مزاحیہ انداز میں لکھا ہے ایک خط میں اس طرح لکھا ہے میری ہمدردی اسیج کا وقت ہے جاڑا تو بڑا

۲۔ آنکھ میں سائے رکھی ہوئی ہے دو حرف لکھتا ہوں آگ تاپتا جاتا ہوں آگ میں گرمی بھی مگر ہائے وہ آتش سال

۳۔ کب دو حرف پلے لئے فوٹو لگ چکے ہیں دو رنگی۔ دل تو نا ہو گیا۔

ہے شب بھراں کی تاریکی زیادہ دلوں کو شاق
 اٹک ٹوٹا نکھوٹ بنے دو کہے شام فراق
 میں یہ سمجھوں گا کہ دو شمعیں فروزاں ہو گئیں
 بزم میں جو ہنسیں نہ رہے راتیں اسکی ہیں
 صبح نظارہ میں کر دیتا ہے راتیں اسکی ہیں
 اس بھی وہ خوش نصیب ہے راتیں اسکی ہیں
 نیند اس کی ہے دماغ اس کے راتیں اسکی ہیں
 تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
 کس غضب کا ہے یہ طوفاں خیز و نا امان
 اس کی آنکھوں نے تو باندھا ابر باران کا سماں
 کر دیے اس نے بھی تمزاک کی طرح دریا رواں
 یوں ہی گرو تار ہا غالب تو اے اہل جہاں
 دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

وحشت ہے اور طاقت رقتا بھی نہیں
 دامن بقدر خلعت یک خار بھی نہیں
 ہمساجنوں زدہ کوئی نادار بھی نہیں
 دیوانگی سے دوش پر زنا بھی نہیں
 یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں
 ہو کر غریب و رطہ ترماں ابھر چکے
 یہ یاں جیتے جی ہے تو سمجھو کہ مر چکے
 دن اپنے جب کہ شوقِ قہاں گزر چکے
 دل کو بنا زحمت دیدار کر چکے
 دیکھا تو ہم میں طاقت دیدار بھی نہیں
 لے میں تجھ سے کرتے ہیں جو کسے راہ لے
 البتہ تجھ کو پا نہیں سکتے ہیں سست پے

ممکن کبھی ہوئی نہیں کوئی محال تھے ملنا تھا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

میں اک نحیف و زار ہوں، طاقت تو اس پر یہ دل کے ولولے پر شوقِ جاں تاں
حیرت یہ کہہ رہی ہے کہ اب جا بے کہاں بے عشقِ عمر کٹ نہیں سکتی ہے اویاں
طاقت بقدر لذتِ آزار بھی نہیں

سودائے سر پہ وجہ پراگندگی ہوش وحشتِ ابھارتی ہے کہ کرنا و خروش
ٹکڑوں ہائے کس سے کھائے جنوں کا جوش شوریدگی کے ہاتھ سے سر پہ وبالِ دوش
صحرا میں لے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

دشمن ہی کچھ عدا کو سمجھا کریں شرف پھرنے بھی دو جو پھرتے ہیں ان رات سر بکف
لیکن ہمیں جو بغض ہو کچھ بھی تو لو حلف گنجائشِ عداوتِ اغیار یک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

فریاد میں جو میں نے ہلا دی کبھی زبان قائم نہ پھر زمین رہے گی نہ آسمان
آساں میری آہ ہماں سوز کو نہ جان ڈرنا لہائے زار سے میرے خدا کو مان
آخر نوائے مرغِ گرفتِ یار بھی نہیں

ہے زخمِ زارِ سینہ کو بیٹاں سے روکشی زخمی جگر کو خنجرِ بڑاں سے روکشی
کرتا ہے اس کا تیر نظر جاں سے روکشی دل میں ہے یار کی صفِ ترگاں سے روکشی
تالا نڈ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

لیتے ہیں کام اداؤں سے آلاتِ حرب کا خنجر کی اور تیر کی حاجت نہیں ذرا
 کرتے ہیں خونِ خلق نہتے ہیں وہ تو کیا اس سادگی پر کون نہ مرجائے لے خدا
 لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
 مرزا جو بادشاہ تھا اقلیمِ شعر کا جس کا ہے ملک نظم میں جھنڈا اگڑا ہوا
 فرزا نہ کوئی ہو گا یہ غالب گمان تھا دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا
 دیوانہ گر نہیں ہے تو ہوشیار بھی نہیں

۶۴

رفوگرِ طرحِ شک ہو جلائیے ٹہری پن میں کہ بیٹھا ہے رفوگر نے مرے زخموں کے دم میں
 سمجھ لیتا جو ہوتی جھکو کچھ بھی آنکھ اس فن میں نہیں ہزخم کوئی بخنے کے درخور مرے تن میں
 ہوا ہے ناراضکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں
 دمِ نظارہ دیوار و درہوں قفِ جبرانی کہ اچھا رنگ لائی اشکِ چشمِ ترکی طغیانی
 ان آنکھوں کی بدولت پھر گیا امید پر پانی ہوئی ہے مانعِ ذوق تماشا خانہ ویرانی
 کہنا سیلاب باقی ہے بزرگِ پنبہ روزن میں
 کبھی ابرو کے سرِ مدقے میں قفِ تیغِ بزل ہوں کبھی زخمی نگا ہوں جراتِ خوارِ پیکال ہوں
 و فوہِ سوزن سے جلوہ گاہِ داغِ پہنان ہوں و دلِ بیتِ خانہ بیدار کاوشِ شہائے شرمال ہوں
 نیگین نام شاہد ہے مرا ہر قطرہ خوں تن میں

زپوچھو کیا بلا ہے تیرگی شہائے بھراں کی چمک فتنے کی ہے اس میں غیاہِ ہر خوشال کی
سیاری مات ہے بختِ سیر کی فردِ عصیان کی بیاں کس سے غفلت گستری میرے شہستاں کی

شبِ مرہو ہو کر کھدی پندہ بواروں کے روزں میں
ہنسی یاروں کی ایک نصیحت جھکو فرمائی ناب وہ جوشِ وحشت ہے ز فوطا ناکیبائی
سکوں سا ہو گیا دل کو گیا سامانِ رسوائی نکو ہش مانع بے ربطی شورِ جنوں آئی

ہوا ہے خندہ احبابِ بخیہ جیبِ ودامن میں
نہے تقدیرِ آئینہ کر یہ ہوسائے اس کے کہاں پیدا دیا شانِ خدا اس کے مقدسے
یہ حیرت ہے غیاپائی ہے کیا اسکی تکلی سے ہوئے اس جہر و ش کے جلوہ مثال کے آگے
پراشتال جو ہر آئینہ میں مثلِ درہ روزں میں

کروں کیا ہمتیہوں سے مری حالتِ خالفت مرا مذہبِ جدا سب مری ملتِ مخالف ہے
مجھے ڈالا ہے نا جنسوں میں کیا سمتِ خالفت نہ عالوں نیکوں یا بدہوں پر محبتِ مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلن میں جو خس ہوں گلشن میں

مقامِ نسکوہ کیا ہے درد اگر اکھوں نے جھکو ذریعے بھی بخشے درد کی برداشت کے مجھ کو
سبکو وشی نہ ہوگی اس کے آستانے جھکو ہزاروں دل دیئے جوشِ جنون عشق نے مجھ کو
سیر ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

خیالِ گیسوئے پرہیز میں پابندِ حولاں ہوں بتوئے دامِ کس یا ہواں کس سیرِ حاسماں ہو
اد پرانی مہرِ کرا کی طرح کیونکر نہ قرباں ہوں آسہ زندانِ تاثیرِ الفت ہائے خواہاں ہوں
حمِ دشتِ نوازش ہو گیا ہے طوقِ گردن میں

طمانیتِ دلِ اربابِ زریں خاک نہیں خیالِ زر کے سوا اور میں خاک نہیں
چٹو رہی ہے یہاں اور گھر میں خاک نہیں مرنے جہاں کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر سو جگر میں خاک نہیں

محال ہے کہ وہاں نجاتِ نارسا لے جائے کوئی اٹھا کے چین تک قفسِ مرا لے جائے
غرض ہے کیا اسے صیاد کی بلا لے جائے مگر غبارِ ہوئے پر ہوا اڑ لے جائے
وگر نہ تاب توں بال و پر میں خاک نہیں

ہوئے ہیں فرشِ زمیں گل بہار بے حد ہے کھر ادب سے سر راہِ مردِ خوش قد ہے
وجودِ عرضِ مرکبِ گلوں سے شاید ہے یہ کس بہشتِ شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیرِ جلوہ گل رہ گزر میں حناک نہیں

خوفِ کردل مجھے ہوتی تو یوں نہ گھل جاتا سنبھالتا کسی صورت سے اس کو بھلاتا
مجھے ہی جب نہیں پروا وہ کیوں نہ کھانا بھلا اسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا
اثرِ مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

کیا خدا نے نہ مجھ کو کسی سے شرمندہ ہوا کسی کی نہ منت کشی سے شرمندہ
نہیں ہر کچھ بھی تو ہوں اپنے جی سے شرمندہ ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیرِ گھر میں خاک نہیں

مدام طالبِ حسن المآب ہیں مے کش کسی کی یاد میں بلے ارباب میں مے کش
زمانہ کہتا ہے مست شراب ہیں مے کش خیال جلوہ گل سے خراب ہیں مے کش

شراب خانہ کی دیوار و در میں خاک نہیں

جو دیکھتے ہیں مضامین تازہ کی آمد مذاق اڑاتے ہیں مرزا تمام اہل حسد
کہا جب ہی تو یہ غالب نے ہو کے دق بید ہمارے شعر ہیں اب صف دل لگی کے اسد
کھلا کہ فائدہ عرض ہنریں خاک نہیں

۶۶

ہم سے نہ کہنے بار بار کہتے ہو جائے بانی کیوں اپنے ہی دل کو چھپے زخم بھر دکھائے کیوں
فرطالم سے خونِ دل اشک میں بہہ جائے کیوں دل ہی تو پورہ سنگ و خشت درد سے بھر جائے کیوں

روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

اکیس کسی کو فعل کیا ملکِ مد نہیں زمین سر پہ اٹھائے ہم اسے تو نہ جائیگے کہیں
اپنا نشاناں مٹائیں گے صورتِ نقشبانیہیں دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاناں نہیں

بیٹھے ہیں رہ گزر رہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

چشمِ بشر میں ہو اگر حسرتِ مہریم روز دیکھ سکے نہ بھر کے جی طلعتِ مہریم روز
تاب کہاں کہ ہو اسے رویتِ مہریم روز جب وہ جالِ دلفروز صورتِ مہریم روز

آپ ہی ہوں نظارہ سوز پرے میں منہ چھپائے کیوں

خوف سے تیسے روبرو انہیں سکتے ہر وہاں
 ہو سکتے ہو آئینہ کو بھی ڈال دے تو اگر نگاہ
 انکو کہاں یہ تاب ہے دیکھیں جوتیری جلوہ گاہ
 دشمنہ غمرہ جاں ستاں ناوک نا بے پناہ

تیرا ہی عکس رخ ہی سانس تیرے آئے کیوں

دہر میں شادی و الم اصل میں نول یک ہیں
 زندگي و محن ہم اصل میں و نول یک ہیں
 قطرہ آب آب ہم اصل میں و نول یک ہیں
 قید حیات و بند غم اصل میں و نول یک ہیں

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اُف اے عمر و کا سادہ پن گئی بواہوس کی شرم
 باندہ کر آیا تھا کفن رہ گئی بواہوس کی شرم
 ٹال گیا وہ تیغ زن رہ گئی بواہوس کی شرم
 حسن اور اس چہرے میں ظن رہ گئی بواہوس کی شرم

اپنے پر اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

ہم کو یہ جن کہ چھٹ جائے راہ صواب پس وضع
 اسکو یہ ضلالت دھرے ہو کچھ تو جواب پاس وضع
 مانع رکھ و راہ ہے خوف خراب پاس وضع
 واں وہ غور و غمز و ناریاں یہ جواب پاس وضع

راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلکے کیوں

میں ہوں تلاش یار میں کہتے ہو جس کو گم رہی
 بک نہ لگاؤ ہمدموں تم نے یہ بات کیا کہی
 اسکی جفا و جہر سے مجھ کو ہے خوب آگہی
 ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بیوفا ہی

جسکو ہر وجہاں و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں

کم ہوئی مے کشی نہ کچھ دورِ مدام بند ہیں
 بزم سے اٹھ گئے بسویا کہیں جام بند ہیں
 عیش و خوشی سے میرزا خاص نہ عام بند ہیں
 غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

روئے زار زار کیا سمجھئے ہائے ہائے کیوں

تو نے اشارے سے مجھے کیا یہ بتا دیا کہ یوں صاف جواب دے مجھے میرے سوال کا کہ یوں
چپ سے چپے کا کام کیا اب تو ذرا ہلا کر یوں غنچہ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کر یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

غمزہ جو اس کا دیکھ لے سینے میں پھر نہ دل ہے تار و کرشمہ دیکھ کر ہوش اڑ رہا ہے
تیغ نگہ اگر چلے ہو کے لہو جگر ہے پریش طرز دہری کیجئے کیا کہ بن کہے
اسکے ہر اک اشارہ سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

ہم و امید میں ہے کیا کہیں کس طرح جئے حسرت و یاس میں غرض مگر کہ دن گنوا دیئے
ہاتھ اٹھا اٹھلے کہ ہم دل سے دعا کیا کئے رات کے وقت ہے ساتھ قریب کو لئے
اے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

لی ہیں جگر میں چشکیاں طور جفا تو دیکھئے فہم کو جواب کیا دیا طرز ادا تو دیکھئے
کیسا حجاب اٹھا دیا شرو جفا تو دیکھئے غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھئے
سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

سکتے میں خاص عام ہیں عجب خیال یا رے ہونٹ سینے بھٹے سے ہیں آج تو اہل بزم کے
حکم سکوت بھی ہیں گو نہ دیا ہوش و خوں نے بزم میں اس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھئے
اس کی تو خاموشی میں بھی ہے ہی مدعا کہ یوں

کیا کہیں بزم یار میں بات ہی کچھ بگڑ گئی مفت میں ہو گیا مرن نہ نظر ستمی دل لگی
دیر تک ہنسی رہی بات بن آئی غیر کی میں نے کہا کہ بزم ناز چاہئے غیر سے تہی

سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں
اسکو دکھاؤ عشق کا ہوش و خروش کس طرح لائے زباں ہے حال دل شمع خموش کس طرح
شوق وہوس کریں یہاں دیدہ و گوشت کس طرح مجھ سے کہا جو مانے جاتے ہیں ہوش کس طرح
دیکھ کے میری بچو دی چلنے لگی ہوا کہ یوں

آمد و شد وہاں جو غمی طبع اسی میں شاد غمی تا دیر یار ہو گئے رد کی یہی مراد غمی
خاک میں بھی اگر ملا خاک بھی وقف یاد غمی کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد غمی
آئینہ دار بن گئی جہرِ نقش پاک یوں

عشق میں صدق ہو اگر اسکا مال ہے وصال جزو جو کل سے جاملہ ہو گیا ایک لک کا حال
وہ سکون و اتحاد کیوں نہ ہو پھر یہ اتصال گر تیرے دلیں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال

موج محیط آب میں ما لے ہے دست و پا کہ یوں
یوں تو ہیں ہند میں بہت فن سخن کے مدعی ہیں یہ جدائی بند شبنم طرز ادبے اور ہی
حق تو یہی ہے میرا ختم ہوئی سخنوری جو یہ کہے کہ رختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی
گفتہ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

ردیف (و)

(۶۸)

کچھ بات ہو بطر زمامت ہی کیوں ہو عزت ہے ہم کو خواہ اہانت ہی کیوں نہ ہو
کچھ رکھئے ہم سے دیں کدورت ہی کیوں ہو وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیئے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

ممکن نہیں ہے دل میں گزرا بساط کا دل میں وہ شوق و ذوق کہاں ارتباط کا
اب وہ نہ میں رہا نہ زمانہ نشاط کا چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاف کا
ہے دل پہ بار نقش محبت ہی کیوں نہ ہو

آزادگی کا اپنی مجھے مل گیا صلہ ٹوٹا ہے النجائے اعانت کا سلسلہ
شکوہ کسی کا ہے نہ کسی کا مجھے گلہ ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

لیں چٹکیاں جگر میں جو مجھ سے کبھی ملا چھڑا ہمیشہ شکوہ دشمن کا سلسلہ
کی بات بھی تو وہ کہ دیا جس گول ہلا ہے مجھ کو تجھ سے تذکرہ غیر کا گلا
ہر چند برسبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو

یکسوئی ہو بشر کو میسر یہ ہے حال اس کیلئے ہے غلوت و علوت کا ایک حال

تنہا بھی ہوتا نفس سے ریتی پریل وقال ہے آدمی بجائے خود اک محتر خیال

ہم انجمن سمجھتے ہیں غلط ہی کیوں نہ ہو

ہم انقلاب سے متاثر ہوں کیا مجال ہرگز نہ لیں ہزار سبق دے جہاں کا حال

وارستگی میں رتبہ وغیرت کار کو خیال ہنگامہ زربونی ہمت ہے انفعال

حاصل نہ کیجئے دہرے عبرت ہی کیوں نہ ہو

آزادگی جہان سے فزائگی نہیں کیا رم ہے اور چیز جو دیوانگی نہیں

دنیا سے بھاگنا کوئی مردانگی نہیں وارستگی بہانہ بے گانگی نہیں

اپنے سے کرنے غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

رکھتا ہے شاہراہ فنا میں قدم کوئی ہوتا ہے محو دل سے خیالِ عدم کوئی

اس فکرِ جاں گداز سے چھٹتے ہیں ہم کوئی ملتے فوت و صفت، ہستی کا غم کوئی

عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو

کرتے پھر ی رقیب چناں و چین اسد جاتے ہیں اسکے کوچے سے مرزا کہیں اسد

دیکھیں گے آپ قبر، ہماری وہیں اسد اس فتنہ نو کے دے اب اٹھتے نہیں اسد

اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

ستایا تو نہیں میں نے کسی مرغِ نوازن کو مجھے یوں دیکھتے ہیں جیسے دیکھیں اپنے جن کو

فغان کرتا ہوں میں جب یاد کرتا ہوں نشین کو قفس میں گرا چاہی جانیں میسے شیون کو

مرا ہونا برا کیا ہے نو اسنجان گلشن کو
یہ ماننا غیر صورت اشنا اس کا نہ حرم ہے مگر یہ روسیہ اس کے تجس میں تو ہر دم ہے
وجودِ غیر جب تک ہے تو مجھ کو کچھ نہ کچھ غم ہے نہیں مگر ہمدی آسان ہو یہ شک کیا کم ہے
ندی ہوتی فلا یا آرزوے دوست دشمن کو

بھرایا بخیر گرا دل بھی ظالم میہی حالت پر انڑ والا نہ اس منظر نے بھی تیری طبیعت پر
ہنسی آتی ہے مجھ کو تیرے دلوئے زنجبٹ پر نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اس جرات پر
کیا سینے میں جسے خونچکاں مژگان سوزن کو

ہوئی ہے کیا بلا دیوانگی عشق پر پوش میں کیا لائے سکوں مطلق تہیں قلبِ شوش میں
جنوں کی حرکتیں قائم ہو گئیں حالتِ غش میں خدا شرمائے ہاتھوں کو کر کستے ہیں کشتاں میں
مسمیٰ میرے گہ ہاں کو کبھی جاناں کے دامن کو

ہم اپنا غرقِ خوں ہونا بجا آساں سمجھتے ہیں رواں ہونے لگے پر تیغ کا آساں سمجھتے ہیں
نکلتا جانبِ مقتل ترا آساں سمجھتے ہیں ابھی ہم قتل گاہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شننا و جوئے خوں میں تیرے تو سن کو

رہا دستور آہن سے سناں و تیر بنے کا ہمیشہ مادہ اس میں رہا شمشیر بنے کا
زمانہ اب ہے اس کے لائق تو قیر بنے کا ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بنے کا
کیا میثاب کال میں جنبشِ جو ہرے آہن کو

مجھے کیا اہل سے ہرگز گھرے یا گھر کے کھل جائے
 دُر خوش آب پانی کی جگہ یا روز برسائے
 سینہ سختی سمجھتا ہوں اگر کالی گھٹا چھائے
 خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار اُرائے
 سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابلی سے برقِ خرمن کو

زہے قسمت کہ اسکے سامنے مثالِ جاناں ہے
 بتوں کو جان کر سگانِ کھیل دل و قرباں ہے
 اگر دیکھیں حقیقت میں تو وہ بکا مسلمان ہے
 وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایمان ہے
 مہبتِ خانہ میں تو کعبے میں گارو برہمن کو

پھر یا سرِ بخت شوقِ اجل نے چار سو مجھ کو
 لے پھرتی تھی در درِ جاں دہی کی آرزو مجھ کو
 رہی جلا دہی کی زندگی بھر جستجو مجھ کو
 شہادتِ بختی مری قسمت میں جو دی تھی جو مجھ کو
 جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

جو ہونا مالِ مٹھی نہیں دیکھو نگرِ خاک پر سوتا
 زرو گوہر کے ہونے کس طرح ٹھنڈے بگر سوتا
 متاعِ رفتہ رہ جاتی تو پھر کیا بے خطر سوتا
 نہ لٹتا دن کو تو کعبۂ ات کو یوں بے خبر سوتا
 رہا کھٹکانہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

مضامین کے خزینے بہتے ہیں سینے میں شاعر کے
 تہزینہ دار و مالک ہیں سمنورانِ ذخائر کے
 گہر کی قدر کیا ہے سامنے الفاظِ نادر کے
 سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے
 جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جاکے معدن کو

درا تھس کا اک زبان ہے فغفور ہیں غالب
 سکند کو بے خراسان بوسی ہیں غالب
 اسی دروازہ پر کھٹا ہے مرزا بھی جیس غالب
 مہ شاہِ سلیمان جاہ سے نسبت نہیں غالب
 فریبوں و جمل و بخت و دراب و بہن کو

سکر سنانی سن ہوئے اس خستہ تن کے پانو
جاتا کہاں کہ ہو گئے ایک ایک من کے پانو
کیا جانتا تھا وہ نہیں جھوٹے سن کے پانو
دی سادگی سے جان پڑوں کو کھن کے پانو
بیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو

جی میں ہے پوجئے بت نازک بدن کے پانو
جیسے بجاری پوجتے ہیں برہمن کے پانو
ہاتھ انیس کس طرح گراس پرفتن کے پانو
دھوتا ہوں میں جو پیئے کو اس سیم تن کے پانو
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

کہتے تھے اپنے نفس کو ہم نامر لے یہہ
بچتے تھے اس کے سایہ سے گو یا بلا ہے یہہ
اتارہ اب ہمارے لئے ہو گیا ہے یہہ
بھاگے تھے ہم بہت سوا ب اکلی لے یہہ
ہو کر اسیر دانتے ہیں راہ سزن کے پانو

سارا بدن ہے فرط جراثیم سے چورچو
عاجز ہوں دواؤ دوش سے تو کیا قصور
جراثیم کچھ علاج تو ان کا بھی کر ضرور
مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور
تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پانو

مدھاک لے صورت مدھک چارنگ
محاسن تھانہ کچھ بھی غم برقعہ و تگرگ
پھر ہو چلا ہے قبر میں وحشت کا ساز و برگ
اللہ کے ذوق دشت نور دی کہ بعد مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانو

گلاب کی شاخ شاخ ہوئی جام گل بکھن ہیں قمریوں کی تاک میں سب ہر وصف نصیب
 کس کس کی جان دیکھے ہمال ہوتلف بے جوش گل بہار میں یاں تنگ ہر طرف
 اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغ چین کے پائو
 ناز و نزاکت ایسی بھی دیکھی سنی نہیں رفتار کے خیال سے تھکتا ہے وہ حسین
 ظاہر ہیں سب تکان کے آثار ہمنشیں شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
 دکتے ہیں آج اس بیت نازک بدن کے پائو
 ایسا سخن شناس تو شاید سنا نہ ہو پڑھ کر سخن ظفر کا جوب چاٹنا نہ ہو
 مرزا یقین کیوں مجھے اس قول کا نہ ہو غالب مرے کلام میں کیوں کر مرزا نہ ہو
 پیتا ہوں دھوکے خمر و شیریں سخن کے پائو

یہ قدم رنجہ پاکیا کوئی کم ہے، ہم کو ان کا لانا ہی سرِ بزم کرم ہے، ہم کو
 خاکِ لوسی کا عجب شوقِ تم ہے، ہم کو واں پہنچ کر جو غش آتا ہے، ہم کو
 صدر آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے، ہم کو
 سر میں سودائے چمن ہے نہ ہوائے گلشن تیرے در سے بے ہمیں پائو اٹھانا بھی کٹھن
 لاغری وہ ہے کہ اک بال ہیں گویا ہر تن ضعف سے نقش پئے مور بے طوقِ گردن
 تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ دم ہے، ہم کو

آج ہمدرد زمانے میں کہاں پیدا ہے
ایک کا ایک کو ہو درد تو بے جا کیا ہے
غم سے جو واسطہ میرا ہے وہی دل کا ہے
دل کو میں اور مجھے دل نحو و فار کھتا ہے
کس قدر ذوق گرفتاری ہم ہے ہم کو

وائے غفلت کہ نہیں اتنی خبر بھی اب تو
سامنے کون ہے اور آپ نے دیکھا کس کو
ہم سے اب یہ وہ دانستہ ہو غماض ہو جو
جان کر کیجئے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

رہنے دیں دوست اسی طرح ہیں گوشہ نشین
سیر گزار سے دل اور بھی ہو گا غمگیں
کھائیے زخم جگر پر یہ ہمیں تاب نہیں
ریشک ہم طرحی و درد اثر بانگ حزین
نالہ مرغ چمن تیغ دودم ہے ہم کو

صاف ظاہر ہے کہ وعدہ تھا مگر صاف نہ تھا
وقت اصرار کھلا آکے نتیجہ اس کا
ایسی قسموں کا بھروسہ ہمیں کیونکر ہوتا
سراڑانے کے جو وعدے کو مکر چاہا
بنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

بے سبب شک رواں کا تو نہیں باز رہتا
عین جو ہے یہ ان کا کہ ہوا آنکھیں خونبار
نہ ہو روئیں تو مرقاں پر کہاں سے بہا
دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ ولیکن ناچا

پاس بے رونقی دیدہ اہم ہے ہم کو
داخل شکوہ سمجھتے ہو جو خاموشی کو
کیا کریں چین کسی طرح نہ جب لینے دو
حال کیا ہو جو کبھی نالہ پُر درد سنو
تم وہ نازک کہ خاموشی کو فضاں کہتے ہو

ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو
 عقل حیران ہے کس وجہ سے چوڑی دھلی
 کچھ تو ہے جس لئے طے کی ہے مسافت اتنی
 یک بیک چوڑی کیوں لغتِ راحت گھر کی
 ہمیں سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
 جب طے گھر سے تو تھی دلیں پیالہ دہی لہر
 بیٹھ رہنا ہیں اور ترک سفر ہے اک قبر
 قصہ ہے دور کا مانع جو نہ ہو گردشِ دہر
 مقطع سلسلہ شوق نہیں ہے بر شہر
 عزم سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
 آپ کی طرح ہے مرزا بھی کرم کا طالب
 دل کھینچا جاتا ہے اربابِ کرم کی جانب
 وجہ نقل و حرکت کیا کہوں مرزا صاحب
 لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
 جادہ رہ کیشش کا ف کرم ہے ہم کو

۷۲

کیا قابلِ خطاب وہی روسیہ ہو
 مجھ پر نہ بھول کر بھی کرم کی نگاہ ہو
 چاہو اسی کو دل میں اگر اس کی چاہ ہو
 تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
 مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گتہ ہو

سے غالب صاحب فوابِ علانی کو ایک خط میں لکھا "اشعار تازہ مانگتے ہو کہیں سے لاؤں۔ عاشقانہ اشعار سے
 مجھ کو وہ بعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔ گوشت کا بھٹا تھا بھی کرتا تھا خلعت پاتا تھا خلعت موقوف ہوئی متروک
 زغرل دمہ، ہنرل و بجومیرا آئیں نہیں پھر کہو کیا نکھوں۔ بوڑھے پہلوان کے سے پیچ تلنے کو (بانی ص ۳۱ پر)

الزام رکھ کے بغیر یہ کیا صاف ہو گئے گویا یہ خون ہی نہیں ذمہ جناب کے
 فرماتے ہو کہ قتل کیا تجھ کو غیر نے بچتے نہیں مواخذہ روز حشر سے
 قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

جس طرح قتل ونوں میں جس بے ہراس ہیں کیا وہ بگلیوں ہی دشمن جانِ اناس ہیں
 کیا یوں ہی ان کے شیفہ بھی وقفِ ملی ہیں کیا وہ بگلی بے گنہ کش حق ناشناس ہیں
 مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

مخل تمام ثنوفِ ستی میں ہے بے قرار تنکے ہیں غیر بھی ٹھہر بد سے بار بار
 یہ رشک کس طے دے رہے مجھ کو دلِ فگار ابھرا ہوا نقابہ میں ہے ان کے ایک تار
 مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

رکتانہ میکرہ سے تو رکھتا جگہ کی قید آزاد کے لئے نہیں زریبا جگہ کی قید
 وارستگی باہرے نو بے جا جگہ کی قید جب میکرہ چھٹا تو پھر ابا کیا جگہ کی قید
 مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

باقی ۱۲۹ کا - مٹا ہوں اگر اطراف و جوانب سے استعاراً جانتے میں اسرارِ باطلے میں باور کرنا اور مطابقت
 واقع سمجھنا تھا ہے، دیکھ کو دل مست یا ہمتا ہے اور تما لامر قود، اس پر ہے کہ تم یہاں اور کاش اپنے والد ابا کیساتھ
 چلے آئے اور مجھ سے نہ تم کا وہم کو میرے جورم و زہ ہے۔ مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہے۔
 لے جانی نے اس تعریفِ اتریں لوں گا ہے کہ سجدہ و سرور خانقاہ مساوی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میکرہ جہاں ولیفوں
 کے ساتھ سراسر پیے کا اظہر ہے اور وہی چھٹ گناہ سجدہ و سرور خانقاہ میں میٹھ کر لی لینے کی کوئی عار نہیں ہے
 ہے یعنی یہ مقامات اس تعقل کے بالکل لائق نہیں ہیں وہاں بھی میکرہ چھٹنے کے بعد یہی ہے سے انکار نہیں ہے اور
 حجاب پہنے کی تعریف نہ کرنا میں مقتضائے ملامت ہے۔ مراد غالب شوخی برتے سے بھی نہیں چوکتے یعنی مسجود مد
 اتناہ حالتِ عزت ہیں مگر حالتِ صاحبِ ان سب کو مساوی سمجھ لیا ہے۔ ۱۲

ہر چیز باغِ فلد کی ہے منتخب درست تور و قصور و شہدانا روعنب درست
 مشہور ہے کہ ہے وہ مقامِ طربِ رست سنتے ہیں جو بہشت کی توفیقِ سب درست
 لیکن خدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو
 سُونا نہ ہو گا دیس اگر ہم نہ ہوں کہیں ذاتی نہ کوئی گھر ہے نہ گھر کی کہیں زمین
 مرزا و جود شاہ ہے رونقِ فرائے دیں غالب بھی گرنے ہو تو کچھ ایسا فر نہیں
 دنیا ہو یا رب اور مرا بادشاہ ہو

۷۳

تمہیں نہ ضبط سے جب کام ہو تو کیونکر ہو تمہیں نہ فرصتِ تندرست ہو تو کیونکر ہو
 اب اس سے حضرت دل بات ہو تو کیونکر ہو غمی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو
 کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو
 حصولِ وصلت و دیدار تو ہے امرِ محال فقط ہے باعثِ تسکینِ تصورِ مثال
 امید و یاس کو سمجھا ہے آرزو کا مال ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
 کہ گرنے ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو
 کبھی خیال کا اظہار مدعا کیجئے کبھی یہ وہم کہ ہرگز نہ یہ خطا کیجئے
 کہاں تک اپنے مقاصد کا التوا کیجئے ادب ہے اور یہی کش مکش تو کیا کیجئے
 حیا ہے اور یہی گو مگو تو کیونکر ہو

تمہارا دل ہے کر رشک و حسد کا بغینہ بھرا ہی رہتا ہے بغض و نفاق سے سینہ
یہاں تک اپنے مقابل سے ہے تمہیں کینہ الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

وہ رشکِ ہر رہا رات بھر تو جلوہ نما نمود ہونے نہ پائی سحر کہ چیل نکلا
میری نگاہ میں اندھیر کیوں نہ چھل جاتا جسے نصیب ہو روز سیاہ میل سا
وہ شخص دن نہ کہ رات کو تو کیونکر ہو

یہ دُشمن ہے جس نے ہم کو لوسا تو تم نے غایتِ نخت سے سر کو ٹھکرایا
نہ شرم کچھ تمہیں بندوں کی ہے نہ خوف خدا تمہیں کہو کہ گزارہ صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو جو تمہاری سیخو تو کیونکر ہو

کریں گے حضرت دل خاکِ تمہاری قد ہونی نہ کچھ بھی ہماری سوائے خواری قد
از بکے ہوں وہاں ہم جہاں ہماری قد ہمیں پھر ان سے امید اور انہیں ہماری قد
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو

ہمیں تو آیہ قرآن تھا جو مضمونِ نفا بجا ہے ہم نے جو پڑھ کر کہا ہے آمنا
وفا ضرور کریں گے وہ وعدہ فردا غلط نہ تھا ہمیں خط پر گسانِ سلی کا
نہ مانے دیدہ و دیدار ہو تو کیونکر ہو

سکوں سے کام نہ لوں غطاب میں تو قصو مگر ہوں غبط میں اس فطر اسے مغزو
زمانہ بھر میں نہ مرزا سا پائے گا صبور مجھے جنوں نہیں غالب و لے بقولِ حضو
فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو (لے ماشیہ ص ۳۱۱)

جوتاب فسطح غم ہوا شک لکھو کس کیوں ہو کس دل کی بیٹابی کا در پرہ بیاں کیوں ہو
جو ہو درو آشنا تو شکوہ در نہاں کیوں ہو کس کو دے کے دل کوئی نوا سنج خفاں کیوں ہو
نہ ہو جبل ہی پہلوئیں تو پھر نہ مٹی باں کیوں ہو

وہ ہر سلسلہ توڑیں تو تم کب تک سے جوڑیں رہیں ہم بخود غارہ کہاں تک جب منہ موڑیں
خفا وہ ہیں ہوں ہم ترستہ تم کیس کو کیوں توڑیں وہ اپنی خود چھوڑینگے ہم اپنی غم کیوں چھوڑیں
سبک دہنے کیا پوچھیں کہ تم سے سرگراں کیوں ہو

چھپا رکھا تھا ہم نے اپنے دل میں راز الفت کو نہ کی اف جبر استقلال سے جمیلا ہر الفت کو

حاشیہ ۱۳۱ کا :- عرل ابوہریرہ کے ساتھ دلی کے ادوینا میں چھپی جب قلعہ مغلی میں مشاہدہ ہوا تو اس میں نیر غزل غائب صاحبِ طبع نے نزل کیلئے طرہٴ عینہ بادشاہ ظفر اکبر سے خط طبع میں مانتا ہے بادشاہ کے طرہٴ مصرع کو اس طرح نظم کیا ہے مجھے جنوں نہیں غائب ہے بقول حفصہ :- فراقِ یار میں سکین ہو تو کیونکر ہو۔

لے مرزا غالب نے غافل تہ کو نکھا کہ میں نے ان دلوں و غریبوں کی تھی۔ ایک تو دیا نہ ہو سو وہ آپ کے پاس بھیج چکا ہوں۔ دوسری غزل نہاں کیوں ہو گماں کیوں ہو اب بھیجتا ہوں۔ نیز دوسرے خط میں انھیں کو کھٹا :-

تم سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ بلا مگر کئی خطوں میں تم کو غم و اندوہ کا شکوہ گزار پایا ہے۔ پس اگر کئی بعد در پر نزل آیا ہے تو شکایت کی گنجائش نہیں ہے بلکہ یہ غم تو نصیبِ دوستانہ و غمِ افراش ہے بقول غالب :-
کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج خفاں کیوں ہو نہ ہو جب دل ہی سے میں تو پھر نہ مٹی باں کیوں ہو

ہے یہ شعر ہے

ہفتہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے ہوئے تم دوست جس کے دشمن اسکا آسمان کیوں ہو

خبر کیا تھی ہمارے دردِ پہنائی کی خلقت کو کیا غم خوانے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا زرداں کیوں ہو

نہ کرنے لے ہمیں وحشت میں سجدہ اپنی چوکت کا پہاڑوں تک کرے گارہری سودائے سراپنا
ہمیں ہے کچھ نہ کچھ تو چارہ جونِ جنوں کرنا وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر بھوڑنا ٹھہرا
تو پھولے سنگِ دل تیرا ہی سنگِ آستان کیوں ہو

نکل و سرور یا جس کا مفعول ذکر کر ہم دم کڑا دل کئے کسبِ طالت مجھ سے کہہ کر ہمد
یہ ہے پوچھنے پر تو نے تھا ماکوں بر ہمد قفس میں مجھ سے رو دا دین کہتے نہ ڈر ہمد
گری ہے بس پہ کل بجلی وہ میرا آئینا کیوں ہو

نظر بندی یہ کیسی ہے معا کیا ہے سمجھاؤ طبیعت کو عجب الجھن ہے اگتھی کو سلجھاؤ
اگر پردہ نہیں تیر نظر تو سب سے آؤ یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں لیکن یہ بتلاؤ
اگر دل میں نہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

کچھ ایسا ہی ہر انسان کی طبیعت کا اعضا ہے کہ یہ اپنی خطا کو غیر کے سر ڈال دیتا ہے
ہمیں ٹھہرے گنہگاروں میں یہ انصاف اچھا ہے غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو تو کس کلبے
نہ جھینچو گرم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

یہ رُخ کا آئینہ دنیا کی حیرانی کو کیا کم ہے پریشاں رُخ عالم کی پریشانی کو کیا کم ہے
نگاہ تیرا بنا زوں کی قربانی کو کیا کم ہے یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جسکے دشمن اسکا آسمان کہیں ہو

عنایت تم نے کی جس پر اسی کا ناک میں دم ہے ہوئے غمخوار جس غمگیں کے تم وہ طعنے غم ہے
تمہاری مہربانی میں بھی جلا دی کا عالم ہے یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جسکے دشمن اسکا اسم ل کیوں ہو

مصیبت رشک کی ظلم عدو دن رات بہتے ہیں تمہاری مہربانی سے پریشاں حال بہتے ہیں
ہنسی سوجھی ہو تمکو اشک نیا لکھوئے بہتے ہیں یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہوئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

ابھی آئے ابھی جلتے ہو جانا کس کو کہتے ہیں یہ آنا ہے تمہارا تو نہ آنا کس کو کہتے ہیں
کراں سمجھا ہے اس کو تو جلا نا کس کو کہتے ہیں یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہوئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

جو کہتا تھا بری ہے غیر کے گھر مغل آرائی تو ہنس کر مالتے تھے جھکو ٹھیراتے تھے سودائی
لگے اب بحث بھی کرنے جتا کر اپنی دانائی کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں سوائی
بلا کہتے ہو پرج کہتے ہو پھر کہنا کہ ہاں کیوں ہو

چلا جادو و جب مہرزا کا اسکے روبرو غالب کرے گی کیا اثر پھر خاک تیری گفتگو غالب
برہم اس ہے بے فائدہ کیوں جد و غالب نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہر ہاں کیوں ہو

رولف (ی)

(۷۵)

سب ریتوں کے ساتھ مراعات چاہیے آپس میں اتحاد ہو وہ بات چاہیے
 زندگی و زاہدی میں مساوات چاہیے مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے
 بھوں پاس آنکھ قبلہ حاجات چاہیے

رُخ کے قریب زلف کی ظلمات چاہیے دن سے ملی جلی ہوئی یہ رات چاہیے
 ہرنے کا اس کی ضد ہی سے اثبات چاہیے مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے
 بھوں پاس آنکھ قبلہ حاجات چاہیے

مصروف آپ مشق جفا میں تھے عمر بھر مطلق نہ تھی کسی دل مظلوم کی خبر
 بیٹھے ہیں اب تو ہاتھوں تلے بچے جگر عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک شخص پر

آخر تم کی کچھ تو مکافات چاہیے
 جرات تو دیکھ اس دل کو تارہ دست کی اس نامراد نے کبھی ہمت نہ پست کی
 اب غم ہے نیست کا نہ خوشی اس کو ہست کی وہ داد اے فلک دلِ حُسن پرست کی

ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے
 صورت کو ان کی روح جب اپنی ترس گئی تدبیر کارگر نہ ہوئی کوئی دید کی

اس سے زیادہ شکلِ رسائی کوئی نہ تھی یکے ہیں مہرِ فوں کے لئے ہم مصدق

تقریب کچھ تو ہر ملاقات چاہیئے

یہ لوٹتا ہے ثروت و اقبال و جاہ کو کرتا ہوں غافل اس سے دلِ عشق خواہ کو
سمجھا نہیں ثواب کبھی اس گناہ کو سے سے غرض نشاط ہے کس رویا کو

اک گونہ بخودی مجھے دن رات چاہیئے

بے کار شے ہیں ہم وہ محرک اگر نہ ہو ق مژرایہ راز وہ ہے جو پاتے ہیں راز جو
ہستی کا سب ظہور عدم سے ہے جان لو نشو و نما ہے اصل سے غالب فرس کو

فاموشی ہی سے نکلے جو بات چاہیئے

ہر باغ کی ہے باغ جہاں میں فضا جدا ہر گلستاں نے پائی ہے آبِ ہوا جدا
ہر گل کی بو جدا ہے روش اور ادا جدا ہے رنگ لالہ و گل و نسیم جدا جدا

نہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

سر میں اگر خودی ہے نہ نام بے خودی خود میں ہے تو نہ کر ہو سِ خام بے خودی
کر سجدہ شکر کا جو طے جام بے خودی سر پہ ہے خم پر چاہیئے ہنگام بے خودی

رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیئے

قائم ہو ایک حال پہ کس طرح آدمی کرنی ہے راہ طے اسے جذبِ سلوک کی
ہر فعل کی ہے حالتِ موجودہ مقتضی سر پہ ہے خم پر چاہیئے ہنگام بے خودی

رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیئے

خالی نہ ہو حقیقت عرفاں سے کوئی بات انسان حرفِ حرف سے پیدا کرے نکات
 نظارہ صفات سے ہو جائے خود ذات یعنی بحسبِ گردشِ پیمانہ صفات
 عارف ہمیشہ مست ہے ذات چاہئے

(۷۶)

ذرا سی جان تن میں، فدا کرنے کو ہوں وہ بھی رگوں میں جو ہو تھا ہے سرشک لالہ رگوں وہ بھی
 جگر رکھتا تھا لیکن اب ہے با حالِ زبوں وہ بھی بساطِ تجزیس تھا ایک ل اک قطرہ خوں وہ بھی
 سورتا ہے باندازِ چکیدن سمرگوں وہ بھی

یہ کیا کم مہربانی ہے کہ ٹالابا بات کو اس نے وگرنہ مفت میں لینے کے دینے پڑ گئے ہوتے
 خدا نا خواستہ دل سے نہ وہ روٹھنا نہ ہر ٹٹھے ہے اس شہ رخ سے آزر وہ ہم چندے تکلف سے
 تکلف بر طرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

نکالے کوئے اربابِ دل آخر مقدر نے کہ ہم ہوں منتظرِ پیکِ اجل کی آمد آمد کے
 طبیعت کو ذرا الجھاؤ سہاے اس تصور سے خیال مرگ کیا تسکین دل آزر وہ کو بخشے
 مے دامِ تمنائیں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

سرشکِ خوں بہانے سے تو تھا یہ دعا، ہم دم کہ دل کی آگ اس پانی سے کم ہو گی ذرا ہم دم
 مگر اس سے تو سوزِ قلبِ دونا ہو گیا ہم دم نہ کرتا کاش نالہ چہ کو کیا معلوم تھا ہم دم
 کہ ہو گا باعثِ افراتیشِ دردِ دروں وہ بھی

بجائے زور بازو پر جہاں تک اپنے اتراؤ
کرو تعریف اپنی سرخرو اس کو نہ ٹھہراؤ
میر مقتل زیادہ اس کے جوہر کو نہ چمکاؤ
نہ اتنا بریش تیغ جہاں پر ناز فرماؤ

مے دریائے بیتابی میں ہر اک موج خوں وہ بھی

توقع کیا سوال اس سے اگر اک دور کا کیجئے
مناسب ہے کہ اشک حسرت و ارباں پیایجئے
سبوح خالی دکھا تپے جو عرض مدعا کیجئے
سے عشرت کی خواہش ساقی گڑوں پر کیا کیجئے

لئے بیٹھا ہے اک دو چار جام وازگوں وہ بھی

امید و بیم میں مرزا ہوا اک مدت کو سرگرداں
نہیں بننے میں تاس سے ملے گا کوئی سامان
کسی صورت پر شکل دیکھنے ہوتی بھی ہر آساں
مے دلیں ہر غالب شوق وصل شکوہ ہجر اہل
خلا وہ دن کہے جو اُس کو میں یہ بھی کہوں وہ بھی

نکالے گی نہ چکر سے ہیں گردش زمانے کی
یہ گردش جہنم بھی ہر نہایت دل لگانے کی
زین پر لب کوئی صورت نہیں آرام پانے کی
غم دنیا سے گری پائی بھی فرصت ہر ٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

اسے اپنی پیش کا حال کچھ کہہ تو دیا یارب
مگر خط کو مہر وہ ٹہر بھی لے امیر کیا یارب
جلا ہی دے کہ سوز دل تو ظاہر ہو ذرا یارب
کھلے گا کس طرح مضمون مے مکتوب کیا یارب
قسم کھائی ہے اس کافرنے کا فہم کے ہلائے کی

اگر ہے وہ آتشبار نالہ آتش افشاں ہے نہیں چارہ کہ عالم آشکارا زہنہاں ہے
دباؤں یہ دیکھتی آگ کو نکر عقل حیراں ہے لیٹنا پر نیوں میں شعلہ آتش کا آساں ہے
دے شکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

کوئی بے کار ان کا جانب گلزار جانا تھا گلستاں کو مگر اس رنگ سے مقتل بنانا تھا
گلوں کو بھی نوپنے زخم خوردوں میں ملنا تھا انھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اٹھے تھے سیر گل کو دیکھنا شوخی مہمان کی

مقدر ہی میں تھا کچھ نتیجہ سے افسوس سزا پر مرنا بد انجامی تھی اپنی خوبی آغا ز پر مرنا
مناسب تو نہ تھا اس ظاہری انداز پر مرنا ہماری سادگی تھی السفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

غم دور اس کے شکووں حقیقت کش گئی اپنی طبیعت کی وہ قوت اور وہ جولانی غلطی
حسینوں کی اٹھائے بات کس کو تاج اتنی لکڑ کو پ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی
میری طاقت کہ ضامن تھی تو نکلے ناز اٹھانے کی

رہنے میں نہیں سچی محبت کا نشان غالب جنہیں کہتے ہیں فیضِ مرثیہ اب میں کہا غالب
بیانِ حال میں قاصر ہوتا زرا کی زباں غالب کہوں کیا خوبی اوضاعِ ابتداء زماں غالب
بدی کی اسنے جس سے ہنسنے کی تھی بارہا نیکی

زنداں سے بھی زیادہ برا یہ مکان ہے اک قبیہ میں پڑے ہیں معیبت میں جان ہے
یہاں نقطہ خیال زمیں کا نشان ہے کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضہ مور آسمان ہے

سیارے گھومتے ہیں فلک پر تیرے لئے اسباب اور کچھ بھی نہیں ان کی سیر کے
پکر دیئے ہیں چرخ کو تیری تلاش نے ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

بے چارہ دل حلاوت دنیا سے بہ تنگ ہو کیوں نہ چور چور کہ کھایا ہے سخت سنگ
اس سنگ ن کے وہم سے ہی میری عقل رنگ حالانکہ ہے یہ سیلی خارا سے لار رنگ
غافل کو میرے شیشے پر سے کاگان ہے

اپنا تو دل تھا آگ سے گویا بھرا ہوا کرتا قیام پھر وہ اس آتش کدے میں کیا
غالی تھا سوز و عشق سے ہاں دل قریب کا کی اس نے گرم سینہ اہل ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

کچھ بات جھک کے کان میں کہنا بہانہ تھا آخر کوئی سبب بھی تھا دامن کی آڑ کا
اب تم دھڑائی سے تو نہ جھٹلاؤ بر ملا کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

آنکھیں لگی ہیں جانبِ درانتظار میں تصویرِ سناخوش ہے شوقِ نگار میں
آیا ہے گشتِ کر کے ابھی قارزار میں بیٹھا ہے جو کہ سایہ دیوار یار میں

فرماں روا نے کشورِ ہندوستان ہے
غم نے لہو پلانے کا اچھا صلا دیا اک داغِ جاں گدازِ جگر پر لگا دیا
اس داغ نے تمام جگر کو جلا دیا ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغِ جگر کا نشان ہے

اس پر جو ڈالتے نہیں وہ قہر کی نظر ظاہر ہوا نہیں ہے بھروسہ رقیب پر
مڑنا کا بختِ برسرِ یاری ہے سر بر سر ہے بارے اعتماد و فاداری اس قدر
غائب ہم اس میں خوش ہیں کہ ناہربان ہے



یا تو میں کرتا تھا غمتِ آہ و زاری ہائے
اور تو کرتا تھا کچھ غمِ گساری ہائے
یادِ دمِ آخر جتنی شرطِ یاری ہائے
درستِ میرے ہے تجھ کو بے قرار ہائے
کیا ہوئی ظالم تری نفقتِ شعاری ہائے

دل کا دل ہی میں رہا کچھ بھی نہ نکلا حوصلہ
پستِ ثابت ہو گیا الفت میں تیرا حوصلہ
منہ چھپا یا تجھ سے بس اتنا ہی مال کیا حوصلہ
تیرے دل میں گزرتا تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے بھر کیوں کی تھی میری غمِ گساری ہائے

عہدِ تجھ سے زندگی بھر کے لئے تو لیا کیا خبر تھی زندگی نکلے گی تیری بے وفا
سامنے آیا مری تقدیر کا کھٹا ہوا عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا

عمر کو بھی تو نہیں تھی پائنداری ہائے اُنٹھ چکے ہیں جب کہ سامانِ بقائے زندگی
ہو پھر اس سے کیا خوشی کیا دل کو بھائے زندگی کون مر مر کر جسے چوٹھے میں جلے زندگی
زہر لگتی ہے مجھے اب وہ ہوائے زندگی یعنی تجھ سے تھی اسے ناساز گاری ہائے

ناز کی سے یاد مکتا تھا تر از رخِ پھول سا صورتِ برگِ خزاں یا اب ہے مرجھا یا ہوا
کس ہونے لے گلِ تر تجھ کو پتہ مردہ کیا گلِ فشنی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
فاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے

تجھ کو رہنا تھا ہمارے دیدہ نمناک میں یا مناسب تھا بنانا گھر دل صد چاک میں
خوبیشتنِ داری سے تیری آگیا دمِ ناک میں شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
نتم ہے الفت کی تجھ پر پڑہ داری ہائے ہائے

کامیابی اب کہاں ہے بات ہی اے دل گئی وہ بہارِ عاشقی وہ رونقِ مفضل گئی
عہد لینے کی وہ ساری سچی لا حاصل گئی فاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی
انٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

منہ چھپا یا فاک میں کیوں آخر کیا خیال کیا کسی پر ہو گیا ظاہر تے دل کا خیال
جب کہ رسوائی کا تھا ظالم تجھے اتنا خیال کیوں مری غمخواری کا تجھ کو یا تھا خیال

دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے

اوپر اوچھے وار جب اس نے لگائے بار بار
دکھ گئی نازک کلائی اور بازو شل ہوا
پھر بھلا کس طرح نکلے اپنے دل کا مدعا
ہاتھ ہی تیغ آنا کا کام سے جاتا رہا

دل پر اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے

کر دیا ہے بے طرح رنج و الم نے خستہ حال
موت کا آنا کٹھن ہے اور جینا ہے وبال
مج کرنا شام کا وقت زدہ کو ہے محال
کس طرح کاٹے کوئی شہائے تارِ نرنگاں

ہے نظرِ نوکر وہ اخترِ شماری ہائے ہائے

کون ہے اب سینے والا کس کہنے ایسا حال
دور کیجئے کس کی صورت کچھ کر دل کا ملال
کوئی دیکھے تو مری حیراں نصیبی کا کمال
گوشِ محرومِ پیام و چشمِ محرومِ جمال

ایک دل تس پریرنا امیدواری ہائے ہائے

نام گوشہ پر دنیا میں ہوا ہے نام و رنگ
حالِ منزل دیکھ کر اہل جہاں ہوتے ہیں رنگ
دل میں باقی تھی ابھی صحرانوردی کی انگ
عشق نے کھڑا نہ تھا غائب ابھی وحشت کا رنگ

رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے



کیوں قیدِ زندگی سے دل اتنا ادا ہے
جب اس سے چھوٹنا ہے تو پھر کیا ہر اس ہے
کہتے ہیں جس کو موت وہ ہر وقت پاس ہے
سرگشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے
تسکین کوئے نوید کہ مرنے کی آس ہے

پھر تاپے رات دن یہ پریشانِ ادھر ادھر اس کو نہیں قیام کبھی ایک حال پر
 وحشتِ زدہ کے حال سے اور غفلتِ اقدار لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر
 اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

جنات کو دکھائی نہ اس درد کی جملک محروم اس منزل سے رہے سر بسر ملک
 ہوں اس عطائے خاص جو منتِ کثر ملک کیجئے بیان سرورِ تپِ غم کہاں تلک
 ہر مو مرے بدن پر زبانِ سپاس ہے

ہوتا ہے مہمتوں ہی سے انسان بُرا بھلا محبت ملی بھی اس کو مگر کیا اثر کیا
 ہونا تھا آشنا دل سے حق آشنا بے وہ غرورِ حسن سے بیگانہ وفا
 ہر چند اس کے پاس دلِ حق شناس ہے

سودائی ہیں وہ جنگو بے مہیا سوا بستاناب انساں کو چاہیئے کہ پئے جائے بے حساب
 کرتا ہے خوب جذبِ رطوباتِ آفتاب بی جس قدر ملے شبِ ہتاب میں شراب
 اس بلغنی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

مزا پہلے دشت میں چاروں طرف اسد رولق فراواہاں ہے درختوں کی صفِ اسد
 دُشمنیں ہے باعثِ قدرِ صفِ اسد ہر اک مکان کو ہے مکین سے شرفِ اسد
 مجھوں جو مر گیا ہے تو جنگلِ اداس ہے

میری غمخواری پر بحث قلیل و قال ہے طلب کو میرے پائے کوئی کیا مجال ہے
کہتا ہوں سب مجھ اور زبان میری مال ہے گر خاموشی سے فائدہ اٹھائے حال ہے
نوشیوں کو یہ کیا بانی نہ مضمیٰ مجال ہے

اجہ جہ باہر سن کے دل کا رکھ زبان ہے برج ستار کا رکھ
سننا رکھ رکھ رکھ رکھ رکھ گوشت خانہ حسرت اٹھ رکھ رکھ
دارِ روضہ حریف زبان پائے لال سے

وارنہ کوپ سے نہ رہا رکھ کبھی مری ہوں کاش کبھی جلوہ آتش رکھ
مشاق سے کیا کرنا جان رکھ رہے میں پتا پتا پڑا رکھ رکھ رکھ
رجا کو یہ نہ رکھ رکھ رکھ رکھ رکھ

پر ہوا اس کی بچہ رکھ ہر شے ہو گئی سے لے کر ہر شے رکھ
رہے ہو وہ پوچھا رکھ رکھ سب سے لے کر اس سے وہ اور رکھ رکھ
سب سے لے کر رکھ رکھ رکھ رکھ رکھ

خوشی سے یہ رکھ رکھ رکھ رکھ رکھ یہ پورے دھبے ہتے ہیں نس و رکھ
انسان کے ہاتھ ہیں شب و آواز رکھ کبھی کبھی اس کے علم کے قدم سے رکھ

خاف نہیں سب دل سے رکھ رکھ رکھ رکھ رکھ
یہ رکھ رکھ رکھ رکھ رکھ

گردش کا میری اور ہی کچھ رنگ تنگ ہے گردوں بھی دیکھ کر مری حالت کو تنگ ہے
جوشِ جنوں میں یہ تنگ دو کی انگ ہے وحشت پہ میری عرصہ آفاق تنگ ہے

دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

مرزا کی طرح نفس کو سمجھائیو اتسد اس خواب پر نہ بھول کر اترائیو اتسد

دھوکہ نہ دیا ہر سے کہیں کھائیو اتسد ہستی کے مت فریب تی آجائیو اتسد

عالم تمام حلقہ دایم خیال ہے



غیر سے تجھ کو محبت ہی سہی تجھ سے دنیا کو الفت ہی سہی

تجھ پر انجیا کو سبقت ہی سہی عشق نہ بکڑی ہو وحشت ہی سہی

میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

کوئی ایسی خطا کی ہم نے جس سے لائق نہ رہے محفل کے

حاشیہ ۱۳۶ کا۔ مشکیں لاس کبہ کعبہ سیاہ فرسید، ارجاف، زب غزال ایک خاص قسم کا
ہرل جس کی ناف سے مشک نکلتا ہے اسے ناف غزال کہتے ہیں۔

ناف میں۔ زمین کا مرکز حضرت علیؑ کے دامن تھے۔ او۔ ان کے خلیفہ علیؑ۔ عاتق حضرت علیؑ کی
تولید کرتے ہوئے فرماتے ہیں یہ مات تمہور ہے کہ کعبہ وسط میں ہے یعنی زمین کا مرکز ہے لیکن یہ بات نہیں کہ
وہ ناف غزال بھی ہے۔ حضرت علیؑ کی ہر بانی سے کعبہ کے فضل کی توصیف تمام دیا میں پھیلیں، یہ ہے۔

سلسلہ کچھ تو لگائے رکھئے قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے

کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

ہے کہاں کی یہ بھلا دانائی کیوں ہے مرغوب تمہیں تنہائی

نہ جنونی ہوں نہ میں سودائی میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی

اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

عالم کن کو دبستاں سمجھو اس سے ملتا ہے سبق انساں کو

بھول کر غیر کا احساں نہ لو اچھی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو

آگہی مگر نہیں غفلت ہی سہی

ہے کہاں مثل شرر اسکو قیام گرم رفتار یہ رہتی ہے مدام

نہ توقف ہے نہ دم بھر آرام عمر ہر چند کہ ہے برق خرام

دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

رات دن عشق کا دم بھرتے ہیں رنج و ایذا سے نہیں ڈلتے ہیں

ان پر مرت کے لئے مرتے ہیں ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں

نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

۱۔ ایک حدیث ہے جس کا مہرور یہ ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا یعنی اپنی ہستی ہی سے خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

حضرت فائق فرماتے ہیں جو کچھ حاصل ہوا اپنی ہی اُستی سے ہونا چاہیئے۔ اگر اپنی ہستی سے معرفت حاصل نہیں ہو سکتی تو اپنی اُستی سے غفلت ہی حاصل کرنا چاہیئے۔ خودی مٹی جب مٹی خدائی۔ حاصل کلام پر کہ دوسرے کا احسان نہیں اٹھانا چاہیئے۔

شاد ہیں دور میں تیرے اہلاف اور ناشاد و حزیں ہیں انحراف
 اس قدر دین نہ ہوگی اہراف کچھ تو دے اے فلک نا انصاف
 آہ و فریاد کی فرصت ہی سہی

بحر میں غم کو ترے پالیں گے داد بھی اس کی کبھی پالیں گے
 جس طرح ہو گا یہ دن ٹالیں گے ہم بھی تسلیم کی خود ڈالیں گے

بے نیازی تری عادت ہی سہی
 کیا عجب ہے کہ وہ شرمائے اسد کچھ کرے رحم ترس کھائے اسد
 یہی مزا کی بھی ہے رائے اسد بار سے چھیر چلی جائے اسد
 گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

(۸۳)

آوازے رات غیر سحر تک کسائے دل کھول کر مذاق برابر کیا کئے
 پاکر خموش مجھ کو جو چاہا کہا کئے اس بزم میں مجھے نہیں بنتی جیا کئے
 بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے

بن کر فقیر میں ترے در پر اگر گیا در بان مجھ کو دیکھ کے غصے میں بھر گیا
 چپ چاپ میں جو تیری گلی سے گزر گیا دل ہی تو ہے سیاستِ دہاں سے ڈر گیا
 میں اور جاؤں در سے ترے بے صدا کئے

آئی ہے پھر چن میں بہارِ خمستہ پے
قسمہ ہوا ہے زبردِ ریائی کا آج طے
اس مہمان کی نجی خاطر عزیز ہے
رکھتا پھروں ہوں خرقہ و بجا دہ رہن

مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کئے

ہو دستیاب آدمی کو گرہِ عمرِ خضر
دانا کبھی نہ لے اسے دو گرہِ عمرِ خضر
لاکھوں ہی پائیں ایک نہ دو گرہِ عمرِ خضر
بٹے صرف ہی گزرتی ہے ہوئے رہِ عمرِ خضر

حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کئے

سپا امین اس کو سمجھتے رہے فہیم
اب وہ جوابات کہیں ہں نذرِ نسیم
سب مال اس نے ہضم کئے بے ہراس و بیم
مق و رہو تو خاک سے پوچھوں کہ لے لیم

توبہ وہ گہجائے گہراں مایہ کیا کئے

اے ات بے ہمایہ اے کئی بستجو
بہتان اٹھاتے رہتے ہیں ہنگامِ گفتگو
بھرتے ہیں مائے مائے تحسین میں کو بکو
کسی ریز تہمتیں نہ تراشائے عدو

کس دن ہمارے سر پہ نہ آئے چلا کئے

آخر بڑی کہاں سے اسے بمنشینِ خو
ہر گز کسی حسین کو زیبا نہیں یہ خو

ملہ حرد و سجادہ یعنی گودری و سنے دونوں کو رہیں رکھتے پھرتے میں دوسرے موم ہمارگی پس نظر ہے
گوناواری ہے پھر دونوں حیزوں سے کام لیتے ہیں۔ خوب شوخی دکھلائی ہے۔

ملہ حضرت خضر عیرواواں رکھتے ہی طرکیاں گاہ کہ وہ بھی قیامت کے روز یہی کہیں گے کہ ہم نے کچھ نہ کیا بے ہر
عمر گزار دی۔ عمر کے متعلق ایک اور شعر بھی کہا ہے یہ

وہ زندہ ہم ہیں کہیں روساں خلق لے حضر
نہ تم کہ چور سے غیر جاوداں کے لئے

رکھنا متقا پیشتر تو نہ وہ مر جیں یہ خو صحت میں بغیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسے بغیر التجا کئے

انکھوں میں یوں تو اور کئی دنیا میں نازیں لیکن نہیں ہے سادہ دل ایسا کوئی جس میں
پرہیز میں تو اس کو کہوں گانہ ہم نشیں حسد کی ہے اور بات مگر خوبری نہیں
بھولے سے اس نے سیکڑوں دے وفا کئے

مہر نے عرض حال کا پایا جواب کیا لوگ تم اپنی بات کا اچھا جواب کیا
چاہو نہ تم جواب تو اس کا جواب کیا خاکب تمھیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کئے اور وہ سنا کئے

۸۴

وحشت اثر حیات جہان شراب ہے مثل شر قیام کی یہاں کس کو تاب ہے
اس رہ گزرتیں جو ہے وہ پاد در کاہ ہے رفتار عمر قطع رہ اضطراب ہے
اس سال کے سب کو برق آفتاب ہے

یہ بزم سنیں رنگ نرالی بہار کے ہر جام پُر شراب گل تر ہے دیکھ لے
مرغ چمن کا ہے بطے پرگیاں مجھے سینا کے ہے سرو نشاط بہار سے
بال نذر و جلوہ موج شراب ہے

تھا دل کو شوق اک نگہ التفات کا معلوم تمھانہ حال ان آنکھوں کی گھات کا

طے ایک نیر میں ہوا قصہ حیات کا زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھلنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

دہر خراب میں ہے خرابات کی صفت مژدہ ہوئے نشوں کو نو مستوں کو تہنیت
جاگیر یہ وہ ہے کہ انھیں کوہے تولیت بادا و بادا نو ٹی زبداں ہے شش جہت
غافل گداں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

تارِ نظر کو کرتی ہے اس کی چمک فنا اس پر نگاہ ڈالے کسی کو ہے تاب کیا
آساں نہیں ہے ہر درختاں کو دیکھنا نظارہ کیا حریف ہو اس برق حسن کا
جوش بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے

پہلے ہی کچھ تو شوق میں تھا حالِ لبوں دیدار سے تو اور بھی اس کا بڑھا جنوں
اب اور ہی کچھ اس کو تمنابے کیا کہوں میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

جھڑتے ہیں پھول یوں تو لبِ زدا سے مرزا یہ گل مرے لئے کیا کم ہیں خار سے
یہ اور بات چیت کرے اس نگاہ سے گزرا اسد مسرت پیغام یار سے
قاصد پر مجھ کو رشک سوال و جواب ہے

وہ اگر میری تمنا پر ترس کھا جائے ہے سامنے آنکھوں کے برق حسن بچکا جائے ہے

خود بخود آنکھوں کے آگے خیرگی چھا جائے ہے دیکھنا قسمت کراپ اپنے پر رشک جائے ہے

میں سے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

لا نہیں سکتی ہے ہرگز تاب آتش کوئی شے ہوتے ہی دو آتشہ تیزاب ہو جاتی ہے

سوزِ پہناں بڑھکے قہر خود بخود کردیگا ہاتھ دھو دل سے ہی گرمی گرا دیتے ہیں ہے

آہیگنہ تندئی صہبا سے پگھلا جائے ہے

تھا مناسب کوئی تدبیر ایسی دشمن کی کسے گفتگو میں تانہ وہ ہر بار بے باکی کرے

کیوں دل اسکا بڑھے جب گزرتی کرے غیر کو کیونکر وہ یارب منع گستاخی کرے

گر چیا بھی اس کو آتی ہے تو شرم اچائے ہے

صبر کب تک کیجئے اور کب تنگ غم کھائیے تاب کے حال دل پُر درد سے دکھ پائیے

دل کو ضبطِ نالہ کی تدبیر کیا بتلائیے شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے

دل کی وہ حالت کرم لینے سے گھبرا جائے ہے

کیا مسرت خیز ہے اے دوست تیری بزمِ گاہ تو جہاں ہو پھر وہاں غم پانہی سکتا ہر راہ

واہ ہوتی ہے وہاں جا کر اگر کرتا ہوں ہ دوں چشم بد تری بزمِ طرب سے واہ واہ

لغم ہو جاتا ہے واں گرنالہ میرا جائے ہے

اے حضرت غالب نے یہ ایک نیا مضمون باندھا ہے وہ غیروں کے بجائے اپنے آپ سے ہی رشک کر رہے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ جب میں اپنے محبوب کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے آپ پر بھی رشک آ جاتا ہے لہذا میں اس رشک کی وجہ سے اس کو اچھی طرح دیکھ نہیں سکتا ہوں۔

ابک اور شرا ہی مضمون کہہ سہ ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے چہرے میں ملے انکی تمنا نہیں کرتے۔

ہم یکب کہتے ہیں ظاہر ہو کوئی انداز عشق یا ہمیں دنیا کہے وارفتہ و جانبا ز عشق
کیا کریں جب بدحواسی اپنی ہو غماز عشق گرچہ ہے طرز تعافلی پردہ دایر از عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

دشمنوں کے حال پر وہ آج کل ہے ہر یال کچھ ہماری بھی نے اتنی اسے فرصت کہاں
وہ ہے اور اٹھوں پہر اغیار کی دلداریاں اسکی بزم آریاں سنگرد دل زنجوریاں
مثل نقش مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

اک تو قدر نہ ہی لے اسکو ناز میں پیدا کیا اور اس میں تھا ہی کیا ناز و نراکت کے سدا
اور سونے پر سہاگ عشق کا آنا ہوا ہو کے عاشق وہ پری رخ اور مازک بن گیا
رنگ کھلنا جائے ہے بہتہ کا اڑتا جائے ہے

دیکھیے تصویر کی سبکبندی بھی افرو - سازیب اور عقین لب میں ظاہر جو ہر احوال ہیں
اللہ اللہ اکب کہنے میں ہی سوا ملا رہیں نفس کو اس کے مصویر پر ہی کیا کیا ناز ہیں
کہینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کہینچتا جائے ہے

رکھتے ہیں سر سے احباب طن بغض و حسد دیکھتے اس بلیسی کی بھی کہیں ہوتی ہر حد
تیرہ نختی لائی ہے کیا رنگ اللہ لصد سایہ میرا مجھ سے مثل دور جھلکے ہر اسد
پاس مجھ تڑش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

جاں نثاری کی تمنائے آب گل میں ہے کچھ تمنا اور ہی لیکن دل بسمل میں ہے
کیا کروں تدبیر بارب جان اک منگل میں ہے سادگی پر اس کی مہربانی کی حسرت ل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کف قاتل میں ہے

دل سے دل کورا ہے مجھ کو یقین ہرگز نہ نفا گفتگو کی آج کچھ اس نے تو عقدہ کھل گیا
کوئی میرے جی سے پوچھے اسکی باتوں کا مزا دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

قطع مجھ سے کر چکے وہ دوستی کا سلسلہ ان کی بزم عیش کے قابل کہاں ہیں غمزدہ
پھر بھی ہر دم کچھ نہ کچھ رہتا ہے میرا تذکرہ گریہ ہے کس کس برائی سے لے بائیں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

تو اگر چہا جائے گی ہم پر نصیبست ڈھانگی جب نہ ہو کا شغل دل پر اک قیامت آنگی
زندگانی بے مزہ کر کے مزا کیا پائے گی بس بھوم نا امید ی خاک میں جا جا سگی
یہ جو اک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے

ہم تو کرتے سر کے بل چل کر رہ مقصود طے بیٹھنے کا ضعف کرتا ہے تقاضا پلے بپے
پاؤں نے پکڑی زمین زنجیر پاپے کوئی نشے رنج رہ کیوں کھینچے واما ندگی کو عشق ہے
اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

دلِ رقیبِ روسیہ کا پیش کی منزل سہی ہم نے لومانا کہ ہم جلتے ہی کے قابل سہی
 سوزِ غمِ رگہائے تن میں خون کے قابل سہی جلوہ زارِ آتشِ دوزخ، ہمارا دل سہی
 فتنہٴ شورِ قیامت کس کے آب و گل میں ہے
 غبارِے نزدیکِ مرزا قابلِ قہر و عتاب پھر کیا اک بے گنہ کو کیوں گرفتارِ عذاب
 اُن مصیبتِ نکالِ اسکو کہ حالتِ ہر خواب ہے دلِ شوریدہٴ غالبِ طلسمِ پیچ و تاب
 رحم کر اپنی تنہا پر کہ کس مشکل میں ہے



خالی نہ تیری چشمِ کرم کی نظر گئی چمکی مثالِ برقِ ادھر آئی اُدھر گئی
 سینے ہی تک نہ صرف یہ آکر گزر گئی دل سے تری نگاہِ جگر تک اُنز گئی
 دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی
 وہ دورِ جامِ ہے نہ وہ ہے پرستیاں وہ بزمِ دلِ رہا ہے نہ ساقیِ دِلستاں
 سرخوش کہاں رخا ہے ہیں اتوں مگر اں وہ بادۂ شبنام کی سرمستیاں کہاں
 اچھے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی
 مدت سے آرزو تھی دل بے قرار میں پر ہوں تو اڑ کے جایئے بزمِ نگار میں
 مرکزِ پہنچ گیا ہوں میں اس رہ گزاریں اُڑتی پھرے ہے خاکِ مری کوئے یار میں
 بارے اب اے ہوا۔ ہو سی بال و پر گئی

کیوں کر بسائے ہم کو نہ پرواز نقش پا گھر کر رہا ہے دل میں ہر اک باز نقش پا
دلکش ہے کتنی طرزِ فسوں ساز نقش پا دیکھو تو دل فریبی اندازِ نقش پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کستر گئی

تھی خاص یہ روش کبھی مردانِ کار کی یہ وضع ہر وضع نے اب اختیار کی
جاتی رہی تمیز ہی اغیار و یار کی ہر لواہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شبنوہ اہلِ نظر گئی

عالم ہی اور ہے ترے حسنِ شباب کا مشکل ہے دیکھنا رخ پر آبِ تاب کا
بے سود و رائیگاں ہوا اٹھنا حجاب کا نظارہ نے بھی کام کیا وہاں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

بانا وہ مجھ سے ہاتھ چھڑا کر غضب ہوا ہر چہز تم نے وعدہ فردا کیا تو کیا
دشوار ہو گیا دلِ مضطر کا تھامنا فرد و دنی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

مرزا کی طرح دیکھتے تھے شاداں تمہیں پیری میں بھی جہان نے پایا جوان تمہیں
لیکن غمِ عالم نے کیا خستہ جاں تمہیں مارا زمانے نے اسدا لشرفاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

میرے سینے پر بے گلِ خن کا گساں ہے زبانِ شمع کی صورت زباں
کیا بتاؤں اپنے دل کی گرمیاں آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

ہم نشیں ان سے سفارش کیا کریں حکم یہ ہے نام بھی میرا نہ لیں
کہئے اب کس طرح راضی انھیں بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرائی اور ہے

اپنی کو کیا زواں اور کیا خطر صاف کہہ دے گالیاں دی ہوں اگر
ہو رہا ہے کیوں تاملِ اس قدر دے کے خط منہ دیکھتا ہر نامہ برد

کچھ تو پہنچاں زبانی اور ہے

دور میں ہیں چرخِ گرداں پر نجوم رات دن ہیں دائرِ محو و نجوم
دہریں ہیں وجہِ خیر و شر نجوم قاطع اعمار ہیں اکشر نجوم
وہ بلائے آسمانی اور ہے

آچکا ہے غمِ قریب اختتام ٹوٹنے والا ہے کوئی دم میں ام
منظرِ ہنس ہے مرزا صبح و شام ہو چکیں غالبِ بلا میں سب تمام

ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

اے نوابِ ناز و دلہا و دلہا کو لکھتے ہیں یہ دن مجھ پر گزرتے ہی گرمی میں میرا حال بعینہ وہ ہوتا ہے جیسا زبانِ گہائی
پینے والے جانور کا۔ خصوصاً اس توڑی کرشمہ کا جو ہم آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں لے میری ہدیٰ و قور
کو لکھتے ہیں وہاں کو کیا پوچھتے ہو؟ قدرِ ناز و فضلہ کے مرکز میں یہی ایک تیر باقی تھا قاتلِ ایسا عام۔ بوٹا ہے دانی خدا

کچھ وہاں کی خبر نہیں آتی کیوں صبا راہ پر نہیں آتی
کوئی تدبیر کر نہیں آتی کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

چرخ آزار کے ہے کیوں در پہ چین دیتا نہیں مجھے ہے
ہوتی ہے اپنے وقت پر ہر شے موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

دل ہی جب گم ہے دل لگی کیسی پاس تھا جب تو کچھ انگ بھی تھی
کچھ ہمیں اب تو ہو گئے مٹی آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

حسن بندوں کا ہے ریاضتِ زہد بسندگی اور نیک سیرتِ زہد
زیورِ عبد ہے عبادتِ زہد جانتا ہوں ثوابِ طاعتِ زہد
پر طبیعتِ ادھر نہیں آتی

بقیہ جلد ۱۴ - سخت کال ایسا پڑا وہاں کیوں ہو؟ "لسان الغیب" نے دس برس پہلے فرمایا ہے

ہو چکیں قاتل بلائیں ستیام ایک مرگ ناگہانی اور ہے

میاں شہزادہ کی بات غلط نہ تھی مگر میں نے وہاں عام میں مرزا پہنچا لائقِ مذمہما۔ واقعی اس میں میسری
کسیر شان تھی بعد رنجِ فساد ہوا ہجوم لیا جاتے گا۔

ہونے دو حسرتوں کا دلیں خوں وہ بگڑ جائیں گے اگر کہدوں
اپنے دل میں ہے اور ہی مضمون ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ چپ سے
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

میرے نالے کہیں ٹھہرتے ہیں جا کے روزان کے کان بھرتے ہیں
خوش تو ہیں وہ مگر مکتے ہیں کیوں نہ جینوں کی یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی

دکھ سے فضا میں ذرا پاتا چیر کر سینہ تجھ کو دکھلاتا
سقل ہوتی تو خود سمجھ جاتا داغ دل گر نظر نہیں آتا
بو بھی اس چارہ گر نہیں آتی

بے شکایت عبت تغافل کی کیا کہیں کچھ خبر نہ اس نے لی
جب ہمیں خود خبر نہیں اپنی ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہمساری خبر نہیں آتی

روز کے غم سے جان پر ہے بنی یا رب اس سے نجات کب ہوگی
ہو گیا سیر زندگی سے جی مڑتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

اے غالب صاحبِ لطیف گلرازی کو لکھا ہے "میرا بھادو کون ہے" مولانا فضل حق ایسا دوست مرحلئے عتاب
نیمہ رونا نیمہ جاں رہا ہے عرصۂ حیات میں مرنے کی آگ آتی تھی حال دل یہ سنسی الم اگر جوان ہوتا اور میرا رہ
آپ سے دعا ہے خیریت چاہتا اسی برس کا لڑکا ہوا آیا ہوں دعا کے نصرت کا امیدوار ہوں (ماقی ص ۱۲۳)

ہوش میں تم جو آؤ گے غالب ہند مڑا سے پاؤ گے غالب
 حق کو کیا منہ دکھاؤ گے غالب کبھے کس منہ سے جاؤ گے غالب
 شرم تم کو مگر نہیں آتی

(۹۱)

نالہ و آہ میں دھرا کیا ہے حاصل گریہ و بُکا کیا ہے
 اس ترپنے سے مدعا کیا ہے دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
 آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہے یہاں دل کو شوقِ جلوہ یار اور وہاں پر وہ مانعِ دیدار
 ان کو ہے بات بات پر انکار ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
 یا الہی یہ ماجرا کیا ہے

غیر کب تک کہے گا حالِ دروں آپ کب تک سنیں گے یہ مضموں
 ہو چکی انتہائے ضبط و سکون میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
 کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

باقی ص ۱۶۴ :- شرابِ کجخت ابھی چھوٹی نہیں۔ غارِ کاب بھی عادی ہوتا نہیں۔ "حانتا ہوں نوا طاعتِ زہرا
 کبھے کس منہ سے جاؤ گے غالب ۱۶۱

۱۶۵ میر بہری کو ایک خط میں لکھتے ہیں "میر میر فرارِ حسینِ مجھ سے ناخوش اور گورمند ہوں گے اور کہنے
 ہوں گے کہ دیکھو میں خط نہیں لکھا سہ میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں۔ کاش پوچھو کہ ماجرا کیا ہے
 ماجرا یہ ہے کہ میرا بھی تو کوئی خط نہیں آیا جس کا جواب لکھتا ہے"

کہتے ہیں واقفانِ غیب و خہود ایک ہیں عبد و عابد و معبود
 آخر ان کا ہے اس سے کیا مقصود جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
 پھر یہ ہنگامہ اسے خدا کیا ہے

جنگٹے کیسے عاشقوں کے ہیں اور معشوق کس کو کہتے ہیں
 حسن کے پھر یہ کیسے جلوے ہیں یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
 عشوہ و غمزہ واد کیا ہے

ایک سے ایک نازیں کیوں ہے دام بردوش ہر حسیں کیوں ہے
 فکر صیدِ دلِ حزیں کیوں ہے شکن زلفِ عنبریں کیوں ہے
 نگہ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

کس لئے پھول رنگ لائے ہیں کیوں یہ لالے نے داغ کھائے ہیں
 کس نے یہ تازہ گل کھلائے ہیں بزمِ و گل کہاں سے آئے ہیں
 ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ہیں محبت کے بھی نرالے بھید آہِ نغمہ ہے اس میں نازِ نشید
 یاس کو مزدہ اور اجل کو نوید ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
 جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

دکھ کسی کو دیا تو کیا ہوگا تیرے حق میں بہت بُرا ہوگا
 بد نتیجہ بُرائی کا ہوگا ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا
 اور درویش کی صدا کیا ہے

کب یہ مکر اختیار کرتا ہوں کب دعا بار بار کرتا ہوں
 طرز دشمن سے عار کرتا ہوں جان تم پر نثار کرتا ہوں
 میں نہیں جانتا دعا کیا ہے
 مثل مرزا ہے گود میں غالب شعر کہتا ہے دل نشیں غالب
 ہے مگر رند بالیقین غالب میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
 مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

اے چارہ گرو تم انہیں سمجھ کے تو ہو آئے اور ساتھ لے مرزدہ اند بھی ہو گو آئے
 اظہارِ تمنا سے مگر بات ہی کھو آئے کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالب ہو لے
 اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے
 اسانِ اجل ہے جو ذرا بے محے ہلت ہے اس کے نظارے کی تمنا دمِ رعلت
 وہ دیکھ تو لے آنکھ سے اپنی مری حالت ہوں کش مکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت
 کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے دیکھنے کو آئے
 اگر مرے گھر بھی وہی وحشت ہے وہی رم آتے ہی اجازت کے تقاضے ہوئے پیہم
 مشکل ہے قیام ایک جگر کا انہیں ک دم ہے ماعقہ و شعلہ و سیلاب کا عالم
 آنا ہی سمجھ میں میری آتا نہیں گو آئے

ترتیب میں مری آگے نہ بھاگیں گے نیکرین
 پریش سے بھی اگلا کے نہ بھاگیں گے نیکرین
 مودہ بھی مجھے پاکے نہ بھاگیں گے نیکرین
 ظاہر ہے کہ گھر کے نہ بھاگیں گے نیکرین
 ہاں منہ سے مگر بادہ دوشینہ کی بو آئے

ہیں تیغ بکف کون جو پھرتے ہیں اکثرے
 یہ کون ہیں جو وعظ میں دنیا سی ہیں لڑتے
 درپردہ کوئی اوہ ہے ہم کس سے بگڑتے
 جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھکڑتے
 ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

ہم ہوں تو ہر انسان ہیں مے طعنے نایافت
 ہاں اہل طلب کون سنے طعنے نایافت
 ہم گم ہوئے اور ختم ہوئے طعنے نایافت
 ہاں اہل طلب کون سنے طعنے نایافت
 دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

ہم وہ نہیں ناکامیوں کے نام سے بیٹھیں
 اندیشہ مایوسی انجام سے بیٹھیں
 رنج سفر و سختی احرام سے بیٹھیں
 اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
 اس در پر نہیں یار تو کہے ہی کو ہو آئے

اس شوخ کے لانے کی تو کرنے کے تدبیر
 اور واں ترے رونے کی لگے کھینچنے تصور
 ڈوبی ہوئی تقدیر سے الٹی ہوئی تاثیر
 کی ہم نفسوں نے اثر گر یہ میں تقریر
 اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے

لے بادہ دوشینہ سے مراد رات کی پی ہوئی شراب ہے اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ منہ کے بعد قبر میں دوشینہ نیکرین
 سوال و جواب کیلئے آئے ہیں۔ غالب صاحب غنی کے انوار میں فرماتے ہیں نیکرین کے سوال و جواب بچے کی ہی صورت
 ہے کہ منہ سے پہلے مجھے شراب پلا دو فرشتے قبر میں شراب کی بوتل بھاگ جائیں گے اور میں سوال و جواب کی رحمت سے
 بچ جاؤں گا۔ (ذکیا خوب انوار بیان ہے)

اک لطف وہاں عید کا دن رات ہر غالب کیا جلسہ یارانِ خوش اوقات ہر غالب
 مہرِ آس کے لئے وہ درِ حاجات ہر غالب اس انجنِ ناز کی کیا بات ہے غالب
 ہم بھی گئے وال اور تری تقدیر کی رو آئے

(۹۳)

جب سے رنگِ بہار طاری ہے کچھ عجب کیفیت ہماری ہے
 پھر لہو چشمِ تر سے جاری ہے پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے

سینہ جو یائے زخمِ کاری ہے

پہلے بے کارِ محض تھا ناخن اب مگر کام دے گیا ناخن
 داغِ دل کی طرف بڑھا ناخن پھر جگر کھودنے لگا ناخن

آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

پھر عبادت کا ہے نبیا انداز اور ہی سمتِ رخ ہے وقتِ نماز
 سن کے ناتقے کی دل ربا آواز قبلہ مقصدِ نگاہِ نیاز

پھر وہی پردہِ عماری ہے

ہو کے گاہک بنے ہیں سودائی دیدہ و دل کو کچھ نہ سدھائی
 رہ گئی ان کی ساری دانائی چشمِ دلالِ جنسِ رسوائی

دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے

مل کے دونوں ننبے یہ ٹھہرائی ایک عالم بنے تماشا
دونوں ذلت کے ہیں تمنائی وہ ہی صدرنگ نالہ فرسائی
وہ ہی صد گونہ اشکباری ہے

تنگ ہوں ہجر جاں گزار سے پھر عشق ہے اس قدر دراز سے پھر
مست ہوں چشم نیماز سے پھر دل ہوا ہے نرا م ناز سے پھر
محترستان بے قراری ہے

حسن پھر ترک تاز کرتا ہے پھر دیرِ فتنہ باز کرتا ہے
خونِ اہل نیاز کرتا ہے جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے
روز بازارِ جاں سپاری ہے

لاکھ صدے نئے گزرتے ہیں جان اس پر نثار کرتے ہیں
پھر دم اس پر دغا کا بھرتے ہیں پھر اسی بے وفا پر مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

ق

اُٹے ہیں داد خواہ اہل نیاز ہیں جفا پیشہ گوشِ براواز
ظاہر اب ہوں گے حسنِ عشق کےراز پھر کھلا ہے دیرِ عدالت ناز
گرم بازارِ فوجداری ہے

ہرز بردست ہو گیا ہے شیر زیرِ دستوں کو کر رہا ہے زیر

عدل و انصاف میں نہ کیوں ہو دیر ہو رہا ہے جہان میں اندھیر
 زلف کی پھر سرشتہ داری ہے
 پھر کیا دل نے یوں بیاں احوال رو دیئے سُن کے حاکم و عمال
 سر اجلاس پھر بے قال و مقال پھر دیا پارہ جگر نے سوال
 ایک فریاد و آہ وزاری ہے
 ابھی ثابت نہیں جفا کا سبب نہ ابھی ہے ثبوت قہر و غضب
 دیکھئے ہو معاملہ طے کب پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب
 اشکباری کا حکم جاری ہے
 عشق انصاف پر اگر آیا بال کی کھال ہی نکالے گا
 دیکھئے اس کا ہو نتیجہ کیا دل و خرگاہ کا جو مقدمہ تھا
 آج پھر اس کی رو بکاری ہے
 ہے یہ مرزا کو تو یقیں غالب ہوئے مغلوب تم کہیں غالب
 مل گیا ہے کوئی حسین غالب بے خودی بے سبب نہیں غالب
 کچھ تو ہے جسکی پردہ داری ہے

کی کرشی تو فرطِ زحمت سے خم ہوئے اپنی تعلیوں سے نخل دم بدم ہوئے

گھر گھر نشاط و عیش کا جوش و خروش ہے بزم طرب کہیں ہے کہیں ناؤ نوش ہے
اور یہاں دفرِ غم سے پر اگندہ ہوش ہے ظلمتِ کبرہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

ہے چونکہ دریا بحر میں دونوں کا ایک حال ممکن نہیں کہ ایک سے ہو ایک کو ملال
باہم نہیں ہے رشکِ حسد کا کوئی خیال نے خردہ وصال نہ نظارہ جمال
مدت ہوئی کہ اشتیاقِ چشم و گوش ہے

کم کر دیا ہے نشہ ساقی کا اجتناب سر کا ہے آج رخ سے ذرا گوشہ نقاب
دیدار سے ہے دیدہ مشتاق کامیاب نے کیا ہے حسن خود آرا کو بے حجاب
اے شوق ہاں اجازتِ تسلیم ہوش ہے

اس کے گلے کا حار جو در نہیں ہوا گویا صدف کا اختر قسمت چمک گیا
اک رشک اور بھی ہے صدف کا تو ذکر کیا گوہر کو عقد گردنِ خوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارہ گوہر فروش ہے

اے غالب صاحبِ شاعر کو اس شعر کا تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے: "اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے" یہ خبر ہے پہلا مصرعہ "ظلمتِ کبرہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے" یہ خبر ہے۔ شبِ غم کا جوش یعنی اندھیرا ہی اندھیرا ظلمتِ غلیظہ گھرا پیدا کر دیا غلطی ہی نہیں ہوئی۔ ہاں "کیا دلیلِ سحر پر ہے" یعنی بھی ہوئی شمع۔ اس راہ سے کہ شمع و چراغ صبح کو کچھ دھایا کرتے ہیں۔ لطف اس مضمون کا یہ ہے کہ جس شے کو دلیلِ سحر کہا گیا ہے وہ خود ایک سببِ بختِ اسبابِ تاریکی کے۔ پس دیکھا چاہیے جس گھر میں علامتِ صبح مؤید ظلمت ہوگی وہ گھر کتنا تاریک ہوگا۔

ہے شکر کی جگہ کہ نہیں ہم وہ ہے پرست دو گھونٹ میں جنہیں نہ ہے ہوش پاؤ دست
اچھا کیا تمہارے تصور نے نذر و بست دیدار بادہ حوصلہ ساقی نگاہ مست
بزم خیال میکدہ بے فروش ہے

ق

کرتی غلی مجھ کو قلتِ ے یا تو مضمحل یا اب خیال بادہ کشتی بھی ہے حالِ گسل
کردار سے ہوں اپنی پشیمان و منفعل اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زہار اگر تمہیں ہوس ناؤ و نوش ہے
بکھو کچھ آپ اپنے اگر خیر خواہ ہو سنبھلو ذرا جو طالبِ امن و پناہ ہو
تم بھی کہیں نہ میری طرح سے تباہ ہو دیکھو مجھے جو دیدہٴ عبرت نگاہ ہو
میری سنبو جو گوشِ حقیقتِ نبوش ہے
اس بزم میں نہ پاؤ گے کچھ غیر گم رہی جاتی رہے گی عقل سراسر رہی سہی
مجھ پر گزر چکی ہے جو میں نے تمہیں کہی ساقی بجلوۂ دشمنِ ایمان و آگہی
مطب پر نغمہ رہن تمکین و ہوش ہے
کہتے ہیں جس کو اہل جہاں محفلِ نشاط اک خوابِ خوش سے بڑھکے نہیں نہیں بساط
رونق کو اس کی لحظہ بہ لحظہ انحطاط یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہٴ بساط
دامانِ باغبان و کعبہٴ گل فروش ہے
چاروں طرف نشاطِ جمائے ہوئے رنگ بجتا ہے شورِ قلقلِ مینا سے جل ترنگ

ہے دل میں اہل بزم کے اک ہوشیار منگ لطفِ خرام ساقی و ذوقِ صدائے چنگ

یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

ہے انبساط و عیش کا منظر تو بزم میں پیدا ہے لطفِ گردشِ ساغر تو بزم میں

کچھ زلیست کا مزہ ہے میسر تو بزم میں یا صبح دم جو دیکھے اُکرتو بزم میں

نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

حالت ہی اور کچھ نظر آتی ہے بزم کی رونق ہی اس جگہ کبھی گویا ہوئی نہ تھی

محفل جو تھی بھری ہوئی سنسان ہو گئی داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی

اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خاموش ہے

مرزا نے کی نہ کوئی کمی مرضِ حال میں تا ہونہ مستما کوئی نے کے وبال میں

اک درد ہے ہر اہوا اسکے مقال میں آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

خائب صربِ خامہ نوائے سروش ہے

گر نہیں ان کو یقین چاہ کا میری نہ ہی جاں لیکر بھی اگر قدر نہ کچھ کی نہ ہی

وہ تیرے کہتے ہیں جان نہیں میری نہ ہی نہ ہوئی گروے مرنے سے تسلی نہ ہی

امحال اور بھی باقی ہے تو یہ بھی نہ ہی

میرے حلقے میں نہیں گل نہ ہی خار تو ہے دل میں اک صورتِ یادِ گل و گلزار تو ہے

گو مسرت سے ہوں محروم غم یار تو ہے خارِ عالمِ حسرت دیدار تو ہے

شوقِ گلِ چینِ گلستانِ تسلی نہ سہی

یہ کوئی فرض ہے ہر روز اسے اے ہی بنے اپنے ہاتھوں سے ہیں جامِ پلائے ہی بنے

یہ نہیں ہے نہ ہوئے آج اڑائے ہی بنے بے پرستارِ خمِ مہ سے لگائے ہی بنے

ایک دن گرنے ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

بے دیوانے کی گواہی نہ کی قدر تو کیا جوشِ وحشت نے دیا اس کا ستارہ چکا

ہنی آنکھوں کا بیباں نے بنایا تارا نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا

گر نہیں شمعِ سیدہ خانہ بلی نہ سہی

رکتے ہیں مجھے احبابِ فضاں کو تاقی ہر گھڑی جب مجھے گھونٹیں تو نہ کیونکر ہو قلیق

زِ عشرت ہی نہیں باعثِ وفقِ مطلق ایک ہنگامہ پر موقوف ہے گھر کی رونق

نودِ غم ہی سہی نغمہ شادی نہ سہی

یہ سقل پہ حاسد کے پڑا ہے پردا کہہ دیا ہے مرضِ رشکِ حسد نے اندھا

لبا پنا اسے سمجھاؤں بھی تو حاصل کیا نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

سے مرزا جو کہیں اس کو نصیحت سمجھو ہیں جو ہمدرد تو یہ ان کی عنایت سمجھو

ما جو آئی ہے بہتر یہی حالت سمجھو فرصتِ صحبتِ خواباں ہی غنیمت سمجھو

نہ ہوئی غالب اگر عمرِ طبعی نہ سہی

کبھی کیا تھا ظالم نے اس طرح کرم آگے ہمارے سائے سے پہلے تو کرتا تھا وہ آگے
 نہ کی تھی تیغ سرِ قتل گماہ یوں علم آگے عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
 کر اپنے سایہ سے سراؤں سے دو قدم آگے
 مرے ہی جسے میرا نے زنا کے غم و کلفت مے ہی واسطے پیدا ہوئے ہیں ماتم و حسرت
 خرابیوں سے زنا کی ہے کہاں مجھے فرصت قضا نے تھا مجھے چاہا خراب بادہ الفت
 فقط خراب نکھا بس نہ چل سکا قلم آگے
 ہمارے دل کی شادی غم و فراق نے ہستی بسی بسائی ہوئی حسرتوں کی اجڑی ہے بستی
 کچھ اب تو ہمت طاقت میں قہر کی ہوئی بستی غم زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عیش کی مستی
 مگر نہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے
 بتائیں کیا کہ تمنا ہمارے دل کی برباد کیا لگی ہے دھن کہ نہیں خود جواب کچھ نہ کچھ اسکا
 دیا ہے نامہ مگر دل کا ہے کچھ اور ہی سودا خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا
 کہ اس کے در پر پہنچتے ہیں نامہ برے ہم آگے
 تمہارے چھوٹے سے سرخ میل گئے ہیں بلا کے تمہارے پھندے میں کیے نہ جیتے جی کبھی چھوٹے
 ہمارے دل ہی کچھ لکھا ہوا تھا کیا کہیں تم سے یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے
 تمہارے آئیو اسے طرہ ہائے خم بہ خم آگے

بہت دنوں تو ہم اسی مرگے بہت ہے دپے ہم شک فتنہ ہائیں کہ قصہ ہی کہیں ہوٹ
اب اپنی ہستی کا عقدہ کھلا کر یہیے کیا شے دل و جگر میں پر افشاں جو ایک موہ نوں ہے

ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے
وہ اشکِ اتم مرزا میں کب بہاتے ہیں غالب غصہ بے مرنے کی میسے خوشی مٹاتے ہیں غالب
ملنے خاک میں مجھ کو کہاں وہ آتشی غالب قسم جنازہ پڑنے کی میسے رکھاتے ہیں غالب
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

(۹۸)

آہ کرنے سے غصہ اس کا سوا ہوتا ہے ناکرتا ہوں تو سرگرم جفا ہوتا ہے
لب ہلانا سبب ترک و فنا ہوتا ہے شکوے کے نام سے بے ہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کہنے تو رگلا ہوتا ہے

تنگ ہوں کب تک ٹھایا کروں میں جو جفا کونسا ظلم ہے جو آپ نے مجھ پر نہ کیا
بے سبب تو نہیں شکوں کا مرنے تا رہا ہوں میں شکوے سے یوں راگ کر جیسے بلجا
اک ذرا چھوڑیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

دل غم دوست کی ہے عین تمنا یہ تو ہم جوشاکی ہوں تو وہ اور ستائے ہم کو
کاش آگاہ وہ اسرار شکایت سے نہ ہو گو سمجھتا نہیں پر حسن تلافی دیکھو
شکوہ جو رسے سرگرم جفا ہوتا ہے

کردیا روز کی گردش نے اسے خستہ حال پاؤں بھی ابتواٹھا نا ہے اسے سخت محال
 ہو گیا خلق کو اندازہ رفتار محال عشق کی راہ میں ہر چرخ ملکوب کی کچھال
 سست روی سے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

ہم یہاں تک تو ہوئے تو گر بیدار و رستم دیر ہوتی ہے جفاؤں میں تو ہوتا ہے الم
 دل کو بے تازہ جراحات کی خواہش بہیم کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیلد کہ ہم
 آپ اٹھلاتے ہیں گم تیر خطا ہوتا ہے

خستہ برگشتہ نے لینے ہی نہ دی ہم کو پناہ رکھتے اے کاش نہ ہم اپنی بھلائی پہ نگاہ
 کام سب سوئے تدریس ہوئے اپنے تباہ خوب تھا پہلے ہی سے ہوتے ہم اپنے بدخواہ
 کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

ڈرے شکوہ نہیں کرتے ہیں کہ ہے تیر کلام ناتوانی کی ہے آخر کوئی حد بھی یارب
 زار نالی بھی ہے رُشوار دم رنج و تعب نالہ جاتا تھا پرے عشقِ بریں سے اور اب
 لب تک آنا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

طبع قدرت نے مجھے دی ہر عجبِ دو فن میں جو چاہوں ہر قرطاس کھلا دوں گلشن
 راگ لاسناب کیا مجھ سے کوئی مرغِ چمن خام میرا کہ وہ ہے بار بد بزمِ سخن
 شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

ذات کو تیری کیا حق نے پناہ عالم تیرا سایہ ہر مخلوق پہ ہے ابرِ کرم
 اہل دنیا کو ترسِ فیض سے ہے عیش بہیم اور شہنشاہِ کواکب سپہ و مہرِ علم

تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے
 محض افسانہ ہیں شاہانِ سلف کے قصے
 پہنچ ہیں شوکت و اقبال میں تیرے آگے
 کچھ ٹھکانا ہے بھلا جاہ و شتم کا تیرے
 سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے
 تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے
 گر دیکھتے تیرے لئے فلک کا یہ حال
 ذرہ ذرہ ترے دروائے کا خورشید مثال
 ماہِ کامل کو جبیں سائی میں حاصل ہو کمال
 ہر جہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال
 آستان پر ترے مناصب سا ہوتا ہے
 بند ہیں مرغِ چین مجھ سے خوش الحانی میں
 کچھ نہ کچھ نغمہ سراہوں جو پریشانی میں
 ہے ترا لطف ممد طبع کی جولانی میں
 میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں
 یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فراہم ہوتا ہے
 کہنے کیا چرخِ ستم کار کو ہی نا انصاف
 ذکر کیا غیر کا اپنے بھی مہر کے خلاف
 کوئی ہمدرد نہیں قاف سے لیکر تاقاف
 رکھو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
 آج کچھ دردِ دل میں سوا ہوتا ہے

بلائے دہرے بے باکیوں کی خو کیا ہے
 تمھارے سامنے انسان کی آبرو کیا ہے
 کلامِ ہتک یہ دشمن کے رو برو کیا ہے
 ہر ایک بات پر کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
 تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے
 اے حاشیہ منہ پر

نگاہ گرم سے ظالم نے بس کو دیکھ لیا جلا کر اس کو کیا خاک دم میں سہرتا پا
کمال یہ ہے کہ کرتا ہے آگ سے ٹھنڈا نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برقی میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تندر تو کیا ہے

برائیوں کے ہماری سبق ہزار و دے یقین ہے کہ نہ فقر و میں آؤ گے اس کے
خیال اس کا نہیں ہے کہنے وہ جو چاہے یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوف بداموزی عدو کیا ہے

نہ دے گا کام رفوگر یہاں تو کچھ فن اٹھائے طاق میں رکھ اپنے رشتہ و سوزن
سرکش جسم کے تاروں سے سن چکا دامن چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیرا ہن
ہماری جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے

رہا نہ تن ہی تو دل کا کہاں پتا ہوگا یقین ہے جسم سے پہلے ہی مٹ چکا ہوگا
سوائے خاک یہاں دستیاب کیا ہوگا جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کر دیتے ہو جواب راگہ جستجو کیا ہے

حاشیہ ص ۱۸۰: غزل تہرے غالب صاحب آگے انھوں نے غزل بھی لکھ کر کہہ دیا کہ تم فقیر مجھے یہاں اور اس غزل کا طالب کا ذوق تھا ہے تو یہ غزل اس خط سے پہلے ہی ہو گئی۔ نیز یہ غزل شیونرائن آرام کو بھیج کر فرمایا۔
یہ تمہارا قبائل ہے کہ کو شہر ماؤ آگے ایک غزل یہ اور دو غزلیں تو بجا جاتی ہیں تیس ہفتہ کا گودام تمہارے پاس درام ہو گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہر سوزائیں لیے ہفتہ واریں غزلیں غالب صاحب کا کلام شائع کرتے تھے۔
کہا جاتا ہے کہ کیرن ذوق پاداشی میں جا ہے تھے کہ غالب کی نظروں پر پڑ گئی تو نگہ دونوں میں ہم عصر نہ چٹک گئی
ابنہ غالب کی ابیر میر یہ مصرعہ پڑھا ذوق سے سن لیا اور بادشاہ ظفر سے تکلیف کی۔ غالب جب دربار میں گئے بادشاہ
نے پوچھا کہ آج آپ نے کونسی غزل کہی ہے۔ غالب صاحب نے پوری غزل سنائی اور قطع کا یہ مصرعہ بدل دیا۔ ہولہ الخ

غلط کر رہتا ہے جو یائے خوفِ قاتل کہیں گے ہم تو کہے اس کی ڈر لا حاصل
ہے میں شک میں گھل گھل کے کیا بھگر کیا دل رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قاتل

جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

جب ہے تو فرقہ زہاد کو ہے اس کی تمیز کہ کس کو کہتے ہیں علماں حوئے کیا چیز
میں غرض نہیں کوئی غلام ہو کہ کینز وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز

سوائے بادۂ گلام دشکبو کیا ہے

چڑھا کے سانگو مینا کے نہ ہوں ہر شمار سبو بھی منہ سے لگا کر نہ سیر ہوں زہار
یقین کیجئے میں نام کا نہیں ے خوار پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار

یہ شیشہ و قدر و کوزہ و سبو کیا ہے

ہمارے حال پران کو کہیں نظر ہو بھی اور انتقامات مریض فراق پر ہو بھی
نتیجہ خاک نہ ہو گا اگر خبر ہو بھی رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی

تو کس امید پر کیجئے کہ آرزو کیا ہے

عروجِ طالعِ غالب اگر اسے بھاتا حسد کی آگ میں حاسد نہ یوں بھنکا جاتا
نہ پھر یہ شعروہ مرزا زبان پر لاتا ہوا ہے شہ کا مصاحب پھر کہے اتراتا

وگر نہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے



تابِ الم اب مجھے زہار نہیں ہے قابو میں مرے دل افکار نہیں ہے
 آہِ ذرا دل پر اختیار نہیں ہے آکر مری جان کو قرار نہیں ہے
 طاقتِ بیدار انتظار نہیں ہے

دل کو تو قابو میں اپنے لے لیا چلا کرتے ہیں فرائشِ جانِ جانِ ہم سے
 لطفِ طے گا بھلا کب عیش سے اسکے دیتے ہیں جنتِ حیاتِ دہر کے میلے
 نشہ بہ اندازہٴ خمسار نہیں ہے

چھائی ہے کچھ اس طرح کی بیکسی اب تو رونا ہوں ہمارا ہے کوئی نہ ہے دل جو
 شکوہ رقیبوں کا کیا کیا تیرا گلہ ہو گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو
 ہائے کہ رولنے پہ اختیار نہیں ہے

وہ بھی تو چاہیے کچھ رنج کی آہ کونسی شے میں ہے پایا عاجز و قاصر
 چاہو جو تم جان بھی کر سکتے ہیں حاضر ہم سے بحث ہے گمانِ رنجشِ خاطر
 خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے

غفلتِ دل سے بھلا کیا پائے معافی اسیں ہی مضمحل ہے سب دیکھو معافی
 اس کو سمجھ منزل و ماوا سے معافی دل سے اٹھا لطفِ جلوہ ہائے معافی
 غیر گل آئینہ بہار نہیں ہے

اس پہ کئے میں نے برسوں تک تقاضے سن کے ہمیشہ مگر کچھ ٹالا ہی اس نے
 طالع خفتہ مرے اب کچھ تو ہیں جاگے قتل کا میرے عہد تو کیا ہے بارے
 وائے اگر عہد استوار نہیں ہے
 تو نے یہ کیا زہد کی ٹھہرائی ہے غالب چال یہ مرزا نے تری پائی ہے غالب
 جام و سبو کا تو تو سودائی ہے غالب تو نے قسم نے کشی کی کھائی ہے غالب
 تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

(۱۰۱)

زمانے بھر کے رنج و غم ہیں اور تنہا ملول ہے تھل مجھ سے اس کو وہ گراں کا سخت مشکل ہے
 بڑھاپے بوجھ اتنا سوئے زانو سر بھی مائل ہے بھوم غم سے یاں تک ہر رنگونی مجھ کو حاصل ہے
 کہ تابو امن و تامل نظر میں فرق مشکل ہے
 بھٹے لے چارہ گرد نظر راحت نہیں جن کی مرے لوں تو اگر کاٹے رگیں بھی میری گزین کی
 سیئے جائز خم دل پرانہ کر کچھ طعن دشمن کی رفوئے زخم سے مطلب لذت زخم سنون کی
 بھجی موت کہ پاس روستے دیوانہ غافل ہے
 گلستاں میں گروہ و لوق افزائی کے غالب تو نور اس کا عطا نرس کو بینائی کے غالب
 عجیب بولے خوش مرزا کو سودائی کے غالب وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمایا کے غالب
 چنگنا غنچہ گل کا صدائے خندہ دل ہے

جس روز کہ تو سیر کو گلزار میں آوے گل تازہ کھلے نکلتے گل خار میں آوے
 بالیدگی سوکھے ہوئے اشجار میں آوے جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے

ہاں کالبہ صورتِ دیوار میں آوے
 گل گشت میں پیدا ہو عجب لطف کا منظر لے بڑھکے بلائیں تری ہر شاخ گل تر
 گل تیرے قدم لینے کو ہوش زہیں پر سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
 تو اس قید دل کش سے جو گلزار میں آوے

مانا کہ غم و ہم سے دل زار گھلا ہے بر سادیے مژگاں نے خود ریا بھی تو کیا ہے
 آنکھیں بھی لہو روئیں تو کیا فخر ہوا ہے تب نازِ گرا نمانگی اشکِ بجا ہے
 جب لختِ جگر دیدہ خونبار میں آوے

ہر چند ہوا جوش فرو مجھ کو ستا کر کچھ دل کو ہوئی راحت و تسکین بھی دم بھر
 وہ بات بھی کر جس سے لطفِ مکر نے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ تم گر
 کچھ مجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے

اعجازِ کارنگ اپنے بخود کھلائے اشارہ بے جان کو جاندار بنا جائے اشارہ
 جادو سے غضبِ یکے کیا دھائے اشارہ اس چشمِ فسون گر کا اگر پائے اشارہ
 طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے

مصرف دعاؤں میں ہیں کس سے یارب تاہر ہند پاگزیرے کوئی پاس سے یارب
 تکتے ہیں پڑے راہ عجب یاس سے یارب کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب

اک آبلہ پا وادی پر خار میں آوے

آیا مرے آغوش میں کب وہ تن نازک کس دن ہو راحت کا سبب وہ تن نازک
 پھندے میں ہو یوں غیر کے اب تن نازک مراؤں نہ کیوں رشک سے جب تن نازک
 آغوشِ غم حلقہ زنا میں آوے

پھیلائے ہوئے دستِ طلب ہیں سراسر دیکھا ہے زمانے میں نہیں خوار ہی اکثر
 انسان کیلئے حرص ہی دشمن ہے قوی تر غارت گرد ناموس نہ ہو کر ہو س زور
 کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

مانا کہ جنوں کے تجھے جوش فراواں باقی ترے ہاتھوں سے رہی جنبہاں
 یوں ٹکڑے اڑانا تو نہیں تجھے شایاں تب چاک گردِ بیاں کا مڑھنے ل ناداں
 جب اک نفس البھا ہوا ہزار میں آوے

کیا حال تپ سوزِ دروں کیئے زباں سے لگ جائے کہیں آگ نہ گرمی کے بیاں سے
 بہتر بڑک نہاں ہی رہے اہل جہاں سے آتش کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے
 اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

مرزا کی طرح سحر کی قسم اس کو سمجھئے مغمفوں ہے اگر روح تو جسم اس کو سمجھئے
 افسوں اسے ٹھہرائے ام اس کو سمجھئے گنبدِ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
 جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

ماند ہے نجم سحر یار کا خال اچھا ہے اس کے ابرو سے نہ خنجر نہ ہلال اچھا ہے
 مہر کچھ ہے تو ذرا قبل زوال اچھا ہے حسن مگر چہ بہنگام کمال اچھا ہے
 اس سے میرا مر نور شید جمال اچھا ہے

مفت کے مال کے اس رجب ہیں خواہاں کیا وہ اسی دالو اسی گھات میں ہیں شام و بگاہ
 چاہتے ہیں کہ رقم کوئی ملے خاطر خواہ بوسہ دیتے نہیں وردل پہ ہے ہرقت نگاہ
 جی میں کہتے ہیں کہ مفت اے تو مال اچھا ہے

کب سیر ہوا جشید کو یہیمانہ نیا دور میں تادم آخرو ہی اک جام رہا
 دل سے اترا جو یہاں دور کیا پھینک دیا اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
 ساغر دم سے مرا جام سفال اچھا ہے

کر دیا ہے غم، بجزاں نے مرا سید شوق نام ہی نام برب جان کا باقی ہے رفق
 رنگ رہتا ہے مرا یوں تو غم و درد سے فراق انکے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر و فراق
 وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

انکے ہاتھوں سے سی کو بھی نہیں پہنچا فیض دین و ایمان کے یہ دشمن ہیں تو کچھ کس فیض
 بندگی کیسے بھی دیکھا تو نہ پایا با فیض دیکھنے پاتے ہیں عشاق بتو س کیا فیض
 اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

فن ہے وہ چیز کہ فرہاد کی دی بات بنا ورنہ شیریں سے کہے بات یہ اسکا مذاق
جس ہنریں غمی اسے مشق وہ کام آہی گیا ہم سخن پیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

وصل محبوب اے کاش ہمارا ہو جائے دور جلدی کہیں یہ پڑہ دووی کا ہو جائے
جزو ہو وصل کل ایک ہی نقشہ ہو جائے قطرہ دریا میں جوں جائے تو دیا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کمال اچھا ہے

کس کے دروازے سے جو چاہے گدا ملتا ہے اور جو ملتا ہے تو باجون و چرا ملتا ہے
در بدر بھیجک اگر مانگے کیا ملتا ہے بے طلب ہیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

تا ابد اس کو خدا رکھے سراسر سربلندر اس جہن میں ہے یہ رشک منور سربلندر
ہو سدا اس کا چمن زار مقدر سربلندر خضر سلطان کو رکھے خالق اکبر سربلندر
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

کٹ ہے ہیں اسی امید میں مزلے کچھ ن صرف اسی آسری پہمے دل مضطرب سا گن
یہ تصور جو نہ ہو کب ہے تسلی ممکن ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ہم ہیں شاکی ساقی گلفام کے اہلِ مخمل ہوں مُحق انعام کے
 حوصلے پورے ہوں خاص و عام کے غیر ہیں مخمل میں بوسے جام کے
 ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

ظلم سے خالی ہے کوئی کیر نہ مر درپے ایذا ہیں اہلِ شہر و درہ
 تم سے کیوں پڑتی مرے دل میں گرہ خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
 ہتکنڈے ہیں چسرخ نیلی فام کے

دل میں اس ناوک فگن کے ہے گرہ یہ کمان اپنی کئے رہتا ہے زہ
 تاک میں سب کی ہے کہ ہو یا کہ مر خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
 ہتکنڈے ہیں چسرخ نیلی فام ہے

تم جوابِ خط ہمیں دو یا نہ دو ہم کو حاصل ہے غرض ہے دل کی جو
 اس بہانے نام لکھا جائے تو خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
 ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

جوشِ مستی میں کیا طوفِ حرم خستِ خم پر کی ادا رسمِ سلم
 زہد میں رندی سے بھی چوکے نہ ہم راتِ پی زمرم پرے اور صبح دم
 دھوئے دھتے جامہٴ احرام کے

تھی بلا اپنے لئے اپنی نظر ہتکنڈوں کی اس کے تھی کس کو خبر
 اپنے ہاتھوں خود میں پہنچا ضرر دل کو آنکھوں نے پھنسا یا کیا مگر
 یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

ہو چکا ظاہر دعاؤں کا اثر سب تھے مصروف دعا شام و سحر
 شاد پھرتے ہیں طبیب اور چارہ گر شاہ کے ہے غسل صحت کی خبر
 دیکھئے کب دن پھریں حمام کے

پوچھ لو مزے اپنا مشغلا شغل ہو سکتا ہے کیا بے کار کا
 روگ ہی کچھ دل کو بیٹھ بگ گیا عشق نے غالب نکما کر دیا
 ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

لے مرزا لکھے ”بھائی محمد بن اب کچھ باقی نہیں ہے۔ برسات کی معیبت گزر گئی لیکن بڑھا پے کی
 شدت بڑھ گئی تمام دن پڑا رہتا ہوں بیٹھ نہیں سکتا ضعف نے غالب نکما کر دیا۔“

اسی طرح دہلی سوسائٹی کے جلسے میں اپنا ایک مضمون پڑھا۔ فرماتے ہیں: ”بوڑھا ہوں، ناتواں ہوں
 راج اگر پوچھئے تو نیم جاں ہوں“ ضعف نے غالب نکما کر دیا۔ ”ربا ص الدین امجد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میں
 نے یہ شعر ان کے سامنے پڑھا ”عشق نے غالب نکما کر دیا“ تو فرمایا ”بھائی پیپ رہو۔ یوں کہو ضعف نے
 غالب نکما کر دیا۔ یاد ہرنے غالب نکما کر دیا۔ عشق کیسا عاشقی کا وہ زمانہ نہ رہا۔“

مولوی احمد حسن قنوی کو لکھا ”یہ درویش گوشہ نشین تمہارا دوست اور تمہارا دعا گو ہے اہم عشق
 نے غالب..... ہینسٹہ برس کی عمر ہوئی۔ اضمحلال قوی، ضعف دماغ، فکر مرگ، غم عینی جو مجھے
 آپ دیکھ گئے ہیں یہ اب وہ نہیں ہوں۔“



ہر شجر نے نئی قبا پائی بوئے گل کو صبا اڑا لائی
گلِ نرگس نے پائی رعنائی پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے ہر وہ تماشا ئی

ہے صفائیِ سمک سے تار سماک نظر آتے نہیں خس و فاشاک
ہر چمن ہے غبار و گرد سے پاک دیکھو اے ساکنانِ خطہ خاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

اوس کی ہے بہارِ سبزے پر گل چمکتے ہیں صورتِ اختر
کہتے بے ساختہ نہ پھر کیوں کر کہ زمیں ہو گئی ہے سرتاسر
روکشِ سطحِ چرخِ مینائی

ابرِ باران نے آبِ باری کی قوتِ نامیہ کو حرکت دی
نظر آتی ہے شاخ شاخ ہری سبز کو جب کہیں جگہ نہ ملی
ہو گیا روئے آب پر کائی

سبزِ مخمل بچھائی سبزے نے کھل کھلاتے ہیں ہر طرف غنچے
پھول کئی شاخ شاخ پر بھولے سبزۂ وگل کے دیکھنے کے لئے
چشمِ نرگس ہوئی تماشا ئی

بزمِ عالم ہے مے کرے کی نظیر جھوم کر چھا گیا ہے ابرِ مطہر
مست پھرتے ہیں سب صغیر و کبیر ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادِ پیمائی

شاد مرزا ہے ہر گھڑی غالب کہ دعا کار گر ہوئی غالب
عام ہے عیش و خرمی غالب کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب
شاہِ دیندار نے شفا پائی

۱۰۶

نہ چلی سحرِ بیانی میری ہیچ نکلی ہم سے دانی میری
بھول کر بات نہ مانی میری کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

درِ دل اسے ستم انگیز نہ پوچھ حالِ چشمِ غضب آمیز نہ پوچھ
زخمِ نوکِ مژگ تیز نہ پوچھ غلشِ غمرہٴ خونریز نہ پوچھ
دیکھ خوں نابِ رفتانی میری

مجھ کو اپنا ہی نہیں ہائے خیال دوستوں تک تو کہاں جائے خیال
کس طرح ان کا مجھ سے خیال ہوں زِ خود رفتہ بمیرائے خیال
بھول جانا ہے نشانی میری

ہے حریف اپنا بھی کتنا بودا مجھ کو جس بزم میں پایا نہ جا
میری ہر بات میں ضد ہے گویا مشتابل ہے مقابل میرا
رک گیا دیکھ روانی میری

جبکہ نظروں میں سبک ٹھہرا ہوں کیوں ترسول پگراں اتنا ہوں
کیا حقیقت ہے مری میں کیا ہوں قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں
سخت ایزاں ہے گرانی میری

کیوں نہ بے رانتہ چکر کھاؤں گردشِ دہر سے ہے حالِ زبوں
غیر ممکن ہے کہ ٹھہروں دم لوں رگِ دبا د رہ بے تابی ہوں
مصرِ شوق ہے بانی میری

موثر گافی کا مجھے دعویٰ تھا عقدہٴ موئے کمر ہی نہ کھلا
تھا غلط زعمِ ہمہ دانی کا دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا
کھل گئی پہنچ مدانی میری

خط جو لکھتا ہوں تو خاص طور مار بات کرتا ہوں تو دیوانہ وار
کیا مجھے یاد کریں گے غمِ خوار کیا بیاں کر کے مرا رویں گے یار
مگر آشفتمہ بیانی میری

اے عبدالرزاق شاکر کے ایک خط میں تشریح کی ہے "تقابل و تضاد کو کون د جانے کا نور و ظلمت شادی و غم راز
رجح و مرجح و عدم لفظ مقابل اس معنی میں ہے جسے حریف کہہ سکتا ہے دوست بھی مستعمل ہے غم و شغور
ہم اور دوست ہر دئے غم و عادت ضد ہر گز نہیں وہ میری طبع کی روانی کو دیکھ کر رک گیا"

مثل مرزا ہوئی طاقت غائب قلب قابو میں نہ بس میں قالب
 خاک ہوں زلیست کا اپنی طالب کر دیا ضعف نے عاجز غالب
 ننگ پیری ہے جوانی میری

رگ رگ ہے مری نشترِ فساد کی بھوکی ہو جلد رواں تیغ یہ حسرت ہے گلو کی
 راحت ہے براحت کوروانی کو لہو کی جس زخم کی ہو سکتی ہو تند بیرِ فرو کی
 لکھتے بھو یارب اسے قسمت میں عدو کی
 وہ دن گئے تھیں خون کی جب اپنی گیس پُر اور آنکھ سے تھا خون کے اشکوں کا قطر
 خونِ جگر و دل تو ہوا رزقِ نفعِ شر اچھا ہے ہر انگشتِ حسائی کا تصور
 دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی
 ناحق ہے قیامت کا تھیں خوف ابھی سے کچھ ظلم بھی کرتے ہو تو سہمے ہوئے جی سے
 کرنے دو اگر کرتے ہیں شکوہ یہ کسی سے کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے جوصلگی سے
 یاں تو کوئی سنتا نہیں فریادِ کسو کی
 جب نہ کیا ہو ترے تیروں نے ادھر کو کاٹا نہ ہو شمشیر نے سودا بھرے سر کو
 کیا لطف ملے زلیست کا پھر ایسے بشر کو دشمن نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو
 خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

مرزا غم دنیا سے رہا موت کا طالب چاہا کہ کرے ترک کہیں جان یہ قالب
حاصل ہوا مطلوب نہ بڑے مطالب صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب
حسرت میں رہے ایک بتِ عبرتِ جو کی

(۱۰۸)

حسن ہی کا دل کو سودا چاہیے اشتیاقِ روئے زیبا چاہیے
رات دن شوقِ تمنا چاہیے چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے
نشہ ہوتا ہے کب ان کو اس قدر کچھ نہ ساقی کے سوا اے نظر
لاکھ یہ پیتے رہیں اٹھوں پہر صحبتِ زنداں سے واجبِ حذر
جائے اپنے کو کیسینا چاہیے
پاکے ثمرہ چاہ کا دل ہے خجل ہو گیا ہے درد و غم سے مضحل
اب تو یہ ہے اور دردِ جاں گسل چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے
مجرموں نے پردہ ہے دیوانگی یہ تنہا فر اور یہ ہم خانگی
ہم سے چھپنا ہے کوئی فرزانگی دوستی کا پردہ ہے بے گانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

موت کا پاتا ہوں جو یا غیر کو رشک نے میرے ڈھویا غیر کو
رات دن کا غم ہے گویا غیر کو دشمنی نے میسری کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہو دیکھا چاہیئے

پہنڈ میں نا صبح نے بھی کر لی ہے سعی قید سے یاروں نے کیا کم کی ہے سعی
بار بار ہم نے بھی کر دیکھی ہے سعی اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیئے

کب ہے مایوسوں کو امید نوید گوش زد ہوان کے کیونکر یہ نشید
کچھ نہ پوچھو حسرتوں کا اپنی بھید منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امید کی دیکھا چاہیئے

پیرزن نام نہانی اپنے قصہ سے منہ تنہا کیا اس کا کروہ یوسف کو لے

اے فاق صاحب نے منشی ہی بخش حقیر کو اور جنوری ۱۳۵۸ء کے خط میں لکھا ”کیا کروں؟ مفت غمزہ اور
طول رہتا ہوں۔ مجھ کو اب اس شہر کی اقامت ناگوار ہے اور موانع و عوائق ایسے فراہم ہوئے ہیں کہ نکل نہیں سکتا
خلاصہ میرے رنج و الم کا یہ ہے کہ میں صرف مرنے کی توقع پر جینا ہوں۔“

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید نا امید کی دیکھا چاہیئے
یہ شعر مرزا یوسف کو بھی ایک خط میں لکھا ہے علاوہ ازیں چودھری عبدالغفور کے خط میں ضاع الم بارہوی
کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے ”حضرت پرچ تو یوں ہے کٹم ہائے روز گار نے مجھ کو گھبرایا ہے سانس نہیں لے سکتا
اٹانگ کر دیئے ہر باب کو طرح سے خیال میں آئی پرل نے کسی طرح تسلی نہ پائی۔ اب وہ باتیں سوچتا ہوں ایک تیر کہ
جب تک جیتا ہوں یوں ہی رویا کروں گا ورنہ میری یہ کہ آخر ایک نہ ایک دن مرنے لگا یہ مغربی و کبریٰ دل نشیں ہے چو اسکا
سکین ہے، یہ بات۔“ منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید نا امید کی دیکھا چاہیئے۔“

آ رہی تھی یہ صدائے غیب اسے غافل ان مرہ طلعوں کے واسطے
 چاہنے والا بھی اچھا چاہیے
 یہ ضعیفی اور تلاشِ خال و خد جستجوئے نازنینِ سرو قد
 اس جنوں کی بھی ہے مژا کوئی حد چاہتے ہیں خو برو یوں کو اسد
 آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

۱۰۹

کس طرح طے ہو رہے عالمِ امکاں مجھ سے میں تھکا ماندہ ہوں اور دوپے جاناں مجھ سے
 ذرہ ذرہ دم و حشر ہر گریزاں مجھ سے ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے
 میری رقتاں سے بھاگے ہے باباں مجھ سے
 جبکہ دیباچہ سے کھلتے ہیں مضامین یکے پکار رہے وصیت ہے کسے بیٹھ کے دیکھے دفتر
 اور ہیلام میں الجھی ہوئی ہے اپنی نظر دریں عنوانِ تماشا بہ تغافل خوشتر
 ہے نگہ رشتہ شہید ازہ شرکاں مجھ سے
 کیا کہوں کیسے بسر ہوتی ہیں غم کی راتیں میرے سادہ بیاں کی مجھے تکلیف نہ دیں
 بیکیسی کامری اندازہ اسی سے کر لیں وحشتِ آتش دل سے شب تنہائی میں
 دود کی طرح رہا سایہ گریزاں مجھ سے
 میرے نام میں وہ جب ٹھہرے گریاں پھر خود آرائی و زینت کا وہ سامان کہاں

مٹ گئی سرمہ کی تخیر کہ میں شک وں غم عشاق نہ ہو سادگی آموز بتاں

کس قدر فائدہ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

چونکہ ہے درخت مے پاؤں سے آغشته نخل ڈسے ڈسے کو یہ دعویٰ ہے کہ میں فخر ہوں

کیوں چمکتے ہوئے چھالوں کو جواہر نہ کہوں اثر ابلہ سے جا دہ محسراے جنوں

صورتِ رشنہ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

کاش ہر اک شب غم میں یہی بے ہوشی ہو تاکچہ آرام سے یہ ہو شر باگزسے تو

اس نے تو خوب ہی پہنچائی ہے راحت دلکو بے خودی بستر تمہید فراغت ہو جو

پڑے سایہ کی طرح میرا شبستان مجھ سے

منہر قفل پہ ہیں آنکھ کے ارماں سارے کٹے ستریز نظر ہو تو کروں نظائے

تبع گل گیر سے کم مجھ کو نہیں ہے پیاسے شوق دیدار میں گرتو مجھے گزن ماسے

ہونگے مثل گل شمع پریشناں مجھ سے

کیا شبِ تانے ڈھائی ہے قیامت ہے چھوڑ دی سایہ نے بھی میری رفاقت ہو

کتنی پر خوف ہے منزل گہرِ فرقت ہے بیکی ہائے شبِ ہجر کی وحشت ہے

سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے نہاں مجھ سے

بادِ حسن سے بغیر و نیک تو یوں مست کرے تشنہ لب رہی دیدار کے جو طالب تھے

خوب انصاف کیا ساقی ہوش تو نے گردشِ ساغرِ صدفِ جلوہ رنگیں تجھ سے

آئینہ داری یک دیدہ حیراں مجھ سے
 آگ وہ سید نہ زائیں بھڑکتی ہے اسد
 دیکھ کر برق جسے دور کرتی ہے اسد
 دل میں بھی آتش جاں سوز دہکتی ہے اسد
 ننگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد
 ہے چراغاں خس و فاشاگِ گلستاں مجھ سے

۱۱۰

دل میں وہ درد کر جو اسکو دکھائے نہ بنے
 بار غم میں وہ گرانی کا اٹھائے نہ بنے
 حال اپنا وہ زبوں جسکو چھپائے نہ بنے
 نکتہ چیں ہے غمِ دل اسکو سنائے نہ بنے

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

گو بظاہر نہیں کچھ اس کا بلانا مشکل
 کہیں ہونا نہ پڑے اسکے نہ آنے سے خجل
 ڈر مگر یہ ہے کہ ہٹ میں ہے وہ اپنی کامل
 میں بلاتا تو ہوں اسکو مگر اسے جذبہ دل

اس بر بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

لذتِ حیر و جفا کو کہیں وہ شوخ نہ پائے
 ہاتھ دانستہ کہیں ظلم سے ظالم نہ اٹھائے
 فصدِ چڑھ جائے کہیں ایسی کہ بھڑ دل دکھائے
 کھیل سمجھا کہیں چھوڑ نہ بے بھول نہ جائے

کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے سنائے نہ بنے

خود تو رسوائے جہاں ہر ہی یہ بد ذات مگر
 راز داری کے کہتے ہیں اسے کیا خبر
 نیک نامی کو کہیں تیری نہ پہنچائے ضرر
 غیر بھرتا ہے لئے بولوں ترے خط کو کہ اگر

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے
 « شاخ ہی تنگ ہے گل تر کا شکفتہ رہنا ہاتھ نکل چیں کا پڑا اور وہ پڑ مردہ ہوا
 چشم بد دور وہ نازک میں کہیں گل سے سوا اس نزاکت کا بُرا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا
 ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے
 نور یہ مہر میں یہ مہ میں ضیا کیسی ہے کس کی بو ہر گلِ نو خاستہ میں مخفی ہے
 ہر طرف طرف تماشا کے نظر بندی ہے کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
 پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے
 غم سے گھل کر گلِ بدول کے اشکوں میں ہے میں نے اب تک تو تم وعارہ خلا فی کے ہو
 منتظر کیوں ہوں تمہارا کوئی اب لاکھ کہے موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بنائے نہ ہے
 تم کو چاہا ہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

۱۔ اس شعر کی تشریح غالب صاحب نے منشی نبی بخش حقیر کو اس طرح لکھی ہے "بھائی مجھ کو تم سے بڑا تعجب ہے کہ اس
 بیت کے معنی میں تم کو تا مل رہا اس میں دو مستفہام آئے ہیں کہ وہ بطریق طعن و تعریف معشوق سے کہے گئے ہیں
 موت کی راہ نہ دیکھوں۔ کیوں نہ دیکھوں؟ میں تو دیکھوں ہی گا کہ بنائے نہ ہے کیونکہ موت کی شاخ میں سے یہ
 بات ہے ایک دن آئے ہی تھی انتظار ضائع نہ جائے گا۔"

تم کو چاہوں، کیا خوب کیوں چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے یعنی اگر تم آپ سے آئے تو آئے اور اگر نہ
 آئے تو پھر کیا حال کہ کوئی تم کو بلائے گویا یہ عاجز معشوق سے کہتا ہے کہ اب میں تم کو چھوڑ کر اپنی موت کا عاشق
 ہوا ہوں۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ بن بلائے بغیر آئے نہیں رہتی تم کو کیوں چاہوں کہ اگر نہ آؤ تو تم کو بلا نہ سکوں۔
 یہ غزل غالب صاحب نے منشی نبی بخش حقیر کو اس غزل کے ساتھ جس کا مطلع ہے
 کہتے تو ہو تم سب کہ بہت غالب تو آئے اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ "وہ آئے"

اس سال کی تھی۔

ہیں برے بیچ میں تقدیر سے ہم آگے ہوئے بات بنتی نظر آتی نہیں تدبیروں سے
کر دیا ہے ہمیں مجبور بہت قسمت سے بوجھ وہ سر سے گرا ہے کاٹھائے نہ اٹھے

کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے
عشق کی خاک کرے کوئی ستائش غالب الاماں قہر ہے اس برق کی تابش غالب
بارہا کی ہے یہ مزلے گزارش غالب عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

ایا مزا کو جسے دیکھتے ہی غش غالب تم نے دیکھا نہیں وہ شعلہ کمرش غالب
بابا الفت میں عبت تم ہو مشوش غالب عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے



شبِ فراق میں لحت وہ بے صاحب دے لگی ہر آگ جو سینہ میں اس کو آب تو دے
نجات غم سے وہ پڑہ نشیں شراب تو دے وہ آگے خواب میں تسکین اضطراب تو دے
وے مجھے تپیش دلِ مجالِ خواب تو دے
جوابِ غیظ و غضب سے ہر ایک کو دینا ہر ایک کن میں دونوں جہاں سو کھود دینا
وہ بھر کے سانس جگر میں چھری چھود دینا کرے ہے قتل رگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے
لے حاشیہ ص ۲ پر

لنگے منہ سے عطا کوئی جام کریم کو امیدوار نہ یوں صبح و شام کریم کو
جواب تلخ ہی سے شاد کام کریم کو دکھائے جنبش لب ہی تمام کریم کو
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

خیال چھوٹ سے بچنے کا ہے نہ عادت ہے نہ اجتناب کسی سے نہ کچھ عداوت ہے
ہمیں سے اک تجھے پرہیز اور کراہت ہے پلائے اوک سے ساقی جو ہم ک نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

شب اسکی بزم سے اغیار یوں ملول گئے کہ پاؤں ٹھ گئے اور چو کڑی وہ بھول گئے
قبول خدمت مزا ہوئی وہ غول گئے اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے مے ہاتھ پاؤں داب تو دے

حاشیہ ص ۲ کا۔ اس غزل کے بارے میں مرزا علاؤ الدین کو بڑے قلق کے ساتھ لکھا ہے پچاس برس کی بات ہے کہ انہی فحش خاں مرحوم نے ایک زمین نئی نکالی میں نے حسب انکم غزل لکھی۔ بیب الغزل یہ ہے پلائے لوک سے ۱۰۰ اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے نکھ کر اس مطلع اور اس بیت الغزل کو شامل ان اشعار کے کر کے غزل بنالی ہے اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں مطلق اور ایک شعر میرا اور پانچ شعری اتوکے جب شاعری زندگی میں گائے والے شاعر کے کلام کو مستخرج کر دیں تو کیا بعید ہے کہ دو شاعر متوفی کے کلام میں مطربوں نے غلط کر دیا ہو۔

اس مطلع سے متعلق ایک لطیفہ بھی ہو سکتا ہے غالب صاحب ایک مرتبہ بیٹنگ پر پڑے ہوئے کو کہہ رہے تھے۔ مہر مہری پاؤں دباے لگے غالب صاحب نے کہا بھئی تو سید زادہ ہے مجھے کیوں گناہ گار کرتا ہے۔ انھوں نے مانا اور کہا ”آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو میرا بے کی اجرت دیتے تھے“ غالب صاحب نے کہا ”ہاں اس کا مضائقہ نہیں“ جب وہ پیراب چلے تو اجرت طلب کی۔ غالب نے کہا ”بھئی کیسی اجرت تم نے میرے پاؤں دباے میں نے تمہارے پیسے دباے“

اُدھر نہ گفتہ بہ حال ہوں و خوارِ بستر ہے اُدھر مجھے تن خود میسے حق میں خارِ بستر ہے
دلِ بیتابِ مضطرب باعثِ آزارِ بستر ہے تپشِ گیری و وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے

مرامِ رنجِ بالش ہے مرا تنِ بارِ بستر ہے

حقیقتِ اشکِ اورِ دل کی تم سہ کیا کہیں ہے مگر ہاں محضِ سرِ لو کہ وہ کیا شے ہے یہ کیا شے
ہمائے نازِ پردوں میں ہیں و نونِ راک ہے سرِ شکِ سرِ بحرِ ادا دہ نورِ العینِ امن ہے

دلِ بے دستِ پُراقتادہ بر خورِ دارِ بستر ہے

نہے قسمتِ کرمِ یوں بے بلائے میسے گھر آؤ مے بیتِ الحزن کے جاگ اٹھے نہ نصیبِ ایتو
مرضِ کا اپنے بڑھ جانا مبارک ہو گیا مجھ کو خوشا اقبالِ بخوری عیادت کو تم آئے تو

فروغِ شمعِ بالیس طالعِ بیدارِ بستر ہے

ہوا اندھیر گھر میں کیا بلا وقت کی رات تھی در و دیوار پہ کس غضب کی تیرگی چھائی
مگر ہاں گھر: بستر کی بدلت روشنی پائی بہ طوفانِ گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی

شعاعِ آفتابِ صبحِ عشرتارِ بستر ہے

خدا کا شکر ہے تقدیر ہے جاگی ہوئی اپنی پھر اسکے خواب میں آنی کی حسرتِ یوں بین ہوئی
بتائیں کیا ابھی کل ہی تو وصلِ یار کی شب تھی ابھی آتی ہو بالمش سے سکی زلفِ مشکیں کی

ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

ہوا ہے مبتلا مرزا عجب آزار میں غالب رہا کچھ بھی نہ باقی اسکی جانِ ناز میں غالب
 نہیں ٹھٹھنے کی بھی طاقت آنکھ میں غالب کہوں کیا دیکھی کیا حالت ہر بحرِ یار میں غالب
 کہ بے ثباتی سے ہر اک تارِ بسترِ خارِ بستر ہے

۱۱۳

بہی ہر بات اہنگ تو کہیں اُن بے نہ ہو جائے محبت کی جگہ نفرت تجھے پُرفتن نہ ہو جائے
 رہا غرہ تو میرِ نفس ہی رہن نہ ہو جائے خطر ہے رشتہ الفتِ رگِ گردن نہ ہو جائے
 غرورِ دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جائے
 کمالِ فصلِ گل کہتے ہیں سکو مرزا غالب کہ ہو ہر ہر شجر پہنے ہوئے گل کی قبا غالب
 سرگلاب کھلیں دو چار گل تو کیا مرزا غالب سمجھ اس فصل میں کوتاہی نشوونما غالب
 اگر گل سرو کے قامت پہ پیراؤن نہ ہو جائے

۱۱۴

کیا جانے اصول ہے نہیں ہے آہنگ بھی کوئی طے نہیں ہے
 باقاعدہ کوئی شے نہیں ہے فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
 نالہ یا بندِ لے نہیں ہے
 گلشن کو غرض نہیں جو سے کیا معنی ہیں پھر کہنے کے

کشکول کا کام کیا نہ لیں گے کیوں بوتے ہیں باغباں تو بنے
گر باغ گدائے نہیں ہے

جود تیرا ہی چار سو ہے ہر ایک کو تیری جستجو ہے
تجھ سے ہی گلوں میں رنگ و بو ہے ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ کی تو کوئی شے نہیں ہے

بے جا بے خودی و خود پرستی ایک وہم و خیال ہے یہ بستی
لاشے بے یہ اوج اور پستی ہاں کھا میو مست فریب ہستی
ہر چند کہیں کہے نہیں ہے

پیوستہ ہر ایک شے بے ضد ہے ہوتی ہے نشاط بعد غم کے
خواہاں بے اگر الم سے چھوٹے شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے
ار دی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے

کچھ وہم مگر تجھے ہے زاہد انکار شراب سے ہے زاہد
ملتی یہ شے کسے ہے زاہد کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد
مے ہے یہ نگس کی قے نہیں ہے

مرزا ترا ہم قدم ہے غالب دھیان اس کو یہ دمدم ہر غالب
دم کہتے ہیں جس کو دم ہے غالب ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب
آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

کچھ رشک قیبوں ہی سے تنہا نہیں کرتے اپنی بھی نظر سے انھیں دیکھا نہیں کرتے
جان لے جو لب پر کھٹی تو پروا نہیں کرتے ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے

وہ غیر جو کہتے ہیں یہ کہنا ہے زبانی لیکن ہے رقیبوں سے رکاوٹ کی نشانی
ہم سے کوئی آسان ہویوں بات بنانی درپردہ انھیں غیر سے ہے ربطِ نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پروا نہیں کرتے
قابو نہ کسی شخص کا تم پر ہے نہ بس ہے مانو تو یہ مرزا کی نصیحت تمھیں بس ہے
باز آؤ اگر مہر و وفا سے تمھیں مس ہے یہ باعثِ نومیدی اربابِ ہوس ہے
غائب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

مرے سببِ یخستہ فگر ہے کیا کیئے غریب کشتہ تبغِ نظر ہے کیا کیئے
فریبِ حسن سے یہ بے خبر ہے کیا کیئے دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کیئے
ہو ارقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کیئے

اے غالب صاحبِ منشی ہی بخش حق کو گھبرا کر بھائی یہاں بادشاہ نے قلم میں مشاعرہ مقرر کیا ہے ہر پہنچے میں دو بار
مشاعرہ ہوتا ہے پندرہویں کو اور انیسویں کو حضورِ قادری کا ایک مصرع اور بیچے کا ایک مصرع (باقی ص ۱۱۷ پر)

بدن سے جان کی طرح جائے بن نہ رہے فراق جسم کا صدمہ اٹھائے بن نہ رہے
مگر ہیں تو یہ پھر بھی ستائے بن نہ رہے یہ ضد کہ آج نہ آئے اور آئے بن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہیں کس قدر ہے کیا کہیے

ضرور ہے کوئی موجودگی کا اسکی سبب اسی گوشت میں پایا وہاں گئے ہم جب
کچھ اور نقل ہی اس کو نہیں ہے روز و شب ہے ہریوں کو دیکھ کر کوئے دوست کو اب
اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیے

ہم آئے سر پہ تھا جنگ شباب کا اسیدب نہ راہ عشق کا سو جہاں بھی فراز و نشیب
اس اک گمان سے حاصل نکل کو مشرب و شیب نے کرشمہ کہ بوں نے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہے کیا کہیے

ہم آئے درد و الم کا ہوا کہ ان کو خیال بلا کے گھر کبھی پوچھی نہ وہ رنج و ملال
وہ بے کچھ نہیں یہ ہے ایک ان کی چال سمجھ کے کرتے ہیں ہا زاریں وہ پریش حال
کہ یہ کہے کہ سر رہ گزر ہے کیا کہیے

تمھارے انس و محبت کا رعب احوال کہ بات بات میں ہر دو مستوں رنج و ملال
تخصیص سے ہم کی اگر ہوں تو ہونا ہال تمھیں نہیں ہے سر رشتہ وفا کا خیال

بقیہ ص ۲۰ کا مطلق کرنے پر اب تادی التادی کی میسویں کو جمعہ مشاعرہ ہوا کہیں مصرع فارسی یہ تھا کہ
زیں تماشا گاہ گرمان می رود۔ یہی مصرع یہ تھا کہ جماعت حق ہوں کہ نہ ہے کیا کہیے۔ نظر ہے کیا کہیے خبر کیا کہیے۔
میں نے ایک غزل ندر کی اور ایہ ریہ موافق طرح کے اور دو سوار غزل ای طرح میں سے ایک اور صورت
ذکاں کرئید وہ عینوں غزل میں تم کو کھنا ہوں یہ طرح لینا اور میان تفتہ کو بھی دکھالینا ؟

ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا کیئے
 کبھی کیا بھی جو کچھ عرض حال دل ہم نے
 تو مسکرا کے کہا کیوں ہوئے ہو دیوانے
 فضول ہو چئے ہر وقت دو بدوان سے
 انہیں سوال پر زعم جنوں ہے کیوں لڑیئے
 ہمیں جواب سے قطع نظر ہے کیا کیئے
 کسی کو ہم سے اگر رشکِ فن ہے کیا کیئے
 حسد کی آگ اگر شعلہ زن ہے کیا کیئے
 جہان کی یہی رسم کہن ہے کیا کیئے
 حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیئے
 ستم بہاے متاعِ ہنر ہے کیا کیئے
 کٹے جہان میں مرزا بہر مشکل اس کے دن
 نہزار عیب لگاتے ہیں اس کو بد باطن
 بُرا بُرا اسے کہتے ہیں سب جوان و مُسن
 کہا ہے کس نے کہ غالب بُرا نہیں لیکن
 سوائے اس کے کہ آشفۃ سر ہے کیا کیئے

جب تلک آزاد تھا کب تھی پریشانی مجھے
 کچھ بچ کر زنداں میں لائی میری جولانی مجھے
 تخی عدم میں ہر طرح حاصل تن آسانی مجھے
 دیکھ کر در پردہ گرم دامنِ انشانی مجھے
 کر گئی وابستہ تن میری عربانی مجھے
 یوں مرا سینہ دہائے وہ مری قسمت کہاں
 اور کیا اسکے سوا ہے خوش نصیبی کا نشان
 اور گلے پر اسکے ہاتھوں سے ہولیوں خجرواں
 بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں

مرحبا میں۔ کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے

رات دن اتنے اسکا تصور پے بہ پے مجھ کو عرض حال میں مانع نہیں بھر کوئی شے
ہوں سی دھن میں ہی مجھ کو لگی رہتی ہے کیوں نہ ہو بے التفاتی اس کی خاطر جمع ہے

جانتا ہے جو پرستہاے پنہانی مجھے

میری بربادی تو قدرت نے مقدر کی ہی تھی اس پر طرہ یہ ہوا گھر کی بلا سر پڑ گئی
یہ ہوئی اچھی عنایت کاتب تقدیر کی میرے غم خانے کی قسمت جب تم ہونے لگی

لکھ دیا منجملہ اسباب ویرانی مجھے

ملتی جلتی ہے فغاں اسکی مری فریاد سے شوق سے سنتا ہوں اپنا ہم نوا پا کر اسے
ڈال رکھا ہے پریشانی میں اسکے وہم نے ہر گناں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاشکے

اس قدر ذوق نوائے مرغِ بستانی مجھے

چرخ کے ہاتھوں پہ پایا چین میں جب تک حیا داؤں جب اس کا چار کچھ ہی مجھ پر کیا
تنگ آکر زسیت سے جامِ اہل آخر پیا وائے واں بھی شورِ مٹرنے نہ دم لینے دیا

لے گیا تھا گور میں ذوق تن آسانی مجھے

پر رقیبِ روسیہ یوں ہی اگر دمسائے جھوٹ پر رغبت دلائیگا کہ تو دوبار ہے
منتظر رکھنا کسی کو یہ بھی کوئی ناز ہے وعدہ آئے کا وفا کچھ یہ کیا انداز ہے

تم نے کیوں سوچی ہے میرے گھر کی دہانی مجھے

چاہیے بھائی سے یوں بھائی کو مرزا دوستی ہو جو اس کو خرمی تو خرمی ہو اس کو بھی

جس طرح غالبؔ کی اس شعر میں ظاہر ہو چکی
دی مرے بھائی کو حق نے از سر نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالبؔ یوسف ثانی مجھے

۱۱۸

خود فراموشی ہوئی وقتِ مسرت کب مجھے دل ہی جنالوں پہ پھر فرحت کیا مطلب مجھے
لب پر اس کا نام تھا کچھ درد پہنچا جب مجھے یاد ہے شادی میں بھی ہنگامہ یارب مجھے
بسوزِ زاہد ہوا ہے خندہ زیر لب مجھے

کہہ گیا دل رفعِ دل سے ہو گیا رنج و عن کر رہا ہے پرسشِ احوال ہر غمچہ دہن
باتِ نجاتی ہو تباہ جو کوئی حرفِ زن ہے کشادِ خاطر و البستہ در رہن سخن
معا طلسمِ قفلِ ابدِ خاندہ مکتب مجھے

اک طرف چپکے پڑا تھا کیا نے ندان میں تھے کیوں نہ آئیں یادِ رہ کر وہ ن آرام کے
دہلت اب ام بھر نہیں آوارگیِ دشت سے یارب اس استغنیٰ کی داؤد کس سے چاہیے
رنگِ اسلش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

راتِ بے ہستی بڑا نکسوں والی ک جوئے خوں حالِ دل بھی ہو گیا ہے کثرتِ غم سے زبوں
عمر گزی ہو کر میل اس ذوق کا شوکرہ ہوں طبع ہے مشتاقِ لذتِ ہائے حسرت کیا کرو
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

جھوٹے فرماتے تھے طنز کیوں تم ایسے ہو گئے کیا ہوا مژرا تمہیں دیوانے کس کہو مجھے

اب تو صرت کیلئے موزوں یقہ ہو گئے دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع ہیزا صاحب مجھے

کمالِ علم اہلِ انجن کی آزمائش ہے ہنر کا امتحاں ہے اہل فن کی آزمائش ہے
ہراک نو مشق و مشاق کہن کی آزمائش ہے حضور شاہ میں اہل سخن کی آزمائش ہے

چمن میں خوشنویاں چمن کی آزمائش ہے
معن میں ہر گرفتارِ معن کی آزمائش ہے گداز و سوز میں شمع لگن کی آزمائش ہے
قفس کی قید میں رخِ چمن کی آزمائش ہے قد و گیسو میں قیس و کوہن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

کہیں ایسا نہ ہو محنت ہو اسکی رائیگاںِ آخر نہ جوئے خوں ہو جوئے شیر کے بلے رواںِ آخر
غم شیریں ہے گا کس طرح وہ نیم جاںِ آخر کریں گے کوہن کے حوصلے کا امتحاںِ آخر
ہنر اس خستہ کے زیرِ تن کی آزمائش ہے

سنا ہے اس نے کہ یعقوب کی آہ بھر گاہی سنگھار بوئے یوسف اسے کب اسکی خوشی چاہی
ہوئی چراہی مطلب کے کغال کی نظر اہی نسیم مصر کو کیا پیر کغال کی ہوا خواہی
اسے یوسف کی بوئے پیر بن کی آزمائش ہے

یہ کیا کرتے ہو تم ضبط و تحمل کے غلط دعوے یقین جاؤ کہ ہوش اڑ جائیگے جب سکو دیکھو گے

جسے دعویٰ ہوا اہل بزم میں بے سبب و سبب سے
وہا یا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر غافل تھے

شکیب صبر اہل انجن کی آزمائش ہے

نشانے دو ہیں جسکو بھی ارادے اسکا تیرا کر
تو پھر شک وارانہ بازی میں اسکی کیجئے گونہ کر
کماں کو کھینچنا ہی اسکا اک احسان ہر دم پر
ہے دل ہی میں تیرا چھوڑ کر کے پار ہو بہتر

غرض شہست بہت ناوک فلن کی آزمائش ہے

بظاہر تو یہ دونوں ایک ہی بات کہیں دانی
مگر رسم پرستش مختلف دونوں ٹھہرائی
عبث گردن ہر اک زشتہ الفت میں نہ ہوا
نہیں کچھ سحر و زنا رکے پھندے میں گیرائی

وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

نتیجہ نا شکیبائی کا آخر کیا ہے لے غافل
ترپنے سے کہیں آسان ہو سکتی ہے مشکل
دھوکے کہیں تجھ پر کوئی تازہ بلانا زل
بڑا رہ لے دل ابستہ بیتابی کو کیا حاصل

مگر پھر تاپ زلف پر شکن کی آزمائش ہے

ہمارا قصد تھا کھیں کسی نہ بھی اس کم کو
مڑہ لینے نہ پائے خود بخود گھٹنے لگے ہم تو
زباں کا ذکر کیا اسکا اثر آگے تو بڑھنے دو
رگ و پے میں جیتنے رہے غم تب دیکھئے کیا ہو

ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہے

سنا تو ہے انھوں نے ارادہ کر لیا غالب
کہ وہ مرزا سربانہ میں عہد پیمان فا غالب
مگر اب دیکھئے یہ چرخ لائے رنگ کیا غالب
وہ آئینے مے گمر، وعدہ کیسا، کھینا غالب

نئے فتنوں میں اب جہر خ کہن کی آزمائش ہے

اگر وہ روٹھنا ہو کر مٹا جائے ہر مجھ سے سر پہ مل بھی جاتا ہے تو کنیا جائے ہر مجھ سے
غرض جتنا بنا تا ہوں بگڑتا جائے ہر مجھ سے کبھی نیکی بھی اسکے جی میں گر جائے ہر مجھ سے
جفا میں کر کے اپنی یاد تیرا جائے ہر مجھ سے

نظر آتا ہے خواب وصل تو تعبیر الٹی ہے بگڑتا ہے بکر کام کیا تقدیر الٹی ہے
مرے سب کام الٹے ہیں مری تدبیر الٹی ہے خدا یا جذبہ دل کی مرے تاثیر الٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں وہ کھینچتا جائے ہر مجھ سے

اسے کیونکر سناؤں حال دل پر سخت حیرانی پریشانی کا مضمون و ربیہاں میں پریشانی
کھلائے دیکھئے کیا گل میسے قاصد کی نلوانی وہ بدخوا اور میری داستان عشق طولانی
عبادت محقر قاصد بھی گھبرا جائے ہر مجھ سے

یہ میری سرگزشت ان کیلئے جھوٹی کہانی ہے انھیں سننے کو نفرت پر یہاں طلی سانی ہے
بمخمسہ دشوار اپنے دل کی کیفیت سنانی ہے ادھر وہ بدگمانی ہے ادھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہر ان سے نہ بولا جائے ہر مجھ سے

ہماری زلیست امید تصور کی بدولت ہے قضا کا سامنا ہو کیا بلا ضعف و نقاہت ہے
خیالی زندگی پرور نہ کیا جینے کی صورت ہے سنبھلتے درجھے نے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ داماں خیالی یا رچھوٹا جائے ہر مجھ سے

گوارا دل کو یک پر کر دیکھیں سکو انس جن تقاضا رشک کا یہ ہے وہ آنکھوں میں ہو سکن
 وہ جب جلوہ نما ہوگا تو ہوگا حشر کا وہ دن تکلف بر طرف نظارگی میں بھی بھی نہیں
 وہ دیکھا جائے کب ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

بمچھ کھاتھیں نے عشق کو اک دل لگی دل کی کہاں کی دل لگی یہ تو مصیبت پڑ گئی ابھی
 خبر کیا مجھ کو اس کی معرکہ آرائیوں کی نفی بھٹے ہیں پاؤں ہی پہلے برد عشق میں زخمی
 نہ بھاگا جائے ہر مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

مجھے آتا ہے یہ خواب پریشاں کیا نظر غالب بنے گی دیکھئے کسی دل بیتاب غالب
 نہ کیوں اس شکست ہونوں مرزا کا بلکہ غالب قیامت ہر کہ ہوئے مدعی کا ہم سفر غالب
 وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہر مجھ سے

(۱۲۱)

گردش میں جو ہے گنبدِ خضرا مے آگے فانوسِ خیالی کا ہے نقشامے آگے
 ہے ارض کو اک گیند کا رتبہ مے آگے بازیچہ اطفال ہے دنیا مے آگے
 ہوتا ہے شب و روز تماشا مے آگے

اک بلبہ ہے گنبدِ گرداں مے نزدیک دُکے سے بھی کمتر ہے بیاباں مے نزدیک
 ہے شعبہ نیرنگیِ دوراں مے نزدیک اک کھیل ہے اورنگِ سلجاں مے نزدیک
 اک بات ہے اعجازِ میحامے آگے

عواض ہیں اوہام تو اجسام ہیں مستور
جز نام ہی نام انکا حقیقت کو ہیں سب دور
ہر رنگ میں موجود ہے صرف ایک وہی نور
جز وہم نہیں ہستی اشیاء مرے آگے

اڑتا ہے بیابان کا خاکا مرے ہوتے
اٹھتا ہے بگولے پہ بگولا مرے ہوتے
اشکوں سے ہر سیلاب کا نقشہ ہوتے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرے ہوتے
گھستتا ہے جبین خاک پہ دریا مرے آگے

دیکھ تو کوئی دل کا ٹرنا ترے پیچھے
کیا کیئے گزر جاتی ہے کیا کیا ترے پیچھے
جینا مجھے دشوار ہے گویا ترے پیچھے
منت پوچھ کہ کیا حال ہر میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

حاشیہ ص ۲۱۳ کا :- اور ایک سلیمان حضرت سلیمانؑ کا تخت حضرت سلیمانؑ ایک بیگز گزے ہیں۔ انکی بادشاہت بنی نوع انسان برہی رہتی مگر تہذیب و تمدن اور حوں پر بھی انکی حکمرانی تھی اور جنوں کی مدد سے انکا تخت ہوا میں اڑتا تھا۔ اعجاز کیا۔ عیسیٰؑ کے مچرے صحرے میں بھی ایک۔ عجز یعنی انکے مچرے اور کمالات بہت تھیں۔ انکا ایک معجزہ یہ بھی تھا کہ وہ اپنی بیویوں کے مودوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے۔

سلیمانؑ کا تخت میرے نزدیک ایک کھیل کی حیثیت رکھتا ہے اور حضرت عیسیٰؑ کا معجزہ میرے آگے ایک معمولی کی باس ہے یعنی شاہانہ توکس اور پیغمبرانہ معجزے میری نظر میں کچھ بھی نہیں ہیں۔

اس غزل کے متعلق منشی نسی محسن حسیہ کو لکھتے ہیں دربارہ آگے، صحرے آگے اس پر بھی ایک سال گزر چکا ہے فلاح مبارک کے مشاعرے کی غزل ہے یہ دہلی اردو اخبار میں اس تمہید کے ساتھ بھیجی ہے۔

منگل کے دن صبح کو شعر اے قلعہ مبارک اور شہر کے دیوان خاص میں مجتمع ہوئے حضور اقدس اعلیٰ برآمد اور جلوہ فرمائے تخت ہوئے۔ جناب حضرت ولی عہد بہادر زبیر افغانیؒ کی اور مرزا مغل بہادر اور مرزا نصر سلطان بہادر اور مرزا حواں تخت بہادر اور شہزادگان والا تبار بعد باریابی بحر احب المکم قصا توام شرف شمس (باقی ص ۲۱۵)

ہوتا ہوں میں جس وقت سے نابہ سرشار اٹھے ہیں تجلات عیاں ہوتے ہیں اسرار
ہے نشہ سے وابستہ گہر ریزی افکار پھر دیکھئے انداز گل افشانی گفتار
رکھ دے کوئی پیمانہ و صہبامے آگے

رہتا تھا شب و روز اسی بات پہ جھگڑا ذکر اس کا کرے کوئی مجھے کب تھا گوارا
اب لاکھ کوئی ذکر کرے کچھ نہ کہوں گا نفرت کا گماں گزرتے ہیں رشک سے گزرا
کیوں کر کہوں لو نام نہ اس کا مرے آگے

اسلام ہو مانع جو مجھے دوڑ کے لے کفر ہر چیز عقیدت سے جگہ اکھولیں دے کفر
حاضر ہے خدمت کو کرماندہ سے ہوئے کفر ایمان مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کیسا مرے آگے

میں وہ ہوں کہ جس کام کو چاہا نہ رکا کام اس شوخ کے آگے نہ چلا پر نہ چلا کام
حیرت ہے کہ کیوں اپنی تمنائیں ہوں نا کام عاشق ہوں پر معشوق فوجی پر مرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہے یسلی مرے آگے

وقت میں گزرتے تھے جو سو طرح کے صدمے کرتا تھا دھار و کھپس جسم سے نکلے
اب ان سے جو ملنا ہوا دی جان خوشی سے خوش ہوتے ہیں پر میل میں یوں نہیں جاتے
آئی شب ہجران کی تم مرے آگے

موجود ہے جو سوز دروں کا شہ بھی ہو ہے جعفر اب جوش جنوں کا شہ بھی ہو

بقیہ صفحہ ۲۱۶ کا ۱۸۔ حسب مراتب مقام معزز و مکرم ہوئے۔ بارہ ہر ایک بچے تک حضور اقدس جلوہ فرما ہے۔

اب تک ہے جو کچھ مال زبوں کاش ہی ہو ہے معجزن اک قلزم خوں کاش ہی ہو

آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

نظارہ نے نزع میں بھی دافع غم ہے اٹھواتے ہو کیوں پاس کی کیا یہ کوئی کم ہے

ٹھہرو کہ یہ برتاؤ دم مرگ ستم ہے گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے

رہنے دوا ابھی ساغ و مینا مرے آگے

وابستہ ہے اس ذات سے جو نابے میرا اس امر میں مرزا ابھی ہم آواز ہے میرا

ہم کار ہے اور ہمد او دمساز ہے میرا ہم پیشہ وہم مشرب و ہمارا ہے میرا

غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

۲۲۲

امید کیا ہے جو کچھ اپنا مابرا کیئے ہماری بات کو کب آپ نے سنا کیئے

کروں جو شکوہ تو پھر کیا مری خطا کیئے کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کیئے

تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کیئے

اگرچہ حسن کے جو رجو جفا ہی زلیور ہیں حسین انھیں سے تو آراستہ سرا امر ہیں

خدا خواستہ کب یہ تمہارے جو ہر ہیں نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستم گر ہیں

مجھے تو خوب ہے کہ جو کچھ کہو بے کیئے

جو آشنا ہو وہی آشنا کے گھر مائے نہ بڑھ سکے کا قدم کوئی غیر اگر جائے

جسے جو جس سے تعلق وہ بے خطر جائے وہ میسر سہی پر دل میں جب اتر جائے

نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کیے

ہزار سینے کو چھلنی بنائے زخمِ سناں کشادہ دل میں مگر تیر کو بے دخل کہاں

کھلا ہوا ہو جرات تو ہے وہ رستا ہاں نہیں ذریعہ راحت جرات پر کیاں

وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کیے

بشر کو چاہیے ہو صاف سید کیے سے بُرا ہے ظلم و ستم گو ہو ظلم کے بدلے

مزا تو یہ ہے کہ بن جاؤ دوست دشمن کے جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیے

جو ناسزا کہے اس کو نہ ناسزا کیے

کبھی جو بیٹھ بھی جاتے ہیں ہم غزل لکھنے تو بار بار تقاضے یہ ہوتے ہیں دل کے

کہ آج خوب ہی جی بھر کے رویے دکھڑے کہیں حقیقتِ جاں کا ہی مرض نکھڑے

کہیں مصیبتِ ناسازی دوا کیے

کبھی بیانِ ملاں دلِ حزیں کیے کبھی فغانِ جہاں سوز و آتشیں کیے

کبھی روایتِ ہجرتِ حسیں کیے کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیے

کبھی حکایتِ مبرگرِ نیرِ پا کیے

نجاتِ غم سے جو دے اس کو اور کیا دیے نثار کیے دل کو یہی صلا دیے

جو سراٹاے تو جلاد کو دعا دیے رہے نہ جان تو قاتل کو نحوں بہا دیے

کئے زبان تو بخیر کو مرحبا کیے

جو یار پاس نہیں ہے خیال یار تو ہے تصور اس کا شبِ غم میں غلگسار تو ہے
 یہ اک ذریعہ تسکین جانِ زار تو ہے نہیں نگار کو الفت نہ ہونگار تو ہے
 روانی روش و مستی ادا کیے

جو فرش گل نہیں حاصل تو سبزہ زار تو ہے چمن نہیں تو مرا سینہ داغدار تو ہے
 جو گل نصیب میں اپنے نہیں ہزار تو ہے نہیں بہار کو دھت نہ ہو بیار تو ہے
 طراوت چمن و خوبی ہوا کیے
 نہات غم سے نہ ہوگی یقین تھا غالب مقامِ شکر ہے سر سے ٹلی بلا غالب
 یہی ہوسلک مرزا بھی میرزا غالب سفید جب کہ کنارے پر الگا غالب
 خدا سے کیا تم و جوہرِ نا خدا کیے

۱۲۳

با آبرو تو خلق میں کیا خاک ہو گئے تھے غرقِ بحرِ شرم کہ پیر اک ہو گئے
 مشہور اک زمانہ کے چالاک ہو گئے رونے سے اور عشق میں بیدار ہو گئے
 دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

نئی کشتی کی چاٹ جو بیٹھ بگی ہوئی پینے میں ہم نے آنکھ پہر کچھ کمی نہ کی
 آخر کو رنگ لاکے رہی اپنی مفلسی صرف بہائے ہوئے آلاتِ کشتی
 تھے یہی دو حساب سولیوں پاک ہو گئے

پلٹے نہیں ہو اب تو ذرا بھی کسی سے تم ہر اک سے پیش آنے لگے دل لگی سے تم
 جا جا کے اب تو ملنے ہو ہر آدمی سے تم رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم
 بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

جن کو نہیں ہے عاشقی و عشق کی خبر ہوتے ہیں معترض وہی تاثیرِ آہ پر
 گلشن میں دیکھیے اثرِ آہِ الحذر کہتا ہے کون نالہ بلبیل کو بے اثر
 پرے میں گلی کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

دل میں وہ آگ تھی کہ سراپا جلا دیا ہستی کو عاشقوں نے دیا خاک میں ملا
 پایا انھوں نے زندگی شمع کا مزا پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہل شوق کا
 آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

کرتے تھے جی ہی جی میں دمِ رنج و غم گلہ تھا عالمِ خیال ہی میں دمِ بدم گلہ
 جرات جو پھر بڑھی تو ہوا ہم کو سم گلہ کرنے گئے تھے اس کے تغافل کا ہم گلہ
 کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

مزارِ جودِ دل تھا اس کے لئے بے بود و باش کرتے ہی قتل اس کو کیا پہلے پاش پاش
 ظالم نے خود ہی کر دیا پردہ ستم کا فاش اس رنگ سے اٹھائی کلی اسنے اسد کی لاش
 دشمن ملی جس کو دیکھ کے غم ناک ہو گئے

۲۲۲

بُجھ کو غم سے رہا کرے کوئی غم گساری ذرا کرے کوئی
 لاکھ دعویٰ کیا کرے کوئی ابن مریم ہوا کرے کوئی
 میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

حلقہ زلف حلقہ زنجیر دونوں ابرو ہیں خنجر و شمشیر
 جلوہ حسن وہ کہ برق نظیر چال جیسی کڑی کمان کا تیر
 دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

میرا قاتل وہی نگار سہی دو جہاں میں قصور وار سہی
 خوں بہا اس کے سر ہزار سہی شرع و آئین پر مدار سہی
 ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

اس کی محفل تمام گونجی ہے کچھ کہے کس کو تاب اتنی ہے
 لب ہلائے مجال کس کی ہے بات پرواں زبان کتنی ہے
 وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

ذکر ہوتا ہے جا بجا کیا کچھ غور کرتے ہیں آشنا کیا کچھ
 کہہ گیا دل کا مدعا کیا کچھ بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
 کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

جو لڑے اس سے تم لڑو نہ کبھی رکھو آزاد زندگی اپنی
کیا ضرورت جواب دینے کی نہ سناو گر بُرا کہے کوئی
نہ کہو گر بُرا کرے کوئی

کوئی تم کو جو دے اذیت بھی درپے انتقام ہونہ کبھی
رہنمائیِ خلق ہے اچھی روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

جو بظاہر ہی خرم و خور سند وہ ہیں ناشاد تم سے بھی دہ چند
ہے درِ احتیاج کس پر بند کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیوں نہ شکوہ کریں مقدر سے کھینچ لایا ہے دشت میں گھر سے
رکھئے امید خاک رہبر سے کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

ان سے جب تک امید تھی غالب شکوہ سخی کی خور ہی غالب
حق ہے مرزا کی خامشی غالب جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیا کسی سے گلا کرے کوئی

اے خضر و سکندر راقعہ مشہور ہے خضر و سکندر بادشاہ کو آپ حیات کے چشمے پر لگئے۔ خود تو آپ حیات پئی لیا
اور سکندر کو ان لوگوں کے سامنے لگئے جو آپ حیات پھا کر پوچھ طولِ اعریٰ ضعیف و ناتواں ہو کر ڈھلے بغیر
لگے تھے سکندر نے عالم دیکھ کر آپ حیات پینے سے انکار کر دیا یہ عجیب اس شعر میں ہے۔ (باقی ص ۳۲۳)

فلک کے جوئے غم کیا ہے اور ہم کیا ہے یہ میری تاک میں اور درپے ستم کیا ہے
 جوئے کدہ ہے سلامت تو پھر الم کیا ہے بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے
 غلام ساقی کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

تمہارے قول ہیں کیا چیز اور قسم کیا ہے نال اس کا ستم ہے تو یہ کرم کیا ہے
 ذلیل ہو گا کسی دن اسے بھرم کیا ہے تمہاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے
 رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے

نجومیوں کے خیالات فام ہیں بے سود نہ سعد و حس نہ انکے شگون کا ہے وجود
 کسی پر کھل نہیں سستی مشیت معبود لکھا کرے کوئی احکام طالع مولود
 کسے خبر ہے کہ واں جنبش قلم کیا ہے

کرے حلف سے بھی وہ بت جو ترکِ روجھا مجھے یقین نہ آیا نہ آئے گا اصلا
 خلا سے مخوف اور منکر جزا و سزا نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا
 خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے

ہوئی ہے مہرِ سلیمان کی عدل سے حکم دکھائی دیتا تھا عالم یہ جام پر تھا بھرم
 انھیں صفات سے دونوں کا ہے وجود عدم وہ داد و دید گرا نما یہ شرط ہے ہمد

بقیہ صفحہ ۲۲۱ کا ۱۔ فرمے ہیں حضرت سکندر سے کیا کیا؟ یعنی کچھ نہیں کیا۔ گویا آخر کی رہنمائی سے بھی سکندر کو کچھ حاصل نہیں ہوا کوئی اب کسے رہنما بنائے۔

وگر نہ فہرِ سلیمان و جامِ جم کیا ہے
 بلا کسی نے کہا ہے کسی نے دام اسے کسی نے دی اسے تشبیہِ پیشِ عقرب سے
 کھلے نہ جب تو مہما سے نہ کیوں کہیے کے تورات جو کالے تو سانپ کھلائے
 کوئی بتائے کہ وہ زلفِ خمِ خم کیا ہے
 جدید طرز کا اردو زبان میں بانی وہ فارسی کہ جسے سن کے دنگ ایرانی
 سخن وروں میں ہے مرزا وہ فردو لسانی سخن میں خاتمِ غالب کی آتش افشانی
 یقین ہے ہم کو بھی لیکن ابلہ ہیں دم کیا ہے

۱۲۶

کہوں کیونکر خوشی نکلی نہ دل پر غم نکلیے یہ سب نکلیے مگر افسوس کیونکر یہ الم نکلیے
 نہ پوری حسرتیں نکلیں نہ ارماں یک قلم نکلیے ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر الم نکلیے
 بہت نکلیے مے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلیے
 ہوا جلا دگو کیا وہم رو کا کس نے خنجر پہے جب تکے خوں قاتل کے سر پر خون ہا کیونکر
 نہیں اتنا لہو باقی کہ خنجر اب ہی کسے تر ڈکے کیوں میں قاتل کیا رہے گا اسکی گزرن پر
 وہ خوں جو چشم تر سے عمر بھر یوں دم بدم نکلیے
 کبھی ہم بھی تھے تیسے سائبہ دیوا میں ساکن رسائی پر بیماری رشک کہتے تھے سائبہ و جن

لے اس غزل کے زائد شعر غالب احمد علی صاحب ہاتھ لکھے ہیں اردو کے پہلے نسخہ اول میں خواہ اول مضمون مرزا
 علاء الدین احمد خان صاحب بہادر میں درج ہیں۔

ہمیں جب نے اٹھو یا عد سے یاد ہو وہ نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن

بہت بے ابرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

ترے گیسوئے پیانے کے مقابل کتبِ قد تھا زمانہ نے مگر اک فتنہ محشر سے سمجھا
غنیمت ہے کہ اس بچی پگی ذکر کر لیا ہوا بھر کھل جائے ظالم یہ قامت کی دازی کا
اگر اس طرف ہر پنج و خم کا پنج و خم نکلے

عجب کیا ہے ہمارا خط اگر اسکو پسند آئے پھر ک جائے عبارت دیکھ کر اور قدر فرمائے
نہ پہونچیں ہم تو کیا تحریر ہی اپنی پہونچ جائے مگر لکھوئے کوئی اسکو خط تو ہم سے لکھوئے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہوئی ہر رنگ میں جب پیر نہ خانہ کو ناکامی ندور جام سے حاصل ہوا کچھ غیر بدنامی
نظرِ صاف کی میکشون کے ظرف میں خامی ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بلاہ اشرا
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جم نکلے

کریں کیا فلکاتِ حالِ مرد و غم سنانے کی کہاں نوبت کسی کو اپنے زخمِ دل دکھانے کی
کریں کیا شکوہ کچھ حالت ہی تجھے زمانے کی ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستہ تیغِ الم نکلے

اگر ہم شمعِ سوزن ہیں تو وہ آتشِ کلہر کا لا جلا نا خاتمہ اس کا ہماری زندگی جلنا
اسی کا پرتو ہے اپنا سامانِ بقا گویا محبت میں نہیں ہے فرقِ صیغہ اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کا فرقِ دم نکلے

سرِ منبر کیا کرتا تو ہے مے کا بیاں واعظ بیانِ حرمت دوسیں پر مشہور جہاں واعظ
 یہی حیرت ہم مرزا کو بھی کیوں نہی اوہاں واعظ کہاں مینا نہ کا دروازہ غالب رکھاں واعظ
 پر اتنا جلتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

۱۲۷

ساقی سیاہ مست ہے تو لطف خاکے قصہ ہی پھر تو پینے پلانے کا پاک ہے
 ساقی کی آنکھ پر ربط صہبا کی تاک ہے مستی بہ ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے
 موجِ شراب یک مژدہ خوابناک ہے
 رہتی ہے اس کو خنجر و پیریاں کی جستجو آنکھوں پہرے ذوقِ جرات کی گفتگو
 ہر دم سنان و تیر کا نقشہ ہے روبرو جز زخم تیغ ناز نہیں دل میں آرزو
 جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے
 وادیِ تنگ اب ہمیں بھاتا نہیں اسد نظروں میں اپنی دشت سماتا نہیں اسد
 مرزا بھی راہ چارہ بتاتا نہیں اسد جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسد
 صحرا ہمارے آنکھ میں اک مشیتِ خاک ہے

۱۲۸

اس کی ہوا میں ہر گلِ تر دلِ فگار ہے رخ کا پسینہ روکشِ عطر ہمار ہے

بوئے بدن سے بادِ صبا مشکبا ہے جس ہانسیم شانہ کش زلفِ یار ہے
نافہ دماغ آہوئے مشکبِ تار ہے

دل جیتے جی اٹھائے گیا سر پہ بارِ شوق ہم خاک میں ملے تو ہوا انتشارِ شوق
کیونکر فضلے دشت نہ ہو آبِ نیکارِ شوق ہے ذرہ ذرہ تنگی جا سے غبارِ شوق
گردام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے

آنکھوں سے کون پر نشیں ہو چھپا ہوا کس کے خیالِ دید میں سکتے سا ہو گیا
کیوں اس طرح کیا ہے تہیہ تلاش کا کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو یا خدا
آئینہ فرشِ شش جہت انتظار ہے

ہے بس کہ شونخ چشم بڑا مدعا علیہ تسلیم کیوں کرے گا خطا مدعا علیہ
دے گا جواب دیکھئے کیا مدعا علیہ دلِ مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ
نظارہ کا مقدمہ پھر رو بکار ہے

تیارِ سفر میں ہے غنوں کو بیچ و تاب پادِ رکاب ہیں یہ گلوں کو ہے اضطراب
پتے اتر کے شاخ سے کرتے ہیں پاتراب چھڑکے ہے شبنم آئینہ برگِ گل پر آب
اے عندلیب وقتِ و دارِ بہار ہے

ہو کیوں نہ انتظار سے دل بستگی مجھے تسکین اس خیال ہی سے ہے بھری مجھے
ایفا کی گونہیں ہے کچھ امید بھی مجھے بیچ آ پڑی ہے وعدہ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

اب تک تو جہ کی بھی نہ تجھ پر پڑی فطرس فزوں کی آنکھیں دیکھ کہیں ہوں پردہ در
یہی نہ پھرنا چاہیے بے باک اس قدر بے پردہ سوئے ولادی جنوں گزر نہ کر

ہر ذرہ کے نقاب میں دل بے قرار ہے

بے کار ہے مرقع دل واہ کیا کہی آنکھیں کھلی ہوئی ہوں تو ہوس مڑا کہی
ہو پاس ایسا آئینہ اور پھر یہ مگر وہی دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی

اے بیدار آئینہ تمثال دار ہے

اٹھنے کو ہے چمن سے عملداری خزاں تنہا بھی پھر نہ آئے گا تجھ کو نظر یہاں
غافل یہ کثرتِ خس و خاشاک پھر کہاں اے عندلیب یک کونخس پہر آشیاں

طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

مرزا کی طرح کچھ بھی نہیں اس کو احتیاط یہ غم کہہ اور اس میں یہ فرحت یہ انبساط
یہ جوشِ حرص اور قویٰ میں یہ انحطاط غفلتِ کفیلِ عمرو اسدِ فاضلِ نشاط

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

تو وہ حسین ہے کہ خود آرا کہیں جسے شاہانِ حسنِ تاجِ سرا پہنا کہیں جسے
ہے اور کون حسن میں یکتا کہیں جسے آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

جیران ہے جو الفت حسن و جمال میں اک انقلاب ہے دلِ خستہ کے حال میں
 سکتے ہوا تصورِ ذوق وصال میں حسرت نے لار کھاتری بزمِ خیال میں
 گلہ ستم نگاہ سویدا کہیں جسے

دل کو کیا ہے عشق نے کس غم میں مبتلا کرتے ہیں اسکو بیم و رجاراتِ دن فنا
 آنکھوں کو کس نے شوقِ نظر کا لگا دیا پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں لٹھرا
 افسین انتظار تمنا کہیں جسے

کیونکر جنون و جوشِ حشر کوٹائے وحشی کو کس طرح دمِ غربت سنبھالے
 دل کا غبار اور تو کیونکر نکالے سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالے
 وہ ایک مشبہ خاک کہ صحرَا کہیں جسے

آنکھوں میں ہے سما یا ہوا بحرِ بیکراں اس زور کا ہے مد و تلاطم کہ الاماں
 دنیا کا حال کیا ہو اگر خشک ہوں واں ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں
 شوقِ عنان گیسختہ دریا کہیں جسے

پھیلی ہوئی ہو چاندنی یا تیز ابر ہو دونوں ہیں بے طرح متقاضی کہے ہو
 نہوتی نہیں بسرِ جوشِ غم شرابِ دو درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو
 صبح بہارِ پسندِ مینا کہیں جسے

جس کے برائی دل میں ہو اچھا وہ کیا ہو کچھ بھی گلہ نہیں ہے اگر ناسزا کہے
 مرزا سے صبر سیکھ کہ دنیا بھلا کہے غالبِ بران مان جو واعظِ بُرا کہے
 طے ماہِ صفر ۲۲۹ یر

ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

۱۳۰

سامانِ مرگ پہلے جیا کرے کوئی پھر تجھ سے گفتگو کی تمنا کیے کوئی
بیٹھا خاموش یوں تجھے دیکھا کرے کوئی جب تنگ و بانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کرتجھ سے راہِ سخن واکرے کوئی

کیونکر ہو خاکِ عاشقِ جاننا زے مفر اس کو ہوائے ہوس پہرتی ہر دوش پر
وادیِ نجد پر ہی نہیں صرف منحصر عالمِ غبار و حشرِ مجنوں ہے سر بسر
کب تک خیالِ طرہٴ لیلیٰ کرے کوئی

یہ مردہ دل میں تھی جو تمنائے التفات آخر وہ آج کرتے ہوئے آئے التفات
لیکن یہ جان لیں جو ہے دعاؤں کے التفات افسردگی نہیں طرب افزائے التفات
ہاں دردِ دل کے دل میں مگر جا کرے کوئی

کتنے ہیں صبر و ضبط میں آنکھوں پہر مجھے دل کھول کر بھانے دے ابا شکِ تر مجھے
چھوڑاں نصیحتوں کو نہ گھونٹا نقد مجھے رونے سے اے ندیمِ ملامت نہ کر مجھے

حاشیہ ص ۲۲۸ کا آغاز صاحبِ سیف الحق سیاح کو ایک خط میں اس طرح لکھتے ہیں: محالی سیف الحق تمہارا خط پہنچا
قاصی صاحبِ بردہ کو معاف فرما کر کوئی دم اپنے پرانے عتاب کی پاتا تو ان سے عذر کرتا اور اپنا گناہ معاف
کر دیتا جب سببِ ملاز کا ظہر نہیں تو میں کیا کروں تم برا نہ مانو کس واسطے کہ اگر میں برا ہوں تو اس نے سچ کہا اور
اگر میں اچھا ہوں اور اس نے برا کہا تو اس کو خدا کے حوالے کر دے

غالبِ برادمان جو دشمن بُرا کہیں ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

آخر کبھی تو عقدہ دل وا کرے کوئی

دل خستگی ہزار طرح رونما ہوئی با ایں ہمہ انھیں نہ توجہ ذرا ہوئی
میں نے قبا جو چاک نہ کی کیا خطا ہوئی چاک جگر سے جب رہ پریش نہ وا ہوئی

کیا فائدہ کہ حیب کو رسوا کرے کوئی

وا دی کے سائے ہے چین کا چراغ گل باد بہار کا نفسِ سر دسے ہے غل
کیونکر نہ رشکِ گلشنِ جنت ہو دشت گل لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل

تا چند باغبانی صحرَا کرے کوئی

تیری شعاعِ حسن ہے اک تیر چشمِ دوز مطلق نہیں ہے آنکھ کو تاپِ نظرِ ہنوز
ہم دیکھیں کس طرح مجھے اے ہریم روز ناکامی نگاہ ہے برقی نظارہ سوز

تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

دشتِ زردوں کو کیا خبرِ فرقِ دیا و دست اطفالِ گردِ سر ہیں وہ ہیں بنیِ دھن میں
سر پھوٹنے کا مفت میں ہوتا ہے بندوبست ہر رنگِ نشت ہے صدقِ گوہرِ شکست

نقصان نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

ہم چاہتے ضرور کچھ اپنے خدا سے عمر بڑھ جاتی شاید اور دعا و دوا سے عمر
تنگ آگئی مگر ترے عہدِ وفا سے عمر سربر ہوئی نہ وعدہ صبر آرماسے عمر

فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

آوارگیِ دشت ہے دشتِ زرد کا شغل حسرت کشی ہے ضعف کے مارے ہوئے کا شغل

دامان و جیب پھاڑنا بھی ہمنے کا شغل بیکاری جنوں کو ہے سرپیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

بے کار ہے سخن سے طبیعت کا خیز و میز انشاؤ اختراع سے بے جا نہیں گریز
بے سود ہے نتیجہ افکار طبع تیز ہے وحشت طبیعت ایجاد یا س خیز
یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

روشن کلام دہرے کا فور ہے آسد گویا چراغ مردہ و بے نور ہے آسد
مرزا بھی اب یہ کہنے پہ مجبور ہے آسد حسن فروغ شمع سخن دور ہے آسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

(۱۳۱)

یہ داغ دکھا کر جو گلستاں میں ہنسا ہے عشاقِ دل افکار کے نزدیک خطا ہے
ناوم ہے کہ غرقِ عقی شرم ہوا ہے شبنم بہ گل لار نہ خالی زاد ا ہے

داغِ دل پر دردِ نظر گاہِ حیا ہے مطلق نہیں حالِ دلِ غمگین سے خبر داز
ہے بولے حنا سے یہ انھیں مستی بسیار دلِ خوشدہ کش مکشِ حسرت دیدار
فرست ہی نہیں ہاتھوں کے نظار سے زہا

آئینہ بدستِ بت بدستِ حنا ہے کم آتش سوزاں سے نہیں حسرتِ دل بھی
جلنا یہی اپنا ہے تو مٹ جائے گی ہستی

سینے میں تمنائے عجب آگ لگا دی شعلے سے نہ ہوتی ہو سی شعلے جو کی
 جی کس قدر افسردگی دل پر چلا ہے

تصویر کی کیا قدر کریں بغیر ہیں بندوق ہم محو ہیں اس درجہ کہ رکھتا نہیں حد فوق
 جاسکتا نہیں آئینہ سے تاباں بد ذوق تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بھد ذوق
 آئینہ باندا زنگل آغوش کشا ہے

قری کی صداؤں سے ہے ہر ہر می دنگ بلبیل کے اس انداز سے ہر غچ ہے دل تنگ
 دونوں میں ذرا سوزش پہاں کانہیں ہنگ قمری کف خاکسترو بلبیل نفس رنگ
 اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

عادت نے تری پست کیا ہمت دل کو مجبور بدنا ہی پڑا حالت دل کو
 بڑھنے نہ دیا ولولہ و جرات دل کو خونے تری افسردہ کیا وحشت دل کو
 معشوقی وبے حوصلگی طرفہ بلا ہے

وہ لاکھ جہائیں کرے دے لاکھ اذیت دشوار ہے آسان نہیں ترکِ محبت
 کچھ پاس زباں ہے یہیں کچھ پاس موت مجبوری و دعوائے گرفتاری الفت
 دستِ تہہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

ہے قابلِ عشاق پریشان گزشتہ باقی ہے ابھی اس میں وہی شان گزشتہ
 کرتی ہے عیاں قتل کے سامان گزشتہ معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ
 تیغِ ستم آئینہ تصویرِ نمسا ہے

نظروں میں شبِ تار سے بدتر ہے سحر بھی شائقِ ترے انوار کا دل بھی ہے جگر بھی
روشن ہیں ترے نور سے دیوار بھی در بھی اے پر تو خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی
سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

تقدیر ہی قدرت نے ہمیں ہی کچھ ایسی ہم پر نہ پڑی ہے نہ پڑے تیری تجلی
مردمِ بحرِ میہ نہیں جلوے سے کوئی اے پر تو خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی
سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

جاتا تو ہوں دنیا سے مگر بادلِ ناشاد کیا کیجئے بے وقت پڑی موت کی افساد
ایمان بھرے دل کی بھی ہر تجھ سے ہی فریاد ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی لے ۱۲
یارِ بآگرانِ کردہ گناہوں کی سزا ہے

تو اہلِ زمانہ پہ جو مایل نہ ہو غالب یہ حسرت و حیراں کبھی حاصل نہ ہو غالب
مرزا کے سوا غیر کا قائل نہ ہو غالب بے گانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو غالب
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

غلمان کی یہ شکل نہ صورت ہے حور کی سمجھے گا اسکو کیا کوئی ہے باتِ دور کی
اک بہرِ امتحانِ حقّی ضیا کو وہ طور کی منظورِ حقّی یہ شکلِ تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

بہرِ نظارہ اہلِ جہاں کے جماؤ ہیں اندازِ ہوا ہے کرشمے ہیں چاؤ ہیں
پھولوں کی بھیاں ہیں بدن چو گھاؤ ہیں اک خوشکال کفن میں ہزاروں بناؤ ہیں

بڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پر حور کی
وہ ہے کہاں کی جس سوزِ لذت اٹھا سکو
دیکھو نہ جس کو خود نہ کسی کو دکھا سکو
خود ہا سکو جناں میں نہ گھر بیٹھے پاسکو
واعظ نہ تم پیوند کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمھاری شرابِ مہور کی

پھر ہو رہا ہے مجھ کو قیامت کا سامنا ہے دغذغ وہی جو کبھی زندگی میں تھا
یہ جان کر کہ آج ہے دنِ عدل و داد کا لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں ٹھا
گویا ابھی سنی نہیں آوازِ صورت کی

پھرتی ہے بے باغ نہ غم ہے نہ کوئی رنج گانے لگی ترائے نوبے رباب و صنج
گویا ہے گا اس کو زیرِ گل سے کوئی گنج آمد بہار کی ہے جو بیل ہے نغمہ سنج
اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

مانا کہ یہ نگاہ سے ڈالے ہوئے تو ہیں عزت کو لیکن اپنی سنبھالے ہوئے تو ہیں
اُمّ القریٰ کی گود کے پالے ہوئے تو ہیں گواں نہیں پر وال کے نکالے ہوئے تو ہیں
کب سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

موسٰی ہی تھے ملائے جنھیں یوں کھلا جوتا دیکھیں تو دیتے ہیں بھی پرے سے کیا جواب
خطرہ نہیں کسی کو اگر مل گیا جواب کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب

آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی
 مثلِ زبانِ شمعِ زباں میں ہے وہ اثر
 پھونکا اسے کسی سے ہوئے ہم نمن اگر
 پر کارِ آگ کا تمہیں کہتا ہے ہر بشر
 گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
 کی جس سے بات اس نے شکایتِ ضرور کی
 مرزا یہ شوقِ جج کا ہے جس طرح اب ہمیں
 اس وقت تمہیں بوہی دلِ غالب ہیں حسرتیں
 آخر یہ بات کہہ گیا وہ اُکے جوش میں
 غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے اٹھیں
 جج کا ثواب نذر کروں کا حضور کی

۱۳۳

اس کو جو غمِ گردشِ ایام بہت ہے
 اس واسطے جو یائے و جام بہت ہے
 غمِ کھانے میں بودا دلِ نا کام بہت ہے
 غمِ خوار و زندی میں یہ بدنام بہت ہے
 یہ رنج کہ کم ہے مئےِ گلخام بہت ہے
 مجھ رنیدِ بلا نوش کو چپکا ہے یہے کا
 ہو بادہ سر جوش ہی اس کی نہیں پروا
 میں شوق سے لے لوں گا تو تلچھٹ بھی دے دے گا
 کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورثا
 ہے بول کہ مجھے دردِ تہرہ جام بہت ہے

لے فیروزِ ازمائشِ کئی تھی جبکہ ظہر نے کیلئے جانے کا ارادہ کیا تھا جس کی رپورٹ رزیڈنٹ دہلی نے بھیجی تھی
 مرزا غالب نے براہِ جانے کی خواہش اس مقلع میں ظاہر کی ہے
 غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے اٹھیں ۛ جج کا ثواب نذر کروں کا حضور کی

پنہاں نہیں اب دام گلستاں کی زمیں میں خطہ ہی نہیں کوئی دل گوشتہ گزیں میں
چھتے نہیں اب غارِ عالمِ قلبِ خزیں میں نے تیر کہاں میں ہے نہ صیاد کس میں
گوشتہ میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

لاپنج سے جو تکلیف عبادت کی اٹھائی اس عابدِ ناداں نے عبث عمر گنوائی
کیا فائدہ اعمال میں جب ہو نہ صفائی کیا زہد کو مانوں وہ نہ ہو گوہرِ بیائی
پادائشِ عمل کی طبعِ خام بہت ہے

آزادہ روی شیوہ بتاتے ہیں جو انساں معلوم نہیں سمجھے ہیں کیا جی میں وہ ناداں
آزاد تو ہو ہی نہیں سکتے کسی عنوان ہیں اہلِ فرد کس روشِ خاصِ پنازاں
پابستگی رسمِ ورہ عام بہت ہے

پینے میں لگے بادہِ گلفام کے دھتے ان سے ظل آجائے نہ ارکان میں حج کے
فرصت میں ذرا سیٹھ کے دھولوں نصیب ہے زمزم ہی پر چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے

آلودہ برے جائے احرام بہت ہے ترددِ بندگی اس کی کبھی میں نے کہا جو
تیر دیدہ کی اس کی کبھی میں نے کہا جو مجھ پر وہ عنایت کی نظر رکھتے ہیں اب تو
جنت ہے یہ بڑتاؤ ہو اور وصل نہ پھر ہو ہے قہر گرا ب بھی نہ بنے بات کہ ان کو

انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے میں یہ نہیں کہتا مجھے مرنا نہیں لے مرگ
پنج جاؤں تو کچھ حرج بھی تیرا نہیں لے مرگ حاشا کہ مجھے جان کی پروا نہیں لے مرگ
خوں ہو کے ٹکڑا ٹکڑا سے پڑکا نہیں لے مرگ

رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے
 کیا دل کش و دلچسپ ہیں مہرا کے ترانے بخشی ہے عجب طبع رسا اس کو خدا نے
 مانا ہے اسے راہِ ناسب شعرا نے ہو گا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے
 شاعر تو وہ اچھا ہے پر بدنام بہت ہے

۱۳۴

کیا کہیے کہ دل ہے پریشاں کئے ہوئے آئینہ دار ہے مجھے حیراں کئے ہوئے
 ہے انتظار آمدِ جاناں کئے ہوئے مدت ہوئی ہے یا کر کو جہاں کئے ہوئے
 جوشِ قدر سے بزمِ چراغاں کئے ہوئے
 دل کو تو چشمِ تر نے دیا اشکِ خوں میں کھو کیا خاک مجھ سے کوئی نیا انتظام ہو
 کہ دو رنگا پسین کش وہی حاضر ہو گھر میں جو کرتا ہوں جمع پھر جگرِ سختِ لخت کو
 عرصہ ہوا ہے دعوتِ مہرگاں کئے ہوئے
 مدت کے بعد جوشِ جنوں نے کیا کرم تابِ سکون و صبر گئی دل سے یک قلم
 وحشت کی روک تھام نہ کی سکیں گے ہم پھر وضعِ احتیاط سے رکے لگا ہے دم
 برسوں ہوئے ہیں چاکِ گریباں کئے ہوئے
 سینے میں پھر وہ آگ بھڑکنے لگی کہ بس پھر جل کے خاک ہو گا تین زارِ مثلِ خس
 پھر ضبطِ آہ پر نہ رہا دل کو دسترس پھر گرم نا لہائے شر رہا رہے نفس

مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کئے ہوئے

کیا پوچھتے ہو کیا ہے غصہ بگاڑ عشق سرے سے ملے گا نہ اب تک ملا ہے عشق
دل کیا کر اب تو دیئے جاں بر ملا ہر عشق پھر پریش جراتِ دل کو چلا ہر عشق

سامانِ صدر ہزار نمکدراں کئے ہوئے

پھر دل میں شوقِ دید سے ہو در و جانگسل پھر اشکِ خوں بہاؤں گا آنکھوں سے متصل
دکھلاؤں گا ورنگ کہ مانی ہو منفعل پھر بھر رہا ہوں غامزہ خراں بخون دل

سازِ چمن طرازیِ داماں کئے ہوئے

پیش آ رہا ہے عشق میں اک اقدارِ عجیب بیٹھے بٹھائے بھنس گئے آفت میں و غریب
کیا دو ہے کہ دونوں میں چھڑ جائے غمِ قریب باہم و گر ہوئے ہیں لُ دیدہ پھر قریب

نظارہ و خیال کا سامان کئے ہوئے

وحشت میں ٹھہر رہی ہو تو سوائیونکی لے ذلت کے مرچے کو کیا چاہتا ہے طے
کھل کھیلنے کے اب تو تقاضے ہیں بچے پے پھر دل طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے

پنڈار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

پنڈر ہے مریض عشق کو تیمار کی طلب پھر اس دل غمیں کو بے غمِ خوار کی طلب
الفن کو بھرے گرنی بازار کی طلب پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب

عقلمندی و عقل و دل و جاں کئے ہوئے

ہے رنگِ بونے قل کا جو پیشِ نظر خیال گلشن میں جا کے مست ہو پھر بسبر خیال

دل گشت میں جا ہوا ہے پھر ادھر خیال دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا سماں کئے ہوئے

سزا مر اس کے خط کا ہے اس درجہ دل ربا جس کے ہر ایک حرف پہ ہیں جانِ دل فدا
مضمونِ شوق دیکھئے لاتا ہے رنگ کیا پھر چاہتا ہوں نامہ دلدار کھولنا
جان نذرِ دل فریبی عنوان کئے ہوئے

نسکین سیر باغ سے کیا ہوگی ہم نفس بے یار ہیں نظر میں گل تر بھی خارِ خس
بے چین ہو رہا ہوں کہ دل پر نہیں بس ملنگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
زلف سیاہ رخ پر پریشاں کئے ہوئے

بے وجہ تو نہیں ہوں میں آوارہ کو بکو پھر تا ہوں تیغِ زن کے تجس میں چار سو
بنغ نگاہ کی ہے ان آنکھوں کو جستجو چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمہ سے تیز دشنہ مڑگاں کئے ہوئے

مردوب چشمِ شوق نہیں روئے ہر و ماہ اس گل کی بزمِ عیش کی دل دھونڈتا رہا
کب سامنے ہو دیکھئے ساقی کی جلوہ گاہ اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ سے گلستاں کئے ہوئے

تا چند انتظار کا دکھ جھیلے رہیں کب تک رہیں چارہ احباب کے رہیں
تا چند یوں جدا در دلدار سے رہیں پھر جی میں ہے کہ در پر کسی کے پڑے رہیں
سر زمر بارِ منتِ درباں کئے ہوئے

طاقت نہ وہ خیال میں باقی ذاب ہو سن وہ دن گئے کہ چین نہ بڑھتا تھا یا رہن!
 رہتے تھے اس کی یادیں دل و دل تھا مطمئن جی دھونڈھتا پھر وہی فرصت کے رات دن
 بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کے ہوئے
 کیا سہل بات تھی کہ یہ سیلاب رک سکے روکارِ جوش جس نے وہ مرزا ہمیں تو تھے
 اب بھی ہیں اپنی آنکھوں میں کیا بھوب ہوئے غالب ہمیں نہ چہرہ کہ پھر جوشِ اشک سے
 بیٹھے ہیں، ہم تہیہ طوفاں کے ہوئے

(۱۳۵)

جفاے یار تسلی ہے اک جہاں کے لئے نہ خوشی کی ہے آزادی و اماں کے لئے
 ہوئی ہے وجہ تسلی دلِ تہاں کے لئے نویدِ امن ہے بیدارِ دوستِ جاں کے لئے
 رہے نہ طرزِ رسم کوئی آسماں کے لئے
 غذائے غم نو دلِ بے قرار و غروں ہے جگر کی تاک میں وہ دیدہ پراسوں ہے
 پڑی وہ لوٹ کہ حالتِ مری درگروں ہے بلا سے گر خڑہ یا رتشنہ خوں ہے
 رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونچکاں کے لئے
 خطا معاف رہے اتنا س خلق لے خضر تمہیں نہیں ہو ذرا بھی تو پاسِ خلق لے خضر
 چھپے ہو تم یہ تمہیں ہے ہر اس خلق لے خضر وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں شمسِ خلق لے خضر
 نہ کم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

یہاں تک مے ملیں ہوئی ہے کثرتِ رشک کبات بات سے ظاہر ہے اب علامتِ رشک
کسی کو غیر کی راحت پہ ہوگی عادتِ رشک رہا بلا میں بھی میں مبتلائے الفتِ رشک
بلائے جاں ہے اوتیری اک جہاں کے لئے

وہ کشتی کہ جو قاتل سے رات دن ہو قریں انھیں کو اس سے جدا کر کہو مجھے تسکیں
کبھی تو دور سے ہو آرایشِ انکی کہیں فلکِ دور کہ اس سے مجھے کہیں ہی نہیں
دراز دستی و قاتل کے امتحاں کے لئے

پڑا ہوا تو ہوں زنداں میں بستہ زنجیر قہر نہ یہ تھا کہ کرتا نجبات کی تدبیر
مگر مجھے تو یہ دامن ہے کہ گھر کروں تعمیر مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ میرا اسیر
کرے قفس میں فراہمِ خس اشیاں کے لئے

پڑا ہوا تھا میں دھونی آلا ستاں پر رماے اہی آرزو میں کہ دربان کو ترس آجائے
اسے بھی کوئی خصوصیت نہ تھی کہ مجھ کو اٹھائے گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت لئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پامباں کے لئے

۱۔ اس شعر کے متعلق مولانا قاضی مکتے ہیں: "اور غزل ہی ایسے بیخ اشعار شاید دو ہی چار اور نکلیں گے۔ مولانا آرزوہ جو
قائب کی طرز کو نام رکھتے تھے وہ بھی اس شعر کے اندر زبان پر روانہ تھے۔ آغازِ قدر میں بھی اس شعر پر کچھ بے یارک کیا ہوگا۔
اس کی ایک اور خوبی کہ طرفِ اشارہ کیا جا تا ہے جو دھونے قائب نے اس شعر میں بیان کیا ہے اس میں دو باتوں کی تصریح کرنی
ضروری تھی۔ ایک یہ کہ پامباں نے قائل کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ دوسرے یہ کہ قائل پامباں سے چاہتا کیا تھا سو یہ دونوں
باتیں بصورتِ بیان نہیں کی گئیں صرف کنیز کی ادا کی گئی ہیں مگر راحت سے زیادہ وضوح کے ساتھ فورا بھیجیں جاتی
ہیں یہی بات پر لفظ شامت اور دوسرے پر قہر یا صاف دلات کرتا ہے۔ اس کے سوا آرزوہ کی نشست اور الفاظ کی بندش اور
ایک وسیع خیال کہ وہ دھونے میں ہی کہی گئی ہے اور کائنات میں بھی اس طرح ادا کرنا مشکل ہے یہ سب باتیں نہایت تعریف کے قابل ہیں۔"

سختی میں چاہیے کوئی جدید طرز عمل کہ طبع تیز کا کچھ حوصلہ تو جائے نکل
 نہ کیوں ہر وعدہ تغزل میں رہ کتی ہے کل بقدر شوق نہیں طرف تنگ سائے غزل
 کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے

ملا ہے جو طرب و عیش اس کو قسمت سے بھلا وہ اس کے سوا ہے نصیب اور کس
 مٹا دیا حسد و رشک کو بھی قدرت نے دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
 بنا ہے عیش و نغمہ حسیں خاں کے لئے

یہ ذکر خیر مرے لب پر آگیا کس کا بھرا سرور سے دل اور جگر ہوا ٹھنڈا
 مجھے بیان پر اپنے ہے وہد کیوں اتنا زباں پر بارِ خدا یا یہ کس کا نام آیا
 کہ میرے نطق نے بوسہ مرے زباں کے لئے

اسی کی نشان کے نمایاں پر شانِ شوکتِ ملک اسی کے واسطے مخروں پر جہاں و شمتِ ملک
 ہے ہمیشہ یوں ہی برقرار ثروت و ملک نصیرِ ملت و دیں اور معینِ ملت و ملک
 بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستان کے لئے

ہر اک بشر کے لئے عیش کی ہے افزائش خدا کے فضل سے آیا ہے دورِ آسائش
 جسے طریق سے ہر شے کی ہو گی زیبائش زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آسائش
 نہیں گئے اور ستارے اب آسمان کے لئے

وہی تو مدح کی تمہید و ابتدا ہی ہے نہ مدح نکلی گئی ہے نہ میں نے نکھی ہے
 یہی کہاں مری طبع رسا نے بس کی ہے ورقِ تمام ہوا اور مدح باقی ہے

سفینہ چاہئے اس بحرِ بے کراں کے لئے
 عجیب ڈھنگ نکالا ہے مدح گوئی کا
 غزل سی نہیں دکھایا ہے اس نے رنگ نیا
 طبیعت اس کی ہے حدت پسند لے مرزا
 ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
 صلائے عام پر یارانِ نکتہ واں کے لئے

(۱۳۶)

کم بے غیروں سے اگر ہو وفا اور سہمی
 کوئی برتاؤ مروت کا نیا اور سہمی
 میری ایذا سے جو دل خوش نہ ہوا اور سہمی
 میں ہوں مشتاقِ بجا چھوڑ جاؤ اور سہمی
 تم ہو بیدار سے خوش اس سے سوا اور سہمی
 راتِ دلِ گریبے اور آٹھ پہرِ نالہ و آہ
 سوگِ تم نے تو کچھ اس درجہ منایا کہ بہا
 مرہی جلتے دو اگر مرہی گیا ہے گمراہ
 غیر کی مرگ کا غم کس لئے اے غرت ماہ
 ہیں ہوس پیشہ بہت وہ نہ ہوا اور سہمی

کبر و نخوت کی زبانے میں دہائی کیوں ہے
 دل میں ناحق ہوسِ حامِ پکائی کیوں ہے
 خود نما کیوں ہو خودی سر میں سمائی کیوں ہے
 تم ہو بت پھر تمہیں ہندارِ خدائی کیوں ہے
 تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہمی
 یہ تو مانا کہ حسینوں کی نہیں کوئی کمی
 آن بان ایسی کسی میں کمی دیکھی نہ سنی
 حسن میں آپ سے بڑھ کر نہیں ہونی کمی
 منہ حسینانِ ارم آکے ملائیں تو سہمی

حور کا شیوہ انداز و ادا اور سہی

کیا قیام اور قعود اور ہے سجدہ کیسا سر مرا جھک نہیں سکتا ہے تیرے در کے سوا

تھا جو بے چین تو ہر پھر کے ادھر ہی پہونچا تیرے کوپے کا ہے مائل دل مضطرب

کعبہ اک اور سہی قبلہ نما اور سہی

کیا انوکھا جن غلہ بریں ہے واعظ باغ دیکھے ہی نہیں تو نے یقین ہے واعظ

تیری باتوں کا ٹھکانہ بھی کہیں ہے واعظ کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ

غلہ بھی باغ ہے خیر آب و ہوا اور سہی

یاں تو دل کھول کے ارمان نکالیں رب تنگی دہر کی کچھ داد تو پالیں یارب

سیر کا لطف تو جی بھر کے اٹھالیں یارب کیوں نہ فردوس میں دو رخ بھی ملا لیں رب

سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

کر دیا ہے غم بھریاں نے مرا حال زبول بڑھتے بڑھتے خنقاں پہنچا ہے نوبت بربزوں

دیر مرنے میں لگے لگی جو کھلائی افیوں مجھ کو وہ دو کب سے کھا کے نہ پانی مانگوں

زہر کچھ اور سہی آپ بخت اور سہی

طبع دیوان سے جو غالب نے فراغت پائی یار و احباب نے مرزا نی آفت ڈھائی

کی غزل نظم تو یوں لب پر نکالتی آئی مجھ سے غالب یہ علانی نے غزل لکھوائی

ایک سیراد گیر رخ فزا اور سہی

سے غزل نمبر ۱۳۶۔ دیوان مطبوعہ میں نہیں ہے اردوئے معلیٰ حاصل رقم موسومہ نواب امین الدین احمد خان صاحب

شکوہ در دلی اک گو نہ خطابے تو سہی نالہ و آہ سے اظہارِ جفا ہے تو سہی
 صبرِ پی آف بھی منافیِ رضا ہے تو سہی آپ نے مستحقِ انصاف کہا ہے تو سہی
 یہ بھی یا حضرت ایوب گلا ہے تو سہی
 ہم نشینوں کو ہے کیا میری مصیبت کی خبر کرتے ہیں صبر کی نقلین مجھے آٹھ پہر
 دل ہی تو ہے مرے سینے میں نہ کوئی بہتھر رنج طاقت سے سوا ہو تو نہ بیٹوں کیونکر
 ذہن میں خوبی تسلیم و رضا ہے تو سہی
 اُس باقی ہے تو برسوں ہیں بہلائے گی عمر سبز باغِ آٹھ پہر فکر میں دکھلائے گی عمر
 داد ملنے کے لئے گویا نہی تڑپائے گی عمر ہے غنیمت کہ بر امید گزر جائے گی عمر
 نہ ملے داد مگر روزِ جزا ہے تو سہی
 کس کا چارہ فقط الزام سے ہوتے ہیں بری کون اٹھاتا ہے مریضوں کے لئے دردِ مری
 منہ نہ کھلواؤ کہ احباب کی ہے پرہ دری دوست ہی کوئی نہیں ہے جو کرے چارہ گری
 نہ سہی ایک تمنا ہے دوا ہے تو سہی
 ہم سے بڑنا ہے جو کچھ اسی قابلِ ہم تھے کہتے بد عہد و جفا کار اسے کس منہ سے
 بے فروت ہے وہ کیونکر کوئی انصاف کرے غیر سے دیکھئے کیا خوب نباہی اس نے
 نہ سہی ہم سے پر اس بت میں وفا ہے تو سہی

گو کہ واقف نہیں تقدیر کے احوال سے میں خط قسمت نہیں پڑھ سکتا کسی حال سے میں
یوں نگاتا ہوں پتہ اپنے ہی افعال سے میں نقل کرتا ہوں اسے نامہ اعمال سے میں
کچھ نہ کچھ روز ازل تم نے لکھا ہے تو سہی
جس طرح صبر سے مزارے گزاری غالب زندگی کا تو اسی طرح سے تم بھی غالب
جان دیتے ہی کسی روز بنے گی غالب کبھی چل جائے گی کیوں کہ تے ہو جلدی غالب
شہرہ تیزی شمشیر قضا ہے تو سہی

قطعات پنج تکمیل اوراق ہذا

کی شرحِ نظم غالب تضمین میں جو مزار ظاہر ہوئے معانی حل ہو گئے مطالب
جی میں خیال آیا تاریخ اس کی لکھے بولا سروش غیبی روح کلام غالب

نوٹ: ۱۔ یہ غزل ۱۳۷۱ء ذی القعدہ ۱۳۷۱ء صاحبِ غالب رئیسِ دہلی کا عطیہ ہے فرمانے تھے کہ میں ہر وقت
پچھم جان (غالب) کی خدمت میں حاضر رہا کرتا تھا کیا کلام اپنی یادداشت میں لکھتا تھا اور مجھ سے یہ غزل ہے۔

تمام شد

ضمیمہ

تفہیم بر غزل فارسی مولانا جامیؒ

کیا شوق زیارت نے پریشان یارِ رسول اللہ ہوا رسول در جد سے سخت حیراں یارِ رسول اللہ
خدا کی واسطے کچھ کیجئے دعاں یارِ رسول اللہ تنم فرسودہ جاں بآرا و بجاں یارِ رسول اللہ

و لم یزد درد آوارہ ز عصیاں یارِ رسول اللہ
نہ دلیں صبر کی طاقت نہ جانیں ہر شکیبائی نہیں اب بارِ فوق کے اٹھانیکی توانائی
دکھاؤ شکلِ نورانی بناؤ مجھ کو سودائی شب و روز از شکیبائی ز حد گشتم تمنائی
مخلوت سوئے من آئی خراماں یارِ رسول اللہ

ہوئے قدرت سے چاروں یارِ رسول آپ کے ہمد محبت کے تھے چاروں حرف گویا متصل باہم
خدا نے انکو اسرارِ نبوت کا کہا مخرم بصدیق خریدارم عمرادوست میدارم
بعثمان و علی آرم فدا جاں یارِ رسول اللہ

نہیں اسوقت بد میں کوئی میرا نموش ہدم سہلا ہے تمہاری ذات کا یا سرورِ عالم
ندامت کے دورِ احتیاد لے ناکارہ میں بہیم ز کردہ خوش حیرانم سیر شد زور عصیانم
پیشیمانم پیشیمانم پیشیاں یارِ رسول اللہ

غمِ فراق میں برسوں کی بے گنت گہری
 متاعِ مال و زر تھی جس قدر بربادی ساری
 نہیں کچھ پاس تو بے گنت کیونکہ سخت لاجاری
 چہ سوئے من گنداری من مسکین زنداداری
 نثار نقشِ نعینت کم جاں یار رسول اللہ

چلا سوئے عدم مرزا نہایت بے سرو سامان
 نہیں ہر ساتھ تو شہِ آخرت کا کچھ مخر عیال
 ہے اتنی عرض یا مولامری جاں تمہی ہو قرباں
 چوں بازوئے شفاعت را کشائی برگزیناں
 مکن محروم جامی را دران آں یار رسول اللہ

تضمین بر غزل مولانا منشی حسین صاحب سونے ال

دکھاؤ بتورئے عالم آرا یا رسول اللہ
 بنا لو اپنا دیوانہ خدا را یا رسول اللہ
 عنایت کی نظر ہوں تمہارا یا رسول اللہ
 ہمیں ہے ذات اقدس کا سہارا یا رسول اللہ
 تمہارے بن نہیں کوئی ہمارا یا رسول اللہ

گہیں جلدی نقاب پر نہ پر نور سے الٹو
 کسی خواب میں اگر ہی مجھ کو شرف بخشو
 نہایت مضطرب شوقِ زیارت نے کیا مجھ کو
 کہوں میں تم سے کیا تم مرم راز الہی ہو
 تمہیں معلوم ہی احوال سارا یا رسول اللہ

قدیب سلیبے نکروی ہے توحید خدا ثابت تمہاری شان کی ہوتی ہو شانِ کبریا ثابت
اشاروں میں ہی دعوائے نبوت کو کیا ثابت مجھے شقِ احمق کے مجھ سے ہو گیا ثابت

بلندی پر تمہارا ہے ستارا یا رسول اللہ

تمہارا ذکر جاری ہر بنا پر میری صبح و شام یہ ہے وہ وجود جس سے دور مجھے ہیں غم و الام
تمہارے نام ہے دلوں کو راحت جاں کو آرام لیا کیجئے نہ کیونکر بیٹھتے اٹھتے تمہارا نام

تمہارا نام لگتا ہے پیارا یا رسول اللہ

بھروسے تمہارا خواجہ ہر دوسرا ہم کو قیامت میں گناہوں کا نہیں کٹا ذرا ہم کو
شفاعت کر کے بیشک آپ لینگے بخشوا ہم کو اگرچہ کیسے ہی عاصی ہیں بخشے گا خط ہم کو

ذرا بھی کیجئے گا گراشا را یا رسول اللہ

زیارت سوزِ روضہ کی مشرف ہو گا یہ جنت تک نہیں ممکن بنے ملنا اس خیف و زار کا تبتک
گزاری جس طرح گرمی پریشانی سہاں تبتک دینے میں مجھے پاس اپنے اب بلوائے کبتک

پھول گا بند میں میں مارا مارا یا رسول اللہ

بھلائی پر نہ بھلو نفس نے ہونے دیا قادر بدی میں ہو گیا یکتا نکوئی میں رہا قاصر
طلبِ گارِ حمایت اب ہوا سرکار میں حاضر کرو اسوقت بد میں دستگیری تم کریں آخر

جرا ہوں یا بھلا ہوں ہوں تمہارا یا رسول اللہ

ہے گستاخی سراسر شکوہ سوزِ ہاں کرنا اوب کے برخلاف آہ و بکا شور و فغاں کرنا
فصول ایک ہے اظہارِ بے تابی جانی کرنا عبت ہے تم کو اب ہر وقت درِ دل بیاں کرنا
غم پہناں ہے تم پر آشکارا یا رسول اللہ

ہمیشہ ذاتِ اقدس کا رہا سر پر مے سایہ قہیلی کی کبھی گریں ہجوم غم سے گھبرایا
جہاں نیم جاں پہنچا تمہیں موجوداں پایا تصدق آپ کے الطاف کے لبیک فرمایا
کبھی گر روزِ غم میں نے پکارا یا رسول اللہ

زیارت کی محال اور جذبِ الٰہی کوئی راہ کسی دن اے ہوائے شوق اڑا لے چل بھونکا گاہ
میں اوریوں نثرِ عالم کے دے سے ہوئے لے آہ مجھے اور حکم بودو باش ملک ہند یا اللہ
میں اوریوں زیرِ فرمان نصارا یا رسول اللہ

نہیں ہے آپ کے مزار میں باقی طاقت جہاں قرون پر دمدم اس پر نجومِ حسرت و ارماں
مدین میں بلا لویا نبی اتنا کرو احساں دیارِ ہند ہے کیونکر گئے اسمیں دل سوزاں
مدین ہے نہ مکہ نہ بحارا یا رسول اللہ

تضمین بر سلام میر وحید صاحب مرقوم لکھنوی

نام ہو جس کا علی نام خدا ایسا تو ہو ہو جسے معراج دوشِ مصطفیٰ ایسا تو ہو
نام ہو جس کی نصیری ہیں خدا ایسا تو ہو خلق کے بیڑے کا حامی نا خدا ایسا تو ہو

جس پہ دھوکا ہو خدا کا نا خدا ایسا تو ہو

عاشقِ نام خدا اہلِ سخا ایسا تو ہو ہو گئے جس کے لپسِ حرق پر خدا ایسا تو ہو
جو کرے یوں بندگی حق کی ادا ایسا تو ہو گھر ٹٹایا شاہ نے وعدہ وفا ایسا تو ہو

دے دیا سجدہ میں سر عشقِ خدا ایسا تو ہو

جسم بھی ہو ہرے تھاق نے بنایا آپ کا سایہ کی جا پڑتی تھی جسمِ منور سے فضا
در حقیقت نور حق تھا سر سے لے کر تا پیا واہ رے یکتائی احمد کہ سایہ بھی نہ تھا

ہو نہ جس کا مثل محبوبِ خدا ایسا تو ہو

یوں تو دنیا میں ہوئے پیدا ہزاروں ابنیا پر ہوا اب تک نہ پھر ہوگا نظیرِ مصطفیٰ
نپ کو صانع نے بیشک ایک ہی پیدا کیا واہ رے یکتائی احمد کہ سایہ بھی نہ تھا

ہو نہ جس کا مثل محبوبِ خدا ایسا تو ہو

دوستوں کی داد کیا اور دوستوں کی کیا پسند کیا کہا ہم نے اگر دوس پانچ کو آیا پسند
 بات ہے وہ واقعی جسکو کرے دنیا پسند غل طرفار و کا مجلس میں ہیں ہر ناپسند
 خود دشمن بھی ہو باتوں میں مزا ایسا تو ہو

میرے مولا ہیں علی مرتضیٰ شیر خدا جنگے در سے ہوتی ہر شاہوئی بھی حاجت روا
 دو جہاں میں آپ ہیں ہر ایک کے مشکل کشا ہوں در حیدر کا سائل خربے مجھ کو بجا
 شاہ جس کی آرزو رکھیں گدا ایسا تو ہو

اہل دولت سے کہوں کیا اپنے دل کا مدعا توبہ توبہ ان سے کیا ہوگی مری حاجت روا
 دل غنی پر گرچہ میں ہوں ایک فقیر ہے نوا ہوں در حیدر کا سائل خربے مجھ کو بجا
 شاہ جس کی آرزو رکھیں گدا ایسا تو ہو

ہر صدمہ پر میری ہو کہوں کر نہ شور مچا جلتے ہو کون بھول کر کس کام ہوئی حاجت روا
 لیں دیکھو نکر اہل دنیا جھکوا آنکھوں پر بٹھا ہوں در حیدر کا سائل خربے مجھ کو بجا
 شاہ جس کی آرزو رکھیں گدا ایسا تو ہو

ناہنجوی کہ ہمیشہ چاہیے انسان کو تنگ صبر وہ پیدا کرے جس سے ہوں خاص عا دنگ
 آفت نکلے منہ سے گوہیں کہی ہو جائے تنگ وہیں ڈالے گوزمانہ پر چھوڑے اپنا رنگ
 برودباری میں بشر مثل حنا ایسا تو ہو

نہ اند شاہ کا صبر و تحمل وقت جنگ شکر ہی نکلا زبان سے جب کیا اٹھانے جنگ
ناہ فرماتے تھے صبری سے یہ انسان کو ننگ بیس ڈالے گوزمانہ پر نہ چھوڑے اپنا رنگ

بردباری میں بشر مثلِ حنا یا تو ہو

رضی وہ ہے کہ جسکی شان میں یا ہل آتی علم کا ہر جسکے دروازہ علیٰ بابا
ہے اشجار ہونکی شاہدِ حدیثِ آفتا خیر حق دستِ خدا میرے عربِ مشکلتا

یہ لقب جسکے ہوں خویش مصطفیٰ ایسا تو ہو

پشمِ الفت سے جو ڈالی اک نظر شبیر نے کر دیا اسرار حق سے باخبر شبیر نے
پووتا پکڑ نہ ہوتا ہاتھ اگر شبیر نے جاچکا تھا خر سوئے دوزخ مگر شبیر نے

راہِ جنت کی بتا دی رہنما ایسا تو ہو

مشکلِ آسان جب کے نام سے ہو بالیقین اسکو کیا مشکل ہے جسکے علی ہوں خود معین
وہ تمنوئی مشکلیں بھی آپ نے آسان کیں پیش حیدر کے رہ جائے گرہ ممکن نہیں

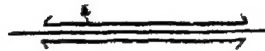
دستِ قاتل کھول دے مشکلتا ایسا تو ہو

ٹھہرے مشکل جب علیٰ دائیں نظر ممکن نہیں کھل نہ جائے عقدہ پیچیدہ یہ ممکن نہیں
واں کریں مشکلتا اس جس جگہ ممکن نہیں پیش حیدر کے رہ جائے گرہ ممکن نہیں

دستِ قاتل کھول دے مشکلتا ایسا تو ہو

رن میں سرکھواتے تو جا بکے جب خوش تبار کہتے تھے حضرت کہ تیرے فکر ہے پروردگار
 پاچے جس دم شہادت خود امام باوقار بیڑیاں عابذے نہیں تاہو امت رسدگار
 خلق میں پابند تسلیم و رضا ایسا تو ہو

دکنے کو چرخ و قیابے وحید زار کو سب یہ اے مرزا گوارا ہے وحید زار کو
 اپنے مٹ جانیکا کیا غم ہے وحید زار کو پس اے گردوں جو پیسا ہے وحید زار کو
 چشم بدین میں نہ کھٹکے سرمہ سا ایسا تو ہو



”روح کلام غالب“

اور دیگر ادبی، مذہبی، درسی غرض ہر قسم کی کتابیں
مناسب قیمت پر

طلب فرمائیں

تاجر حضرات کو معقول رعایت دی جائیگی

ملنے کا پتہ

نشریات ادب ایکڈمی

بازار نخاسہ سہارنپور یوپی

بین الاقوامی ادب کا ترجمان

نذہبی ادبی اور معلوماتی جریدہ

ماہنامہ ”دیرو حرم“ سہا نیو

ہر ماہ اپنے قارئین کو نکھراستھا ادب مثلاً معیاری افسانے، مقالے
فیچر اور بیسویں نظیں پیش کرتا ہے اور پابندی وقت کے ساتھ شائع ہوتا ہے

آپ بھی مطالعہ فرمائیں

قیمت سالانہ چھ روپے : ایک کلپی ساٹھ پیسے

نمونے کیلئے نشر پیسے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کرنے ضروری ہیں۔

ترسیل زر کا پتہ

منیجر ماہنامہ ”دیرو حرم“ بازار نخاسہ سہارنپور، یوپی

